بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ برائے: پی۔ایچ۔ڈی

بعنوان

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تاریخ نویسی کا
فنی و تجزیاتی مطالعہ

نگراں: جناب ڈاکٹر نصیر احمد اختر

مقالہ نگار: صوفیہ فرناز

شعبۂ اسلامی تاریخ

جامعہ کراچی

۲۰۱۰ء

متخرج جامعۃ الامام الریاض
شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

تاریخ:_______________

حوالہ نمبر:_______________

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ طالب علم/ **صوفیہ فرناز بنت قاضی محمد معین عثمانی** نے میری زیر نگرانی بعنوان " **سید مودودی کی تاریخ نویسی کا فنی وتجزیاتی مطالعہ** "

اپنا تحقیقی مقالہ برائے حصول سند Ph.D مکمل کرلیا ہے۔

ان کا تحقیقی مقالہ تنقیح ممتحنین کی غرض سے جمع کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

برائے ضروری کاروائی ارسال خدمت ہے۔

نگران ریسرچ/

ڈاکٹر نصیر أحمد أختر

شریک پروفیسر

شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

انتساب

اپنے عزیز اور قابل احترام والدین

محترم قاضی محمد معین عثمانی صاحب (مرحوم)

اور

محترمہ منظر جہاں صاحبہ (مرحومہ)

کے نام

جن کی محبت، شفقت اور دعائیں میرا سرمایہ حیات ہیں

جس کے باعث میں اپنے مقالے کی تکمیل کر سکی۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اس ناچیز و ناتواں کو اتنی استطاعت اور استعداد بہم پہنچائی کہ میں اپنے مقالہ ''مولانا مودودی کی تاریخ نویسی کا فنی و تجزیاتی مطالعہ'' کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکی۔ تحقیقی کام کو ایک مقالے کی شکل دینے میں جس دیانت، عرق ریزی، دماغ سوزی اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ محققین اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میرے مقالے میں یقیناً کمی اور خامی بھی ہوگی کیونکہ یہ ایک انسانی کاوش ہے اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کوئی بھی انسان اور اس کی کوشش مکمل (Perfect) نہیں ہوتی۔

اپنے تحقیقی کام کی ابتداء سے آخر تک تمام انتظامی مراحل سے سہل طریقے پر انجام پذیر ہونے پر میں جناب شیخ الجامعہ اور رئیسِ کلیہ فنون کی تہہِ دل سے مشکور ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مقالے کی تکمیل کے لیے میں اپنے ''نگراں تحقیقی امور'' جناب ڈاکٹر نصیر احمد اختر صاحب ایسوی ایٹ پروفیسر (شعبہ علومِ اسلامی) کی انتہائی شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون اور رہنمائی کے بغیر تحقیقی کام کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

ڈاکٹر عامر طاسین (ڈائریکٹر مجلسِ علمی) کی بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنے کتب خانے سے سہولت کے ساتھ استفادہ کا نہ صرف موقع دیا بلکہ کتب کی تلاش میں رہنمائی بھی فرمائی۔ ڈاکٹر منیرہ نسرین (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ لائبریری سائنس) بھی شکریہ کی مستحق ہیں جنہوں نے گاہے بگاہے تحقیقی امور کے سلسلے میں رہنمائی کی۔

ایک ایسی ہستی جو میری علمی زندگی میں ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ قاضی احمد سعید صاحب کی ہے۔ (سابق پروفیسر سراج الدولہ کالج) جن کے شکریے کے لیے الفاظ کا سہارا ناکافی ہے۔ ان کی رہنمائی اور حوصلہ

... صرف اللہ کی ذات ہی دے سکتی ہے۔

شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر محمد صابر (مرحوم)، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحب اور ڈاکٹر شکیل صدیقی کی علمی معاونت کے ساتھ ڈاکٹر نواز علی شوق (سابق پروفیسر شعبۂ سندھی) کے تعاون کی بھی بے حد ممنون ہوں۔

اپنے تحقیقی مقالے کی انجام دہی کے سلسلے میں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا شکریہ ادا نہ کرنا انتہائی ناسپاسی ہوگی۔ اس ادارہ نے وہ گوشۂ عافیت فراہم کیا جہاں سکون و اطمینان کے ساتھ تحقیقی و علمی کام مکمل ہوا اور دورانِ تحقیق تمام سہولیات اور ہر ممکن تعاون حاصل رہا۔ میں جناب سیّد شاہد ہاشمی صاحب (ایگزیکٹو ڈائریکٹر) اور جناب ابوالحسن انصاری صاحب (ایڈمنسٹریٹر) کی بے حد مشکور و ممنون ہوں۔

تحقیقی مقالے کی کمپوزنگ کے لیے میں محترمہ ساجدہ پروین (شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی) اور جناب غیاث الدین عثمانی و محمد علیم الدین (اسلامک ریسرچ اکیڈمی) کے تعاون کی بھی بہت مشکور ہوں جنہوں نے میرے مقالے کو ایک شکل دینے اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

میرے برادران اور ہمشیرگان اور میرے بھتیجے عدیل، دانش، بھتیجی مدیحہ کنول، میرے بھانجے فائق، راحیل، فرقان اور بھانجیاں مہناز، فرح، صباحت، نوین، رافعہ اور عالیہ بھی میرے تحقیقی کام میں میرے معاون رہے۔ بالخصوص میری بہن فرحین جہاں اور بھائی قاضی محمد قسیم اور بھابھی آصفہ پروین جن کی محبت اور تعاون کے شکریے کے لیے الفاظ کا سہارا ناکافی ہے۔

آخر میں اپنی رفیقِ کار محترمہ فرزانہ جبین کا خصوصی شکریہ۔ ہم دونوں نے اپنا تحقیقی کام ایک ساتھ شروع کیا اور بفضلِ تعالیٰ اس کو تکمیل تک بھی پہنچایا اس تمام عرصہ میں فرزانہ کی جانب سے مشاورت، معاونت اور رہنمائی کا بھرپور سلسلہ جاری رہا اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

صوفیہ فرناز

تلخیص

اسلام کی تاریخ ایسی ہمہ جہت شخصیات سے معمور ہے جن کے بارے میں تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مقصود پیدائش ہی یہ ہے کہ انہی خیابان تاریخ پر سنگ ہائے میل کی حیثیت حاصل ہو' یہ وہ زعماء ہیں جن کی روشن کی ہوئی شمعیں وطنی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ ان کی روشنی سے ایک عالم منور ہوتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور سب اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ سید مودودی بھی ایسی ہی ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ان کا شمار عہد حاضر کے ان علماء ومفکرین میں ہوتا ہے جن کی نظر قدیم و جدید علوم تاریخ پر یکساں دقیق اور وسیع تھیں۔ انہوں نے دامے' درمے' سخنے ہر زاویہ سے ملت اسلامیہ کی خدمت کی ہے اور اپنی تحریر' تقریر اور تحریک ہر اعتبار سے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک باب رقم کیا ہے۔

سید مودودی کا عہد جنوبی ایشیا میں استعماریت کے غلبے کا عہد تھا اور استعماری افکار ونظریات ہر سطح پر اہلِ ہند کو متاثر کر رہے تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا اگر ایک طبقہ مغربی افکار کا پروردہ تھا تو دوسری جانب سے شدید مزاحمت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سید مودودی کے والد جناب سید احمد حسن صاحب جو ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو صدیوں سے ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی کا گہوارا تھا۔ لیکن مغربی طرزِ تعلیم کے سبب ابتدأ وہ بھی مغربی خیالات کے پروردہ تھے۔ یہاں تک کہ ان کے والد (سید مودودی کے دادا) نے انہیں کرستان (کرسچن) کا خطاب دے دیا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی اصل کی جانب لوٹے تو سارے مغربی افکار واطوار تج دیئے اور فقر و درویشی اختیار کر لی۔ بقول مولانا مودودی ''انہیں دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ کبھی انگریزی تعلیم وتہذیب سے متاثر بھی ہوئے تھے''۔ سید احمد حسن نے اپنے بیٹوں کی تعلیم وتربیت میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ مغربی تہذیب کے اثرات سے متاثر نہ ہوسکیں۔

سید مودودی نے جب میدان عمل میں قدم رکھا اس وقت جنوبی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ وسط ایشیا اور

[illegible] کے ذریعے ان کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی مسلمان اکابرین اخبارات کے ذریعے حق کی آواز بلند کر رہے تھے۔ چنانچہ سید مودودی نے بھی جنہیں تحریر و انشاء پر قدرتاً مہارت حاصل تھی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے پیشے سے کیا۔ انہوں نے مختلف اخبارات کی ادارت بھی سنبھالی اور مضامین بھی لکھے۔ ان کے مضامین اخبارات کے علاوہ رسائل میں بھی شائع ہوئے۔

۱۹۰۳ء میں پیدا ہونے والے سید مودودی نے ۱۹۲۱ء تک اپنے زورِ قلم سے اکابرین ملت مولانا ابوالکلام آزادؒ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ علمائے دیوبند و ندوۃ العلماء کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کے درمیان اپنا ایک مقام بھی پیدا کر لیا۔ یہاں تک کہ مولانا محمد علی جوہر نے انہیں اپنے اخبار 'ہمدرد' کی ادارت کی پیشکش کی' دوسری جانب سے جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنی اخبار الجمعیۃ کی ادارت کے لیے ان سے رجوع کیا۔ جسے سید مودودی نے قبول کر لیا۔

الجمعیۃ سے شائع ہونے والے مضامین نے بہت جلد سید مودودی کو ہندوستان کی معروف شخصیات کی صف میں شامل کر دیا۔ خصوصاً ۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کے قتل پر اسلام کے خلاف شدید ردعمل پر مولانا محمد علی جوہر نے اسلامی نظریہ جہاد کو واضح کرنے کی جو اپیل کی۔ سید مودودی نے اس اپیل کو قبول کرتے ہوئے الجمعیۃ سے جہاد کے موضوع پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے پرمغز علمی مضامین نے ہندوستان کی علمی و ادبی شخصیات کو متاثر کیا جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

۱۹۲۸ء میں جمعیۃ العلمائے ہند کی جانب سے کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت کو قبول کیے جانے کے باعث سید مودودی نے جمعیت کی ادارت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ خصوصاً تاریخ کے موضوع پر آپ نے تاریخ آل سلجوق' تاریخ ابن خلکان کے ایک حصہ کا ترجمہ جو مصر کے فاطمی خلفاء سے متعلق تھا اور تاریخ دکن اور آصف جاہ کی سیرت پر کتب تحریر کیں۔ اس کے علاوہ اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کے لیے ترجمان القرآن کو اپنا ذریعہ بنایا۔ ترجمان القرآن میں سید مودودی کے مضامین

[illegible] تھا علامہ اقبال جو سید مودودی کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے سید مودودی سے ایک ایسے ادارے کی قیادت سنبھالنے کی درخواست کی جس کی اسکیم ان کے ذہن میں تھی جس کا مقصد ایسے اذہان تیار کرنا تھا جو برصغیر میں اسلام کے احیاء اور سربلندی کے لیے کردار ادا کر سکیں۔ سید مودودی نے علامہ اقبال کی دعوت قبول کر لی۔ اگرچہ اس کار خیر کے آغاز سے قبل ہی علامہ اقبال وفات پا گئے لیکن جناب مودودی نے بہت جلد ان کے خواب کو عملی شکل دے دی اور پٹھانکوٹ میں دارالاسلام کے نام سے چند مخلص افراد کی مدد سے ادارے کا قیام عمل میں آیا۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی سیاست میں انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ، حکومت برطانیہ ہند کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس متحدہ قومیت کی علمبردار تھی۔ کانگریس کے متحدہ قومیت کے نعرے کے سبب بہت سے مسلمان زعماء اس میں شریک تھے۔ ترجمان القرآن کے ذریعے سید مودودی نے متحدہ قومیت کے نظریے کی حقیقت اور اس کے منفی اثرات کی نشاندہی کر کے مسلم لیگ کی طاقت کو مضبوط کیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے جماعت اسلامی کی صورت میں ایسی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد نظامِ اسلامی کا احیاء تھا۔ ابتداً اس جماعت نے اپنے آپ کو سیاست سے علیحدہ رکھا۔

تقسیم برصغیر کے ساتھ ہی یہ جماعت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ سید مودودی کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد جماعت اسلامی پاکستان نے سید مودودی کی سربراہی میں پاکستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کا منشور پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ تھا جبکہ حکومت پاکستان کی اپنی الگ ترجیحات تھیں جس کے باعث حکومت کے ساتھ جماعت کے تعلقات کشیدہ رہے۔ حکومت پاکستان کے ساتھ تصادم کی صورتحال کے ساتھ ساتھ سید مودودی نے اپنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور سیاسیات، معاشیات، قانون اور دین و مذہب پر متعدد کتابیں تحریر کیں جن کے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ فرقہ قادیانیت کے خلاف آپ نے ''قادیانی مسئلہ'' لکھی جس پر آپ کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسیر زنداں بھی ہوئے اور موت کی سزا بھی سنائی گئی جس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

... نے سید مودودی کو بین الاقوامی شخصیت بنا دیا۔ عرب ممالک خصوصاً سعودی عرب نے سید مودودی کی خاص قدر افزائی کی اور مدینہ میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی کی مشاورت و معاونت کے لیے سید مودودی کا انتخاب کیا۔ سید مودودی نے تفہیم القران کی جغرافیائی تشریح کے لیے خود بھی عرب ممالک کے دورے کیے' اور تیس سال کی جانفشاں محنت کے بعد اس شاہکار کی تکمیل کی۔ جو آسان فہم ہونے کے باعث صرف اردو دان طبقہ تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے اور یوں اسے بھی اپنے مفسر کی طرح بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

سید مودودی کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف اگرچہ ملکی سطح پر سرکاری طور پر نہیں کیا گیا لیکن عوامی سطح پر ان کو خاص پذیرائی حاصل ہوئی اور مقالہ نگاروں نے ان کی مختلف حیثیتوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور بحیثیت مفکر' ماہر قانون' ماہر معاشیات' انشا پرداز اور نثر نگار کی صورت میں ہر پہلو سے ان کے تحریری مواد کو عنوانات کے تحت سمیٹ دیا۔

سید مودودی نے اسلامی تاریخ اور ہندوستان کی تاریخ پر اردو زبان میں گرانقدر سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا کے افکار میں مطالعۂ قرآن اور مطالعۂ تاریخ کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ کثیر التصانیف مصنف ہونے کے باعث ان کے ہاں موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ ان متنوع موضوعات میں تاریخی حوالے اور تاریخ کے پیرائے میں دلائل کی جو کثرت ہے وہ تاریخ سے ان کی گہری دلچسپی کا اظہار ہے۔

خاص تاریخ کے موضوع پر سید مودودی کے تاریخی شعور اور دقیق نظری کا اندازہ ان کی تصنیف کردہ کتابوں سے ہوتا ہے جو اگرچہ تعداد کے اعتبار سے مختصر ہیں لیکن علمی و تحقیقی اعتبار سے اپنے متعلقہ عہد پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن میں تفہیم القران' تجدید و احیائے دین' خلافت و ملوکیت' دکن کی سیاسی تاریخ' دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات پر ایک نظر اور سلاجقہ نمایاں ہیں جو سید مودودی کی تاریخ نویسی کا عمدہ اور بہترین شاہکار ہیں۔

ABSTRACT

"SAYED ABUL AALA MAUDUDI KI TAREEKH NAVESI KA FANNI O TAJZIATI MUTAALA."

History of Islam is adorned with such versatile personalities about who it may be claimed with certainty that the purpose of their creation was only to place them as milestones on the avenue of history. These were the great persons illumination of whose devoted services was not restricted to the frontiers of their homelands, but the luminescence of their wisdom and knowledge brightened the whole world to the advantage and benefit of all the people. Syed Maudoodi was also one of these versatile personalities. He is enlisted among those intellectuals and thinkers of the present times who had a deep and vast sight on the old and the modern sciences of history alike. He served the Muslim nation from all angles and in multiple aspects, and added a new chapter in the history of South Asia through his scripts, speeches and movement.

Syed Maudoodi's time was the one of domination of colonialism in South Asia when theories and thoughts of colonialism were influencing the people of India at every level. As for the Muslims, if one of their sects supported the western thoughts, the other offered intense resistance. Syed Maudoodi's father Syed Ahmed Hasan belonged to a family that had been a center of guidance, simplicity and mysticism, But it was be who because of his western Education, had initially advocated the western thought to such an extent that his father (Syed Maudoodi's grandfather) had given him (Syed Ahmed Hasan) the title of Christan (Christian). But when he reverted back to his origin, he set aside all the western thoughts and customs and adopted a simple and mystic life. In words of Syed Maudoodi; "From appearance it could not be guessed that he had ever been influenced even a bit by the English education and culture." Syed Ahmed Hasan took special care in the education and training of his sons, ensuring that they would not be impressed by the western culture.

When Syed Maudoodi entered the practical field of life, at that time the thought of freedom from the clench of colonialism had developed not only in South Asia but also in the Central Asia and the Middle East, and it had taken its start in the form of writings and speeches. In India, too, the Muslim elite was raising the voice of truth through newspapers. So, Syed Maudoodi who possessed natural talent in writing, joined the profession of journalism to start his active life. He took editorship of several newspapers and also wrote articles that were published in the newspapers as well as in journals.

Syed Maudoodi, having opened his eyes in 1903 had, by the year 1921, through his pen-work, not only impressed the great Muslim personalities like Maulana Abul Kalam Azad, Maulana Muhammad Ali Jauhar, Maulana Zafar Ali Khan and the scholars of Deoband and Nadwatul Ulema but had also established his place among them. He was even offered by Maulana Muhammad Ali Jauhar the editorship of his newspaper 'Hamdard'. On the other side, Jam'iatul Ulema-e-Hind

referred to him for the editorship of their paper Al-Jam'iah. Syed Maudoodi acceded to the latter offer.

The articles published from the platform of Al-Jam'iah very soon placed Syed Maudoodi among the renowned personalities of India. A particular event is the appeal the Maulana Muhammad Ali Jauhar made to him for elaboration of the Islamic theory of 'Jihad' (holy war) against the intense reaction against Islam at the murder of Swami Shardhanand in 1926. Acceding to this appeal, Syed Maudoodi started a series of articles on the topic of Jihad in the paper Al-Jam'iah. His thought-provoking articles impressed the intellectuals and literary personalities of India including Allama Iqbal.

Syed Maudoodi separated himself from the Jam'iatul Ulema-e-Hind when it accepted in 1928 the theory of united nationalism presented by the Congress. However, he continued his pen service. He authored books especially on the topic of history including the history of the Saljooq family, translation of one part of the history of Ibne Khalkan that pertained to the Fatimid

caliphs of Egypt, and also about the history of Dakkan and the life of Asif Jah. Besides, he took 'Tarjuman-ul-Qur'an' as the source of expression of his independent opinion. The articles by Syed Maudoodi appearing in Tarjuman-ul-Qur'an were praised by the intellectuals of India. Allama Iqbal was particularly impressed by his writings. He offered Syed Maudoodi to accept headship of an institution the scheme of which he had in his mind. Purpose of this institution was to prepare such minds who could play their role for the revival and rise of Islam in the Sub-Continent. Syed Maudoodi accepted Allama Iqbal's offer. Although Allama Iqbal passed away before the start of this scheme, yet Syed Maudoodi materialized Allama's dream very shortly by establishing an institution named Darul Islam at Pathankot with the help of a few sincere persons.

This was the time when in the Indian politics, the Congress and the Muslim League had set against the British government of India. The Indian National

Congress held the emblem of united nationalism. On account of the slogan of united nationalism raised by the Congress, a number of Muslim elite had joined the Congress. Through Tarjuman-ul-Qur'an, Syed Maudoodi strengthened the Muslim League by pointing out the reality of the united nationalism and its negative consequences. At the same time, in the form of Jama'at-e-Islami he initiated a movement aimed at the revival of Islamic system. At the outset, this Jama'at kept itself separate from politics.

With the division of the Sub-Continent, this Jama'at also divided into two parts. After migration of Syed Maudoodi to Pakistan, Jama'at-e-Islami Pakistan started participating in the county's politics under the leader of Syed Maudoodi. Its manifesto was the implementation of Islamic system whereas the government of Pakistan had its own priorities. Due to this fact, relations between the government and the Jama'at remained tense. Along with remaining in a state of conflict with the government, Syed Maudoodi continued his writing work and authored

religion. These books were translated into several languages of the world. On writing the 'Qadiani Mas'ala' (the Qadiani Issue) against the Qadiani sect, he had to face severe opposition. He was sent to jail and also sentenced death penalty. This sentence could not be exercised.

The world level reaction against the death sentence of Syed Maudoodi turned him into an international figure. The Arab countries, especially Saudi Arabia honored Syed Maudoodi and selected him for consultation and help in the establishment of the Islamic University at Madina. Syed Maudoodi himself visited the Arab states for the geographic elaboration of 'Tafheem-ul-Qur'an', and accomplished this masterpiece after thirty long years of strenuous endeavors. For the attribute of being easily comprehensible, this work did not remain limited to the Urdu readers, but it was translated into several languages and hence, like its author, it won worldwide fame.

Although the intellectual and religious services of Syed Maudoodi were not recognized in the country on government level, yet these services gained popularity among the masses, and the theses-writers used his various positions as topics for their research, and also covered his published material under various titles as a thinker, jurist, economist and writer.

To the Islamic history and the history of India, Syed Maudoodi made valuable contribution. In his thoughts, the study of Al-Qur'an and history bear distinguished place. Despite having authored a number of books, one will find variety of topics in the perspective of history and these works reflect his deep interest for the subject of history.

On the specific topic of history, Syed Maudoodi's consciousness and deep-sight can be judged from his books which though small in number, yet are considered, scholastically and research-wise, authentic on his period. Among these, significant are 'Tafheemul Qur'an','Tajdded-o-Ahyaa-e-Deen','Khilafat-o- Mulookiyat',

'Dakkan ki Siasi Tareekh', 'Daulat-e-Asifia aur Hakoomat-e-Bartania ke Siasi Ṭa'alluqat par Aik Nazar', and 'Salajuqah'. These books stand as excellent and the best work on history by Syed Maudoodi.

طریقۂ تحقیق

تحقیق کے لغوی معنی، کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین کے ہیں، ڈاکٹر گیان چند تحقیق کے موضوع پر اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' (طبع اوّل ۱۹۹۴ء) میں لکھتے ہیں:

''تحقیق کا عمل بنی نوع انسان کے بچپن سے اس کے حین حیات تک جاری رہتا ہے جب کسی امر کی اصل شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اس کی اصل شکل دریافت کرنے کا عمل تحقیق ہے''۔

پروفیسر نثار احمد زبیری صاحب نے تحقیق سے متعلق اپنی تحقیقی کاوش ''تحقیق کے طریقے'' (اشاعت دوم، فروری ۲۰۰۹ء) میں تحقیق کو انسان کی سب سے زیادہ علمی بامعنیٰ اور دوررس سرگرمی قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تحقیق نے جہاں انسان کی زندگی کے چھوٹے بڑے، سادہ و پیچیدہ مسائل حل کیے ہیں وہیں اس کے علم و آگہی میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا ہے۔

تحقیق کی اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر زبیری لکھتے ہیں: تحقیق یوں تو ایک ایسا بھرپور سائنسی عمل ہے جسے خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں، تاہم اس عمل کی مختلف کیفیات کو سمجھنے کے لئے اس کی کچھ اقسام مقرر کی گئی ہیں۔ یہ یہ اقسام کسی طرح سے ہوا بند خانے (Airtight Compartments) نہیں ہیں بلکہ ان کی نوعیت ایک دوسرے سے مربوط ایسی اکائیوں کی ہے جن سے باہم مل کر کل کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان اجزاء کی تفہیم سے ہی تحقیق کی مکمل نوعیت کو سمجھا اور برتا جاسکتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک تحقیقی کام ان میں سے کئی اقسام سے بہ یک وقت متعلق ہوسکتا ہے۔

تحقیق کی اقسام کئی طریقوں سے معین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ طریقے سائز، وقت، مقصد اور کیفیت کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔

سائز کے اعتبار سے تحقیق وسیع (Macro) اور محدود (Micro) ہوسکتی ہے۔ وقت کے اعتبار سے تحقیقی کام دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے تحت نمونہ بندی کی مدد سے کم سے کم وقت کے اندر مکمل کرلیا جاتا ہے اور دوسرے وہ جن میں مطالعہ کا سلسلہ طویل وقت پر محیط ہوتا ہے۔ تحقیقی کاموں کی ایک تقسیم اس بنیاد پر کی جاتی ہے جو محقق کے پیش نظر ہو۔

تحقیقی کاموں کی ایک اور درجہ بندی اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ وہ کیفیتی یا کمیتی (Qualitative or Quantitative) ہو۔ تاریخی تحقیق (Historical Research) واضح حد تک کیفیتی ہوتی ہے کیونکہ اس میں ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں ضروری کیفیات تلاش کی جاتی ہیں اس کے برعکس تجزیہ مشتملات (Content Analysis) واضح طور پر کمیتی ہوتا ہے کیونکہ اس میں نتائج کی مقداری نوعیت تلاش کی جاتی ہے۔

تاہم یہ ضروری نہیں کہ کوئی تحقیقی کام کلیتاً صرف کمیتی ہو یا صرف کیفیتی ہو۔ عموماً ایک تحقیقی کام کا کچھ حصہ کیفیتی اور کچھ حصہ کمیتی ہوتا ہے اس طرح اسے زیادہ قابل فہم اور زیادہ قابل قبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم کیفیتی تحقیق کو زیادہ اہم اور قابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے۔

زیرنظر تحقیق کیونکہ تاریخی نوعیت کی ہے اور اس کا تعلق تاریخ نویسی سے ہے لہٰذا تحقیق کے تاریخ سے متعلق طریقے کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنے کی لازمی ضرورت ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر فرمایا ہے:

زمانہ ایک ، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اس لافانی شعر میں حضرت علامہ اقبال نے بہت اچھے انداز میں وضاحت کی ہے کہ ماضی و حال کی تفریق درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ حیات ایک جاری عمل ہے۔ جس میں گزرنے والا اور ماضی بننے والا ہر لمحہ، ماضی کے لمحات سے مربوط ہے۔ اور اسی نسبت سے کوئی معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو یہ بات

سامنے آتی ہے کہ تاریخ ماضی کے حالات وواقعات کا آئینہ تو ضرور ہے لیکن محض ماضی سے متعلق نہیں ہے۔ وہ حال کی توضیح اور تفہیم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تاریخ کی اس وضاحت کی روشنی میں اس امر کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی کہ تاریخ کو محدود کر کے اسے محض بادشاہوں اور ان کے درباری امراء کی داستانوں کا مخزن سمجھا جائے۔ یہ تفصیلات تاریخ کے بہت بڑے ذخرہ معلومات کے محض ایک جزے کی حیثیت رکھتی ہیں، زیادہ اہمیت اس منشاء اور مقصد کی ہے جس کی تکمیل کے لئے تاریخ لکھی جاتی ہے۔ وہ منشاء ومقصد ماضی کے ان تمام اجزاء کو جھاڑ پونچھ کر سامنے لانا ہوتا ہے جن سے ماضی کا نمونہ زندگی (Mosaie) عبارت ہوتا ہے۔ اس نمونہ زندگی میں واقعات کے اسباب اور ان کے تاثرات ونتائج کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ ماضی کے حوالے سے تحقیق کرنے والے کا مقصد اسباب و نتائج کا کھوج لگانا، مشہور ہو جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا اور اصل حقیقت کو اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ ان کے حوالے سے حال کو سمجھ کر مستقبل کی موثر منصوبہ بندی کی جائے۔

تاریخ کی مندرجہ بالا وضاحت سے ظاہر ہوا کہ تاریخی تحقیق، ماضی کے ذخیرۂ معلومات اور سائنسی طریقہ تحقیق کے امتزاج کے نام ہے۔ ان وضاحتوں اور ضرورتوں کی روشنی میں تاریخی تحقیق کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے۔

> ''تاریخی تحقیق ماضی کے واقعات، تغیرات اور تجربات کے ایسے دقیق مطالعے کا نام ہے جس میں معلومات کے ذرائع اور ان سے سامنے آنے والی شہادتوں کو پرکھا جاتا ہے اور ان کی توضیح کی جاتی ہے''۔

تاریخی تحقیق کی کئی اقسام متعین کی جاسکتی ہیں، تاہم دو اقسام قابلِ ذکر ہیں کیونکہ زیرِ نظر تحقیق میں ان اقسام کو ہی استعمال کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک قسم بیانیہ ہے۔ بیانیہ تحقیق میں تاریخی حقائق کو صرف بیان کیا جاتا ہے اور اس کی ترتیب عموماً زمانی ہوتی ہے۔ حقائق کے بعد ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اور آخر میں ان کی قدر کا تعین کیا جاتا ہے۔

تاریخی تحقیق کی دوسری قسم بیینی ہے۔ اس طرح کی تحقیق میں تاریخی حقائق کا صرف بیینی جائزہ لیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں بنیادی طور پر بیانیہ و تاریخی طریقۂ تحقیق سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں جن ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں موضوع سے متعلق کتب، اخبارات و جرائد، مکاتیب اور انفرادی دستاویزات کے علاوہ لغات اور قاموس شامل ہیں۔

فہرست

باب اوّل

عصرِ مودودی: جنوبی ایشیاء کی مجموعی صورتحال

جنوبی ایشیا کی مجموعی صورتِ حال

برصغیر میں وسط ایشیاء سے آنے والے مسلمانوں نے سلاطین دہلی اور سلاطین مغلیہ کے نام سے کئی صدیوں تک عظمت و جلال کے ساتھ حکومت کی۔ اگر چہ برصغیر (جنوبی ہند) میں اسلام کی آمد بعثت نبویؐ کے کچھ عرصہ بعد عرب تاجروں کے ذریعے ہو چکی تھی۔1 آٹھویں صدی عیسوی (۷۱۱ء) میں محمد بن قاسم کی پیش قدمی سے سندھ کو باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہوا، لیکن باقاعدہ اسلامی حکومت کا آغاز دسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرے میں شمالی ہند میں ہوا۔ ان ادوار میں اسلام کی کیا صورتحال رہی سید مودودی نے اس کا بڑا ٹھوس اور مدلل تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس خطے میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتداء ہی سے کمزور ہے۔ صدر اول میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں، اس لئے کہ اس زمانے میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا، اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصول عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے، عموماً بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔ چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وہ خود عجمی

کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دئے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کی حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہیے تھی ویسی ہو سکی، علماء اور صوفیاء کے ایک مختصر گروہ نے بلا شبہ نہایت زرین حدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جبکہ قوم کے عوام جاہل اوران کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں''۔2

تمام تر کمزوریوں کے باوجود ان حکمرانوں نے ہندوستان میں رہنے والے مختلف النسل اور مختلف المذاہب افراد کو ان کی پوری سیاسی، مذہبی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ متحد رکھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سلطنت مغلیہ کی ناقص حکمت عملیوں کے باعث نہ صرف ہندوستان میں رہنے والی ان اقوام کے درمیان قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے، بلکہ بدلتے ہوئے حالات سے جس قوم نے فائدہ اٹھایا وہ سولھویں صدی عیسوی میں آنے والے انگریز تھے۔ سید مودودی نے اس صورتحال کو اس طرح واضح کیا ہے:

''اٹھارویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھین لیا گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت منتشر ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم

ہوئی، پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد قضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرا تھا کہ مسلمان اسی سرزمین پر مغلوب ہوئے جس پر انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریز سلطنت جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا، اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کئے اسلامی قوانین کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ابتداء سے انگریز حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے''۔[3]

اس صورتحال میں مسلمانوں کی جانب سے احیائے اسلام اور احیائے ریاست اسلامیہ کے لیے جو قدم اٹھایا گیا وہ شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء۔۱۸۲۴ء) کے فتاویٰ اور سید احمد شہید (۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) کی تحریک کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اور بہ ظاہر ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں کہ:

''سید احمد شہید نے اتنے وسیع پیمانے پر جو انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہوسکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کردیا، پھر غایت تدبر کے ساتھ آغاز کار کے لیے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافیائی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہوسکتا تھا۔ پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصول اخلاق اور قوانین جہاد استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلے میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اسی طرح انہوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں روح اسلامی کا مظاہرہ کردیا۔ ان کی جنگ ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لئے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام قائم کریں جو خالق و مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لئے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کرکے تلوار اٹھائی اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اس مہذب قانون کو پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے، ان کو ایک چھوٹے سے علاقے سرحد میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا انہوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت قائم

کی جس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔

جہاد و قیام خلافت میں بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے اظہار کے باوجود بنیادی نتائج کے اعتبار سے اس تحریک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ حقیقی اعتبار سے مجاہدین نے افکار و خیالات میں جو حرکت پیدا کردی تھی اس کے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں''۔۹

سید مودودی اس تحریک کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ء۔۱۶۲۴ء) کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی، مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے، اس کے لئے دوسرا قالب بھی ممکن ہے اس کے لئے زبان بھی دوسری استعمال کی جاسکتی ہے، رموز و اشارات سے اجتناب بھی کیا جاسکتا ہے، پیری مریدی اور اس سلسلے کی تمام عملی شکلوں کو چھوڑ کر

دوسری شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ اسی پرانے قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے جس میں مدتہائے دراز سے جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہورہی ہے اس کی کثرت اشاعت نے مسلمانوں کو جن اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا یہ وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، بہر حال یہ قالب استعمال کرتے ہی وہ تمام بیماریاں پھر عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اس کے ساتھ وابستہ ہوگئی تھیں''۔5

سید مودودی نے دوسرے سبب کی جو نشاندہی کی ہے وہ خصوصی اہمیت کی حامل ہے، ان کی رائے میں ''جس دور میں ولی اللّٰہی تحریک جہاد بالقلم اور جہاد بالسیف کے مراحل سے گزر رہی تھی اس دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا، اور وہاں علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک دنیا بدل ڈالی۔ مفکرین یورپ نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا، یہ وہی دور تھا جب طبعیات اور حیاتیات میں ہونے والی تحقیقات نے نہ صرف سائنس ہی کو ترقی دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ فرانس جرمنی اور انگلستان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمرانی پر زبردست اثر ڈالا، اور انتہائی جرات اور بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔

پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب کی بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعۂ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل

دیے، نظام تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن وسیاست کا پورا نظام بدل دیا۔ اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیا اسی زمانے میں انجینئرنگ کی غیر معمولی ترقی ہوئی، جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں، اسی زمانے میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فن جنگ، نئے آلات اور نئی تدبیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلے میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بے کار کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلے میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں اور عالم اسلام کے عین قلب پر حملہ کر کے نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کر لیا۔6

مزید لکھتے ہیں جس وقت یہ حضرات جہاد کے لئے اٹھے ہیں، اس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریزوں کی ہے اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالفت اگر ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہِ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا، کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے جس حریف سے نمٹنا تھا اس کے مقابلے میں اپنی قوت کا اندازہ کرتے اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کرتے، بہر حال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اس عالم اسباب میں ایسی چوک کے نتائج سے بچ نہ سکتے تھے"۔7

نتیجتاً سکھوں کے ہاتھوں تحریک کے سرکردہ رہنماؤں کی شہادت کے بعد انگریزوں کی مسلح طاقت نے اس تحریک کا سرا نجد کے وہابیوں کے ساتھ جوڑ کر وہابیوں کی طرح مجاہدین کو حکومت کا باغی قرار دیا۔ اور تحریک کے رہنماؤں، کارکنوں اور حامیوں کے خلاف متعدد فوجداری مقدمات چلائے۔8 سخت سزائیں دی گئیں بہت سوں کو طویل المعیاد قید یا کالے پانی کی سزائیں دی گئیں، بڑے بڑے رہنماؤں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں9 اور مضحکہ خیز قیمتوں پر فروخت کر دی گئیں۔10

یہ ساری کارروائی محض مجاہدین کے ساتھ ہی نہ کی گئی بلکہ ہندوستان میں احیائے اسلام اور اصلاح مسلمانوں کے لئے چلائی جانے والی ہر تحریک کا یہی انجام ہوا، جس میں بنگال کی تیتو میر اور فرائضی تحاریک نمایاں ہیں جس میں اپنوں کی غداریاں اور حکومت وقت کی عیاریاں نظر آتی ہیں اس صورتحال پر مسز اینی بیسنت (Annic Besant) کا تبصرہ بھی قابل ذکر ہے وہ لکھتی ہیں:

''کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا، بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت سازش، نفاق اور حد درجے کی دو رخی پالیسی پر عمل کر کے، ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر یہ ملک حاصل ہوا''۔11

انگریزوں کے پیش نظر ہندوستان کی اہمیت میں بنیادی مقصد یہاں کی دولت کا حصول تھا لہٰذا اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے وہ ہندوستان میں ایک ایسا نظام متعارف کرانا چاہتے تھے، جو ہندوستانیوں کو مکمل طور پر انگلستان کے مزاج کے مطابق ڈھال دے۔ (تاکہ مستقبل کی ممکنہ بغاوتوں کا سد باب کیا جا سکے) اس سلسلے میں جو اقدامات کئے گئے ان میں نظام تعلیم و مذہب اور رفاہ عام اہم ہیں۔ نظام تعلیم کے سلسلے میں لارڈ میکالے (Lord Macaulay) کی تجاویز قابل ذکر ہیں، جو اس نے تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے ضمن میں دی تھیں۔ اور اپنی رپورٹ میں اس رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو''۔12

تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر شعبوں میں اصلاحات کے ذریعے بھی اسی فکر کو مدنظر رکھا گیا ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جولڑکے عیسائی کیے گئے، وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ارادۂ گورنمنٹ کا ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح مفلس اورمحتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔13

اصلاح مذہب کے سلسلے میں تمام اہل ہند کو مذہب واحد سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ (Edmund) نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس مراسلات بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ ایک خبر ہوگئی، ریلوے، سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہیے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی ایک مذہب ہو جاؤ۔14

اس قسم کے جذبات کا سلسلہ جو ہندوستان کے ملازم انگریزوں اور عیسائیوں سے لے کر پارلیمنٹ تک قائم تھا اس کا اندازہ مسٹر مینگلس (Mangels) ممبر پارلیمنٹ کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں کی تھی، اور جس نے آتش جہاد کے مشتعل کرنے میں خاص اثر کیا۔ مسٹر مینگلس نے کہا ''خداوندتعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیے''۔15 چنانچہ ہندوستان میں ایک متحدہ تہذیب و معاشرت کے لیے ایک زبان (انگریزی) اور ایک مذہب (دین عیسوی) کا نفاذ عملی طور پر ہو چکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مختلف اصلاحات جن میں ریاستوں کا الحاق، زراعت وتجارت وجیل کے قوانین، حفظان صحت اور بیواؤں کی دوسری شادی سے متعلق قوانین نے ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم میں انتشار اور بے چینی پیدا کر دی تھی۔ مدارس، اوقاف اور عدالتی نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مداخلت نے علماء کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ میلکم لوئین (Malcolm Leon) جج عدالت عالیہ مدراس وممبر کونسل نے

اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا ''ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسوم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، امراء کی ریاستیں ضبط کرلیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انہیں تکلیف دے کر مالگذاری وصول کی، سب سے اونچے خاندان کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کیے۔16

انگریزوں کی غلط حکمت عملیوں کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء میں اہل ہند کی جانب سے انگریز تسلط کو ختم کرنے کی آخری کوشش کی گئی، جو نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ پورے ہندوستان پر انگریز اقتدار کی مہر ثبت ہوگئی۔

سید مودودی اسی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لگی تھی، اس نے مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا، ان کے دلوں پر مایوسی اور احساس ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کردیں۔ ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت اور ترقی کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایہ علم وتہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل سبب ذلت اور موجب نکبت ہے''۔17

انگریزوں کا عام طور پر خیال تھا کہ اس ''غدر'' کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں پر ہے، چنانچہ انہوں

نے اس کا بدلہ لینے کے لئے بے شمار مسلمانوں کو، جن پر غدر میں حصہ لینے کا خفیف سا بھی شبہ تھا، پھانسی پر چڑھا دیا، بہتوں کی جاگیریں اور جائیدادیں ضبط کرلیں۔18 مسلمانوں کو اقتصادی، سیاسی اور ذہنی طور پر مفلوج کرنے کی پوری کوشش کی، ملازمتوں اور تعلیمی درسگاہوں کے دروازے بند کردئے گئے۔ انہوں نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ترقی و بقاء کے دروازے بند کردیے دوسری طرف ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا، اکسایا اور منظم کیا انہیں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے سلسلے میں تمام مراعات اور رعایات مہیا کیں۔19 مسلمانوں کے ساتھ یہ ناروا سلوک کیوں کیے گئے اور ہندوؤں کو مراعات خسروانا سے کیوں سرفراز فرمایا گیا جبکہ ارتکاب جرم میں وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے؟ اس کا جواب انگریزوں کی اس پالیسی سے ملتا ہے جو مورخہ ۸/ مارچ ۱۸۷۰ء کو کلکتہ گزٹ میں بصورت اعلان شائع کی گئی تھی۔

''ہندووں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے، اگرچہ اکثر لوگوں کا مشورہ تھا کہ مسلمانوں کو تقویت دے کر ہندووں کی فوجی قوت کو مغلوب کیا جائے مگر یہ تدبیر اور انتظام مناسب نہیں کیونکہ کچھ ضروری نہیں کہ ہم ایسے کام کریں جو ہندووں کو ناگوار خاطر ہوں، اور جو سلطنت بر سر زوال ہے وہ حقیقت میں ہماری قلبی دشمن اور رقیب ہے اس کی حمایت اور مدد کریں''۔20

انگریزوں کی مسلم کش اور ہندو نواز پالیسی کا آغاز ۱۸۴۲ء میں لارڈ البز (Lord Elbiz) گورنر جنرل ہند کے دور میں باقاعدہ ہو چکا تھا۔ کابل اور غزنی کی فتح کے بعد یہ مسلم دشمن انگریز اپنے ایک مکتوب میں ڈیوک آف ولنگٹن (Duke of Welington) کو لکھتا ہے ''ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد دس فیصد ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا ساتھ دیں جن کی تعداد نوے فیصد ہے جو ہماری وفادار ہے''۔ ۱۸۴۳ء میں پھر اپنی اس مسلم کش پالیسی کا اعادہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے ''میں اس عقیدے کے خلاف کیسے آنکھیں بند کرلوں کہ مسلمانوں کی یہ نسل دیوانہ وار ہماری دشمن ہے اور اسی لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے'' یہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت مسلمان تعلیمی اور اقتصادی طور پر تباہ کیے جارہے تھے اور ان کی اس تباہی سے

فائدہ اٹھانے والی ہندو قوم تھی۔21

لہٰذا اب مسلمانوں کی غلامی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ غلامی محض سیاسی غلامی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے لئے فکری طور پر موت کا پیغام رکھتی تھی۔ اب ان کو ایک تازہ دم تہذیبی تحریک کا مقابلہ کرنا تھا جو ملک کے حکمرانوں کی تہذیب ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اثرات کی حامل تھی22 مسلمانوں کی اس درماندگی کی حالت میں ان کی رہنمائی بنگال میں نواب عبداللطیف نے کی۔ انہوں نے ۱۸۶۳ء میں کلکتے میں محمڈن لٹریری سوسائٹی (Muhammedan Literary Society) قائم کی23 مگر نواب صاحب کی تعلیمی تحریک اپنے مقصد کے لحاظ سے بھی محدود تھی اور اپنے دائرہ عمل کے لحاظ سے بھی، لیکن مذہبی، تہذیبی، سیاسی اصلاح و ترقی کی ایک ہمہ گیری تحریک جس نے سارے شمالی ہندوستان کے اونچے اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے کر ان میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا سرسید احمد خان نے شروع کی24 قوم کی بدحالی نے سرسید احمد پر جو اثر کیا اس کا اندازہ اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں مظفر نگر میں کی تھی وہ کہتے ہیں:

''جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اسی اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائسی، خانسامانی، خدمتگاری، گھس کھودے ہونے کے سوا اور کسی درجے میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمان کے نام سے نہ پکارا جائے گا''۔25

سرسید کی پالیسی حکومت وقت کے ساتھ سمجھوتے اور مفاہمت کی پالیسی تھی اس کا اظہار ان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

''گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بزور حاصل کی

نہ مکر و فریب سے بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا"۔ 26

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

"اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان و مال کو محفوظ رکھتی ہے" جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے، تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابع اور خیر خواہ رہنا چاہیے" 27

تعلیم سے سرسید احمد خان کا مقصد یہ تھا کہ قوم کی ذہنی سطح بلند ہو اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو۔ وہ مغربی تعلیم کو اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ سائنس اور علوم و فنون کی ساری ترقی اس کے ذریعہ قوم تک پہنچ سکتی تھی نہ کہ اس لیے کہ وہ حکمران قوم کے علوم تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرف ان کی نظریں بار بار اس لیے نہیں اٹھتی تھیں کہ وہ آقا کے ملک کی درسگاہیں تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ قوم کی علمی عظمت کے نشان تھے اور سید احمد مرحوم کا دل تڑپتا تھا کہ اپنی قوم میں بھی ویسی ہی علمی عظمت اور بلندی کے نشان پیدا کرسکیں۔ 28 علیگڑھ کا ادارہ سرسید کے انہی مقاصد کی تکمیل تھا۔ دوسری طرف علماء سرسید کی اس فکر کے شدید خلاف تھے۔ اس کے برعکس وہ مسلمانوں کے دین اور تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھنے کے لئے شدت سے کوشاں تھے۔ علمائے دیوبند اس جدوجہد میں پیش پیش تھے، وہ اعلیٰ مناصب اور سرکاری ملازمتوں کے برعکس احیائے اسلام کے لئے ایسے افراد تیار کرنا چاہتے تھے، جو نہ صرف فہم دین سے آراستہ ہوں بلکہ اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ 29

اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کی تو دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے: ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول، اپنے جاہلی افکار و تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔ دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تہذیب و تمدن کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوسری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں نظر آیا کہ انگریز سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے ان پر بند کر دیے ہیں اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں، چنانچہ مرحوم سرسید احمد خان کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس کے اثر سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انہوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے، قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تا کہ مسجدوں کی امامت، مکتبوں کی معلمی کے کام آئے اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیے گئے تا کہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون

کے نقوش ثبت کیے جائیں''۔30

سرسید اگرچہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے شدت سے خواہشمند تھے، لیکن وہ ۱۸۸۵ء میں قائم ہونے والی ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے سخت مخالف تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمان آئینی جدوجہد سے ناآشنا ہیں، سب سے بڑھ کر انہیں مسلمانوں سے اندیشہ تھا کہ وہ قدیم طریقہ کے مطابق سلطنت سے اپنی نادانی کا اظہار بذریعہ انقلاب کریں گے۔ جن کے نتائج ان کے حق میں مثبت نہ ہوں گے۔31 اس کے برعکس ۱۸۸۸ء میں علمائے دیوبند نے نہ صرف کانگریس کی حمایت کی بلکہ مسلمانوں کو اس میں شرکت کی اجازت بھی دی۔ جبکہ اس صورتحال کے متعلق سید مودودی کا کہنا تھا:

''یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہِ راست انگریزی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے اور ان میں آہستہ آہستہ وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکم خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے تقریباً پچاس سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا، تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کے لئے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جس کے دماغ میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداً اس کے پیش نظر محض ایک

ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے''۔32

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے پندرہ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ انیسویں صدی عیسوی اپنے انجام کو پہنچی اور بیسویں صدی کا آغاز ہوا، اس صدی میں برصغیر کے مسلمان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مسلمان بھی انتشار کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ایران، مصر اور افریقہ کی بیشتر ریاستوں پر استعماری طاقتیں قابض ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت سلطنت عثمانیہ بھی سامراجیوں کے پھندے میں پھنس چکی تھی اور اس کی وسیع حدود سلطنت اب سمٹ رہی تھیں کانگریس کے قیام کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں میں عداوت و اختلافات وسیع ہو رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ہونے والی بنگال کی تقسیم نے اس خلیج کو مزید بڑھا دیا، ہندو ہر قیمت پر اس تقسیم کو منسوخ کرنے پر زور دے رہے تھے اس صورتحال نے مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سوچنے پر مجبور کر دیا اور ان میں ایک جماعت کی تشکیل کا احساس شدت سے پیدا ہوا چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی،33 جس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفاد کی نگہداشت کرنا تھا۔ اس کے تین سال بعد یعنی ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے (Minto-Morley) آئینی اصلاحات ہندوستان میں نافذ ہوئیں اس کی رو سے مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کے حقوق تسلیم کیے گئے اور حلقہ ہائے انتخاب بھی علیحدہ تسلیم کیا گیا34 اس پر ہندو سیاستدانوں اور کانگریس نے فوراً تنقید اور مخالفت کی ایک مہم شروع کر دی، کانگریس نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ء میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ نمائندگی کی آئینی دفعہ کے خلاف اظہار مذمت کیا اور مطالبہ کیا کہ حق رائے دہی کے معاملے میں ملک معظم کی رعایا کے مختلف فرقوں کے درمیان اس قسم کی بے قاعدہ حد بندیوں کو دور کیا جائے۔35

ہندوؤں کی اس سیاسی بیداری اور اجتماعی جلسے جلوسوں کے نتیجے میں ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے علاوہ بھی کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی انگریزوں کے ساتھ روایتی وفاداری کو متزلزل

کر دیا، اور انہیں اپنے مستقبل کی سیاسی پالیسی کے بارے میں بالکل نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مثلاً ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر برطانیہ کی حمایت و مدد سے اٹلی کا قبضہ بلقان کی ریاستوں کا برطانیہ کی مدد و تعاون سے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنا تاکہ ترکوں اور اسلام کو یورپ کی سرزمین سے بالکل خارج کر دیا جائے۔36 جنگ طرابلس کی وجہ سے مسلمانان برصغیر میں جو جوش اور ہیجان واضطراب پیدا ہوا تھا، جنگ بلقان نے اس میں اور اضافہ کر دیا، ہندوستان میں ترکی کی حمایت وامداد کے لئے زبردست تحریک چلی، ہلال احمر کی انجمنیں قائم ہوئیں اور ترکوں کی امداد کے لئے لاکھوں روپیہ چندہ جمع ہوا۔37

ہندو دانشوروں نے بھی مسلمانان ہند کے اس جذبے کا اعتراف کیا ہے۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس میں جب اٹلی نے دفعۃً ترکی پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان کے دوران میں ہندوستانی مسمانوں میں ترکوں کے ساتھ ہمدردی کی ایسی زبردست لہر اٹھی جسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یوں تو سب ہی ہندوستانیوں کو ان سے تعلق خاطر اور ہمدردی تھی، مگر مسلمانوں کے دلوں میں یہ جذبہ اس قدر شدید تھا جیسے ان کا اپنا مسئلہ ہو۔ آخری اسلامی سلطنت صفحہ ہستی سے مٹ رہی تھی، مسلمانوں کی آئندہ امید کا مرکز تباہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر مختار انصاری ترکی میں ایک طبی مشن لے کر گئے اس کے لئے غربا تک نے چندہ دیا، روپیہ اس قدر تیزی سے اکٹھا ہوا کہ خود ہندوستانی مسلمانوں کے کسی کام کے لئے آج تک نہ ہوا تھا پہلی عالمگیر جنگ مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش تھی کیونکہ ترکی، برطانیہ کے خلاف تھا وہ بے بسی کی حالت میں کچھ نہ کر سکے، جب جنگ ختم ہوئی تو ان کے دبے ہوئے جذبات، تحفظ خلافت کی تحریک میں ابل پڑے ۱۹۱۲ء

ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشو ونما کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال ان کے دو مشہور ہفتہ واری اخبار شائع ہوئے ان میں سے ''الہلال'' اردو میں اور ''کامریڈ'' انگریزی میں شائع ہوتا تھا38 بدلتے ہوئے عالمی حالات نے مسلمانان ہند میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ ان کے ادب پر بھی اثر ڈالا، علامہ اقبال اور آغا حشر کاشمیری نے مغربی استعمار کے حلاف زوردار نظمیں لکھیں''۔39

طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں ترکوں کا بہت زیادہ نقصان ہو چکا تھا ان کی فوجی طاقت بری طرح متاثر ہوگئی تھی اس دوران پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوگیا ۱۹۱۴ء میں ترکی نے جرمنی کی حمایت میں برطانیہ کے خلاف اعلان جہاد کردیا برصغیر کے مسلمان انتہائی گومگو حالت میں تھے سیاسی طور پر وہ انگریزوں کے زیرنگین تھے لیکن ان کی اخلاقی وروحانی ہمدردیاں ترکوں کے ساتھ تھیں۔ مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں برطانیہ اور فرانس مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر قبضہ کرلیں گے، اور مقامات مقدسہ کی حرمت کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ انگریزوں نے ایک اعلان کے ذریعے مسلمانان ہند سے اس امر کا وعدہ کیا تھا، کہ وہ اور ان کے حلیف مسلمانوں کے مقدس مقامات کے خلاف کسی قسم کی فوجی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے40 لیکن جب برطانیہ نے شریف حسین کی مدد سے ترکوں کو شکست دی تو اس باغیانہ جنگ میں مسلمانوں کا کوئی مقدس مقام محفوظ نہ رہا۔41

شریف مکہ کی اس غداری کی مسلمانان ہند نے شدید مذمت کی، مسلمان رہنما ترکوں کی حمایت میں جو کچھ تحریر کرتے انگریز اسے بغاوت کا نام دے کر مسلمان رہنماؤں کو جیل میں بند کر دیتے، ان رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں بند کردیا گیا۔ مسلمانوں کے اخبارات یا تو بند کردیے گئے یا پھر ان پر پابندی عائد کردی گئی، جبکہ علمائے دیو بند جناب محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی جو ملک سے باہر رہ کر ہندوستان میں

انگریزوں کے خلاف انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے، شریف حسین اور شاہ افغانستان کی بغاوت کے باعث ناکام ہوئے۔ اوران کی تحریک ''ریشمی رومال'' کوبھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔42

خلافت کمیٹی کا قیام:

جنگ عظیم اول کا خاتمہ خلافت عثمانیہ کی شکست کی صورت میں ہوا۔ یورپی افواج قسطنطنیہ پر قابض ہوگئیں یونانیوں نے سمرنا اور ازمیر میں درندگی اور وحشیانہ پن کا مظاہرہ کر کے ہزاروں ترکوں کوشہید کردیا، مساجد کو آگ لگادی لیکن ان تمام تر ناکامیوں کے باوجود ترک حریت پسندوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اپنی آزادی کی جنگ کا اعلان کردیا، اور یونانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا۔ مسلمانان ہند نے بھی بہت سی پابندیوں کے باوجود ۱۹۱۹ء میں خلافت کے تحفظ کے لئے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا چنانچہ خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔43 خلافت کمیٹی کا ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں انگلستان گیا تاکہ حکومت کے سامنے مسلمانان ہند کے مطالبات پیش کرے لیکن انگلستان میں اس وفد کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔44

خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں اوراس تحریک میں جان اس وقت پڑی جب گاندھی جی نے مسئلہ خلافت سے دلچسپی ظاہر کی، اور نہ صرف ظاہر کی بلکہ اس میں کود پڑے یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہوکر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر نہ لے لیتے، تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ نہیں ہوسکتا تھا۔ گاندھی اس اعلان کے ساتھ اس میں شریک ہوئے تھے کہ ''یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں'' ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ہندو لیڈر پنڈت موتی لال نہرو، سی آر داس، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ اسی موقف کے حامی تھے مسلمانوں میں ہر طبقہ خیال اور ہر نقطۂ نظر کے علماء و لیڈرانِ خلافت، خلافت کو خالص مذہبی معاملہ سمجھتے اور اسی سے استدلال کرتے تھے۔45 وفد

خلافت کی ناکامی کے بعد گاندھی جی نے یہ سوال اٹھایا، کہ آئندہ قدم کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے دلی میں ایک جلسہ بلایا گیا، گاندھی نے اس میں ترک موالات کا پروگرام پیش کیا، اور واضح کیا کہ یہی وہ طریقہ ہے جو حکومت کو معاملات طے کرنے پر مجبور کرے گا۔46

۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے بھی وائسرے سے اپیل کی جس میں لکھا کہ:

''میں ہمیشہ برطانیہ کا وفادار رہا، میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حل کرادیجیے، اب بھی وقت باقی ہے ورنہ مجبوراً میں پہلا شخص ہوں گا جو علم بغاوت بلند کرے گا، میری رائے میں مسلمانوں کے لئے موجود حالات میں صرف تین راستے باقی ہیں: (۱) جہاد بالسیف، (۲) ہجرت، (۳) عدم تعاون، مسلمانوں کو میں نے عدم تعاون کا مشورہ دیا ہے''۔

یکم اگست کا آغاز گاندھی نے اپنے امتیازات خصوصی تمغہ جات اور خطابات کی واپسی سے کیا۔47 بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ ہوا، موٹا کھدر سب کے جسموں پر آ گیا، ہندو مسلم اتحاد کا عجیب دل خوش کن نظارہ تھا۔ تمام ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ علمائے اسلام انگریز کے خلاف ترک موالات کو جہاد قرار دے رہے تھے۔48 انجمن خدام کعبہ جو ۱۹۱۳ء میں مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری نے خانہ کعبہ کی حرمت کی حفاظت کے لئے قائم کی تھی۔ اس کے ارکان خادم کعبہ کہلاتے تھے اس انجمن نے حکومت کو حجاج کرام کو سفر کی سہولیات فراہم کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ تحریک عدم تعاون میں انجمن خدام کعبہ نے بھی برملا حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔49

یہ وہ دور تھا جب سید مودودی کی عملی زندگی کا آغاز ہوا، بدلتی ہوئی عالمی صورتحال کے ہندوستان پر جو اثرات مرتب ہور ہے تھے ان میں سید مودودی نے اپنی بساط کے مطابق علمی جہاد کا علم بلند کیا یا یوں کہیے جہاد بالقلم کا آغاز کیا۔ ان کے مضامین تاج جبل پور، الجمعیۃ (ان دونوں پر چوں کے وہ مدیر رہے) کے

علاوہ معارف، نگار، مخزن اور دوسرے علمی وادبی رسائل میں شائع ہوئے۔50 تحریک خلافت کے دور شباب میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابو الکلام آزاد جیسے نابغہ روزگار ادیب و مقرر میدان صحافت کے سنگھاسن پر جلوہ افروز تھے۔ ان کے درمیان سید مودودی نے اپنے زور قلم سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ اس دور کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات خود ان کے الفاظ میں یہ تھے کہ:

> ''میں اس وقت (۲۰۔۱۹۱۹ء) سولہ سترہ برس کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ فطری طور پر میرے دل میں اپنی قوم کے لیڈروں پر اعتماد تھا اور ہونا ہی چاہیے تھا، مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے احساسات بھی وہی تھے جو ساری قوم میں پائے جاتے تھے۔ اس بنا پر میں بھی اس تحریک (خلافت وعدم تعاون) کے ایک ادنی کارکن کی حیثیت سے اس میں شریک ہوگیا''۔51

اس کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی نے تحریک خلافت کے لئے دامے درمے سخنے ہر ممکن خدمات انجام دیں۔ ترکی سے متعلق انگریزی کی دو کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔52 ترکی مہاجرین کی مدد کے لئے معقول چندہ دیا، اور جبل پور میں دوران قیام تقاریر کے ذریعے ترکی کی حمایت میں رائے عامہ کو ہموار کیا۔53 تحریک خلافت میں گاندھی کی سرگرم قیادت کے باعث سید مودودی نے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں کانگریس پارٹی کے لیڈروں بالخصوص گاندھی اور مدن موہن مالویہ کے حق میں مضامین تحریر کیے۔54 اس کے علاوہ سید مودودی نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک ایسی خفیہ جماعت میں بھی شمولیت اختیار کی، جو ہندوستان میں سیاسی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی اور عبدالباری فرنگی محلی جیسے افراد بھی اس جماعت کے رکن تھے۔ لیکن سید مودودی کا اس جماعت میں حصہ زیادہ تر ذہنی رہا، اس جماعت کے ممبروں کی بے عملی کی وجہ سے مولانا مودودی اور ان کے بھائی بہت جلد اس سے علیحدہ ہوگئے۔55

عملی سیاست کا دوسرا تجربہ مولانا مودودی کو اس وقت ہوا جب رانچی جیل سے رہا ہونے کے بعد

۱۹۲۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہجرت کی تحریک شروع کی۔ مولانا آزاد کی اس تجویز پر حسب معمول مسلمان آنکھیں بند کر کے ہجرت کی طرف دوڑ پڑے، دہلی میں ہجرت کمیٹی قائم کر دی گئی اور ایک باقاعدہ دفتر بنایا گیا۔ مولانا مودودی اور ان کے بھائی ابوالخیر مودودی نے بھی ہجرت کا ارادہ کرلیا، ہجرت کمیٹی کے سیکریٹری ان کے ایک شناسا تجمل حسین تھے۔ انھوں نے دونوں بھائیوں کو ہجرت کرنے پر آمادہ کرلیا لیکن جب مفصل گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہجرت کمیٹی کے سامنے کوئی باقاعدہ منصوبہ یا اسکیم نہیں ہے، اور نہ ہی حکومت افغانستان سے اس سلسلے میں بات کی گئی ہے۔ مولوی کفایت اللہ صاحب اور مولانا نصیر احمد سعید اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ مودودی صاحب نے ان دونوں حضرات سے ملاقات کی اور منصوبہ بندی کے فقدان کا تذکرہ کیا، انھوں نے اس خامی کو تسلیم کرلیا اور مودودی صاحب سے درخواست کی کہ اس سلسلہ میں وہ اسکیم تیار کریں۔ سید مودودی نے تجویز دی کہ سب سے پہلے تو حکومت افغانستان سے گفتگو کرنی ضروری ہے، کہ آیا ہندوستان کے مسلمانوں کو بسانے کے لئے آمادہ ہے یا نہیں، نیز یہ کہ اس آبادکاری کا طریقہ کیا ہوگا۔ افغان سفیر سے گفتگو کی گئی تو معلوم ہوا کہ حکومت افغانستان خود پریشان ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا بوجھ برداشت کرنا اس کے مقدور سے باہر ہے۔ چنانچہ اس طرح ہجرت کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ ہجرت کی تحریک تو ختم ہوگئی لیکن اس سلسلے میں سید مودودی نے جمعیت العلماء نے ہند کے ارکان سے ملاقاتیں کی تھیں وہ بے اثر نہ گئیں اور کچھ عرصہ بعد جمعیت کی جانب سے روزنامہ جاری کرنے کی جو تجویز ہوئی، اس کی ادارت کے لئے مولانا مودودی کا نام پیش کیا گیا۔56 اور اکیس سال کی عمر میں مولانا الجمیۃ سے وابستہ ہوگئے اور بحیثیت مدیر اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔57

جمعیت علمائے ہند نے ابھی تک کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستانی قومیت کو جائز اور حلال قرار نہیں دیا تھا، اور جمعیت کانگریس کے نظریات وعملیات کی ہمنوا نہیں تھی، بلکہ اس آزاد پالیسی پر چل رہی تھی جو مولانا محمد علی جوہر نے اس زمانے میں ملکی وملی مسائل کے بارے میں اختیار کی تھی، کہ مسلمانوں کو آزادی ہند کی خاطر بے جگری سے لڑنا چاہیے۔ لیکن اس آزادی کے لئے مسلمان اپنے عقائد، تمدن اور انفرادیت

سے دستبردار نہیں ہوں گے۔58 ان دنوں سید مودودی نے ''مسلمانوں کی راہ عمل'' کے نام سے ''الجمعیۃ'' کا ایک اداریہ لکھا جس کا درج ذیل اقتباس اس آزادانہ پالیسی کی تصدیق کرتا ہے۔ انھوں نے لکھا:

یہ مہلک غلطی ہوگی، اگر ہم آزادی کے نام پر اپنی انفرادیت کو قربان کردیں۔ خود جمعیت العلماء کا وجود ہماری انفرادیت کا کھلا نشان ہے۔ اور یہ بات اسی نوبت پر صاف اور واضح ہونی چاہیے کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ اور اپنی اسی حیثیت کے استقرار کے ساتھ ہم آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں گے''۔59

۱۹۲۴ء میں ترکی حکومت نے خلافت کو ایک ادارے کی حیثیت سے منسوخ کردیا اس سے ہندوستان کے حامیانِ خلافت پر، جو ترکی اور خلافت کی طرف سے مہم چلاتے رہے تھے اور جنھوں نے معتد بہ قربانیاں دی تھیں ایک بڑی ضرب پڑی۔ لوگوں کا جوش بتدریج ختم ہوگیا، اگرچہ تحریک خلافت نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی، تاہم وہ مسلم عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ایک گراں قدر ذریعہ ثابت ہوئی، اس نے ایک وسیع الاساس قیادت پیدا کی، اور مسلمانوں کو ایک عوامی تحریک منظم کرنے کی تکنیکیں سکھائیں۔60 خلافت کا خاتمہ ایک عظیم دھچکہ تھا جو مسلمانوں کو لگا، اس واقعہ نے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑادی، اس موقع پر گاندھی جی نے جو مضمون لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا''۔61

تحریک خلافت میں ناکامی کے بعد جناب مودودی کی زندگی میں بڑا موڑ آیا۔ وہ قومیت سے بیزار ہوگئے، کیونکہ ان کے خیال میں اسی قومیت کے جذبے نے ترکوں اور مصریوں کو گمراہ کرکے مسلم اتحاد کو پارہ

پارہ کیا اور انہیں خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ اس بناء پر وہ ہندوستانی قومیت سے بھی متنفر ہو گئے، ان کا کہنا تھا کہ کانگریس قوم پرستی کی آڑ میں صرف ہندو مفادات کی نگراں بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ مودودی نے کھل کر قوم پرستی کی تحریکوں اور اس کے مسلم اتحادیوں کی مخالفت کرنا شروع کردی۔62

سید مودودی نے جنگ عظیم اور اس کے اسباب و نتائج اور عربوں اور ترکوں کے نئے عزائم پر غور کرنے کے بعد لکھا:

''یہ تاریخ جب میرے سامنے آئی تو میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی،
کہ جس خلافت کی خاطر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنا سب کچھ داؤ
پر لگا دیا ہے، اس کی سرے سے کوئی جڑ ہی نہیں ہے''۔63

خلافت کے خاتمہ سے خلافت کمیٹی کا جواز بھی ختم ہو گیا چنانچہ اس کی سرگرمیاں بھی سرد ہو گئیں۔ اس کے نتیجے میں جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہو گیا تھا اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ پہلی مشکل ایسی جانب سے آئی جس کی توقع بھی نہیں تھی۔ وہ موپلا بغاوت تھی جس میں وہ (موپلا) ہندوؤں کے خلاف جرائم کے مرتکب ہوئے تھے64 دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب چوری چورا میں ایک مشتعل ہجوم نے پولیس پر حملہ بول دیا، پولیس والے حلقہ انسپکٹر و سب انسپکٹر وغیرہ سب بھاگ کر تھانے میں چھپ رہے مجمع نے تھانہ میں آگ لگادی جس میں (۱۷) آدمی جل گئے اور اکثر کو مار ڈالا گیا کوئی نفس باقی نہ بچا۔ جیسے ہی گاندھی جی کو اس ہولناک سانحے کی اطلاع ملی انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ کر کے یہ طے کر دیا کہ تمام سول نافرمانی ہندوستان میں بند کردی جائے کیونکہ ابھی تک ملک نے اہنسا کا عقیدہ قبول نہیں کیا ہے۔65

تحریکِ پاکستان کے سرگرم رُکن چودھری خلیق الزماں بیان کرتے ہیں پنڈت موتی لال جی نے مجھے جگا کر ان حالات کے متعلق اخبار کی خبریں سنائیں اور نہایت غصہ سے کہا کہ ''بس اب تحریک ختم ہوگئی''۔ اتنے وسیع ملک میں دو چار ایسے واقعات سے متاثر ہو کر ساری مقاومت کو ختم کر دینا دانائی اور فراست سے بعید تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس وقت ان کے ساتھ کھڑے تھے گو انہوں نے زبان سے

کچھ نہ کہا مگر زبان حال سے وہ پنڈت جی کی پوری تائید کر رہے تھے"۔66

کانگریسی لیڈروں کے اس فیصلے سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس کی نشاندہی کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"کانگریس کی مجلس عاملہ کی تجاویز میں جو نقائص ہیں ان سے ہم ارباب حل وعقد کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ان پر غور کریں اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ کوئی شک نہیں کہ ایک جرنیل کو جب وہ غنیم کے ملک میں بڑھا چڑھا رہا ہو اپنی کسی کمزوری سے آگاہ ہونے پر پسپا ہونا چاہیے، مگر فتح کی آرزو مند اور جذبات سے لبریز فوج کو دفعتہً پسپائی کا حکم دینا درحقیقت شکستوں کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ ہماری فوج عوام سے مرکب ہے اور ظاہر ہے کہ عوام ان ذمہ داریوں کو نہیں سمجھ سکتے جو ان کے رہنما پر عائد ہوتی ہیں اور نہ ان نزاکتوں کو محسوس کر سکتے ہیں جن سے ایک تحریک چلانے والے کو واسطہ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں خواہ پسپائی کتنی ہی ضروری ہو لیکن اس نفسیاتی اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اس سے فوج پر پڑے گا۔67

عام لوگوں پر بلکہ چند خاص لوگوں کو چھوڑ کر تمام ملک پر اس پسپائی کا یہ اثر پڑا ہے کہ ہر شخص مایوس ہے۔ نہایت تعلیم یافتہ اور سمجھ دار حضرات بھی اس کو شکست سے تعبیر کر رہے ہیں۔ کام کرنے والوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں، اور سرگرم قومی خادموں کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ مایوسی اور عام ناراضی ایسی چیز نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا

جائے۔ ہم کو اس کا لحاظ کرنا پڑے گا ورنہ یقیناً ہمارا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور ہم خواہ کتنے ہی ہوشمندانہ فیصلے کریں مگر ان کی تعمیل کرنے والے ہاتھ ہم سے کٹ جائیں گے پس اس طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں۔68

اس عام بددلی کے نتائج نہایت خطرناک ہیں سب سے پہلا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ جو شیلے کارکن جواب تک ترک موالات کی پرامن تحریک میں صرف اس وجہ سے شریک تھے کہ ان کو اس کے ذریعے جلد سے جلد اپنا مقصود حاصل ہونے اور اپنی مساعی کا نتیجہ برآمد ہو جانے کی امیدیں تھیں لیکن اب کانگریس کی رفتار کو سست دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اس سے تو پچاس برس میں بھی منزل مقصود تک پہنچنا مشکل ہے اس سے علیحدہ ہو جائیں گے اس وقت وہ خالی نہ بیٹھیں گے کچھ نہ کچھ کریں گے اور جو کچھ کریں گے۔ اس کے متعلق یہ امید کرنا کہ وہ پرامن ہوگا، سخت حماقت ہے۔ نوجوانوں کا ایک بڑا گروہ ادھر سے مایوس ہو کر تشدد پر اتر آئے گا، اور ایک شدید بدامنی برپا کر دے گا یعنی جو کام اس وقت امن قائم رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے وہی اس کو توڑنے اور اب سے زیادہ توڑنے کا باعث ہوگا''۔69

تحریک ترک موالات ختم ہوئی تو بعض ہندو بااثر لیڈروں مثلاً سوامی شردھانند نے شدھی اور لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی70 جو خالص ہندوؤں کی جماعتیں تھیں یہ تحریک ان لیڈروں نے شروع کی تھی جو کانگریسی تھے۔ انھوں نے کھلم کھلا بلا کسی لاگ لپٹ کے مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اظہار کیا۔ یہ باتیں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کافی تھیں اور انہیں معلوم ہوگیا کہ

ہندوؤں کے عزائم مسلمانوں کے متعلق کیا ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔71

۱۹۲۵ء میں کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ یہ فساد اس وجہ سے ہوا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے آخری پیغمبر کی شان میں گستاخانہ نظم چھاپ کر تقسیم کی تھی۔ اس فساد کے سلسلے میں ہندوؤں کو کوہاٹ بدر ہونا پڑا۔72 کوہاٹ کا فساد ان معنی میں سخت تھا کہ اس پر مولانا شوکت علی اور مسٹر گاندھی کے درمیان کشیدگی واقع ہوگئی، اور اسی وقت سے ہندو اخبارات نے علی برادران کے خلاف دریدہ دہنی اختیار کی۔73 مولانا محمد علی نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پنجاب پراونشل کانفرنس کے جلسے میں فرمایا:

''یہ وقت نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو تنبیہ کرے۔ اس لیے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے انہیں میں اسی پر ملامت کرتا ہوں''۔74

لیکن مولانا محمد علی جوہر کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، فسادات کے نتیجے میں خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ جدوجہد سے جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا تھا بے اثر ہوگیا، گاندھی جی ملک کی ناسازگار فضا سے بہت پریشان تھے۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''میں نے اپنی ناقابلیت کا اعتراف کرلیا ہے۔ میں نے تسلیم کرلیا ہے کہ اس مرض کا علاج تجویز کرنے والے طبیب کی حیثیت سے میں کم بضاعت ثابت ہو چکا ہوں''۔75

چنانچہ ملک میں امن وامان کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے خود اپنی غلطی کے کفارے میں اکیس دن کا برت رکھا۔76 اس خبر سے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی، اور مسلمانوں میں بھی جن میں ابھی تک گاندھی جی سے عام سیاسی عقیدت باقی تھی بہت ہیجان ہوا، دہلی میں ایک اتحاد کانفرنس طلب کی گئی روز مرہ کے فسادات کے انسداد کے لئے تجاویز جو مسجد کے سامنے باجا بجانا اور گانے کی قربانی اور مذہبی آزادی

سے متعلق تھیں منظور ہوئیں، اور ان کے ذریعے گاندھی جی کا برت ختم کرایا گیا۔77 مگر اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا، اور صورتحال اس وقت مزید کشیدہ ہوگئی جب دسمبر ۱۹۲۶ء میں ایک مسلمان عبدالرشید کے ہاتھوں سوامی شردھانند کا قتل ہوا۔ سوامی جی کیونکہ شدھی تحریک کے بانی اور ایک بڑے سیاسی لیڈر تھے لہٰذا ان کے قتل پر ہندو مہا سبھائیوں، کانگریسیوں اور تمام ہندوؤں نے آسمان سر پر اٹھالیا، ہندو اخبارات اور رسائل نے ملک گیر طوفان کھڑا کردیا۔78

سید مودودی اس وقت الجمعیۃ سے وابستہ تھے۔ جنوری ۱۹۲۷ء کے اداریے میں آپ نے لکھا:

> ''صرف ہم ہی نہیں بلکہ تمام دہلی والوں نے سنا کہ، جس دن سہ پہر کو برن لیٹن روڈ کے ایک بالا خانے پر کسی شخص نے سوامی شردھانند جی کو پستول سے قتل کردیا، اسی روز کچھ دیر بعد اس مقام کے قریب ہندوؤں نے مسلمان بے گناہ راستہ چلنے والوں پر بے رحمانہ حملہ کردیا۔ اس حملے میں پانچ مسلمان زخمی ہوئے اور ہسپتال پہنچائے گئے۔ ان میں سے ایک ضعیف العمر مظلوم شخص شدید زخموں کو برداشت نہ کرسکا اور ۲۴ یا ۲۵ دسمبر کو ہسپتال میں شہید ہوگیا، لیکن اس کے بعد آج ۷ جنوری تک اس مظلوم شہید کے قاتلوں اور واقعہ قتل کی تفتیش کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا کہ پولیس اور مقامی حکام نے کیا کارروائی کی۔ مسلمانوں نے سوامی شردھانند کے دردناک قتل کے متعلق افسوس اور ناراضی ظاہر کرنے میں جس جذبہ وطن دوستی کا ثبوت دیا ہے، وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ لیکن اخباروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں اس مسلمان کے قتل پر جو بظاہر انتقامی جوش کے لئے جوابی، مگر مظلوم شہید کے لئے کسی ہندو کی طرف

> سے اظہار افسوس اور مارنے والوں کے خلاف اظہار ناراضی کا ایک لفظ بھی نظر نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہ اس کو انسان نہیں سمجھا گیا یا سوامی جی کے قتل کی پاداش میں علی العموم مسلمانوں کو زخمی کرنا یا مار ڈالنا جائز قرار دے دیا گیا یا اور کوئی صورت پیش آئی''۔79

ہندو رہنماؤں نے مسلمان کے قتل پر تو سکوت اختیار کیے رکھا لیکن سوامی جی کے قتل پر اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب قرار دیا، اور نظریہ جہاد کو خصوصاً اور اسلام کو عموماً ہدف تنقید بنایا جانے لگا۔ اس صورتحال میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنے خطبۂ جمعہ میں پرزور التجا کی کہ کاش کوئی بندہ خدا ہندوؤں کے ان الزامات کے جواب میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرے۔80 اس موقع پر سید مودودی نے مولانا جوہر کی اپیل پر لبیک کہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اسلامی قانون جنگ کے عنوان سے الجمعیۃ میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ ان مضامین میں آپ نے جہاد کی حقیقت، اس کی ضرورت، اور مغرب کے قانون جنگ وصلح پر اس کی برتری کو واضح کیا۔81 ان مضامین نے اہل علم ودانش کو بھی متاثر کیا۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

> ''بچپن سے مولانا ابوالاعلیٰ کے افکار دماغی، زور قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل میں بیٹھا ہوا تھا یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں جمیعۃ العلمائے ہند کے ترجمان الجمیعۃ کی ادارت ہاتھ میں لی، اور اسے ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صف اول میں پہنچادیا۔ سوامی شردھانند کے حادثۂ قتل کے بعد جس نے اسلام اور تشدد کا مسلک کے موضوع پر اس قدر عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہوگئے''۔82

یہ مضامین ''الجہاد فی الاسلام'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کتاب نے سید مودودی کو احیائے اسلام کا بہت بڑا داعی اور محقق ثابت کردکھایا اور وہ مسلم برادری کے ذہین ترین لیڈر کے

طور پر ابھرے اس کے بعد مودودی نے اپنی زندگی مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی نجات کے کاموں کے لئے وقف کردی۔83 اس کتاب کے ذریعے ہی انہوں نے اغیار کی بڑی قلم کاریوں سے بنائی ہوئی اس تصویر کا طلسم بھی توڑ دیا کہ جہاد کی وجہ سے اسلام کی تاریخ سے بوئے خون آتی ہے، یہ اس کی دہشت گردی کا مظہر ہے۔84 اپنی اس تصنیف کے لئے جہاد کے موضوع پر تحقیق و تلاش کے دوران سید مودودی کو اسلام کے پورے نظام فکر و عمل اور اس کی حقیقی دعوت کو سمجھنے کا موقع ملا اور اسی مطالعہ نے ایک علمی تحریک کی راہ ہموار کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے برسوں اسلام کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کیا، اس کے اعتقادی اساس اس کے نظریہ حیات، اس کے اصول اخلاق اس کے نظام تمدن اس کے قوانین معاشرت و معیشت اس کے آئین سیاست و طرز حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو بھی کھنگال کر دیکھا، اور اسلام سے ان کا تقابل کیا اس تمام مطالعہ و تحقیق نے مجھے اس امر پر پوری طرح مطمئن کردیا، کہ انسان کے لئے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر مسلک ناقص ہے''۔85

مطالعہ قرآن سے فہم قرآن تک کا سفر مولانا نے اپنی ذات تک محدود نہ رکھا، بلکہ اب ان کا مقصد حیات قرآن کے افکار و نظریات کو عام مسلمان تک پہنچانا تھا۔ ان کا کہنا تھا:

''ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا اور اپنی قوت فکر و عمل کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد کرنا ہے، دوسری طرف علم کی ان ترقیات اور احوال کے ان تغیرات کا پورا پورا

جائزہ لینا ہے جو گزشتہ آٹھ سو برسوں کی مدت میں ہوئی ہیں اور تیسری
طرف صحیح اسلامی طریق پر افکار و معلومات کو مرتب اور قوانین حیات کو
مدون کرنا ہے تاکہ اسلام پھر سے ایک قوت متحرکہ بن جائے اور دنیا
میں مقتدی بننے کے بجائے مقتدا اور امام بن کر رہے''۔86

اپنے افکار و نظریات کی تکمیل کی خاطر آپ نے نہ صرف الجمیعۃ سے علیحدگی اختیار کر لی بلکہ دہلی کو بھی وقتی طور پر خیر آباد کہہ دیا، اور حیدر آباد (دکن) منتقل ہو گئے اور پورے انہماک سے کام شروع کیا۔رات دن کے مطالعہ اور غور وفکر سے اپنے آپ کو علمی جہاد کے لئے تیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کے مایوس کن رویے کے باعث مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل جیسی شخصیات اس سے علیحدہ ہو گئی تھیں۔87 اس صورتحال میں مسلمانوں کی جو حکمت عملی قرار پائی اس کی تشکیل مجلس خلافت نے نہیں کی بلکہ اس کی سعادت مسلم لیگ کو منفرداً یا دوسری جماعتوں کے ساتھ تعاون سے حاصل ہوئی۔88

اب برصغیر کی سیاست میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تجاویز دہلی پیش کیں، علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے ان کے علیحدہ اور جداگانہ وطن کی نشاندہی کر کے انہیں ایک نصب العین سے ہمکنار کیا دوسری جانب ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے تجاویز اور سفارشات مرتب کرنے کے لئے لندن میں گول میز کانفرنسوں کا آغاز ہوا۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی اور ان کے چند ساتھیوں نے جو کیمبرج یونیورسٹی کے طالبعلم تھے ایک پمفلٹ میں لفظ پاکستان پہلی مرتبہ استعمال کیا۔89 یہی وہ زمانہ تھا جب سید مودودی پوری تیاری کے ساتھ میدان عمل میں اترے اور جہاد بالقلم کا آغاز ایک علمی رسالے ترجمان القرآن سے کیا۔90 جس کے ذریعے سے آپ قرآن کی دعوت کو عام کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۳۲ء سے آپ نے مسلمان قوم کو راہ راست کی جانب دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ جب ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے تحت نئے انتخابات ہوئے، اور کانگریس نے ہندوستان کے سات

بڑے صوبوں میں اکثریت حاصل کر کے حکومتیں بنائیں، اور جو کچھ صوبائی خود مختاری نئے قانون کے تحت ملی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز بلکہ انہیں دبانا شروع کر دیا، تو مسلمانوں کو ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت کا احساس شدید تر ہوگیا۔

ان احساسات کو فروغ دینے اور خالص اسلام کی بنیاد پر ایک خود مختار مسلمان مملکت کو وجود میں لانے کی جدو جہد کرنے کے لئے ذہنوں کو تیار کرنے میں ابوالاعلیٰ مودودی کے ان مضامین نے بھی خاصہ حصہ لیا جو ان کے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہورہے تھے۔ یہ مضامین ایک طرف اسلام کے نظام حیات کی تفصیلات کو دلائل کے ساتھ پیش کر کے مسلمانوں کے دلوں میں اس کے لیے طلب اور حصول کا جذبہ پیدا کررہے تھے اور دوسری طرف ہندوؤں اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ، مغربی تہذیب کے برے اثرات اور کانگریس کی مسلم کش پالیسی پر تنقید کر کے اس کے دعوؤں کی قلعی بھی کھول رہے تھے یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں کے مسلمان اہل قلم اور صحافی یہ یقین رکھنے لگے تھے کہ مسلمانان ہند کو منفرد ملت ہونے کا احساس سب سے زیادہ ان مضامین نے دلایا جو ترجمان القرآن میں شائع ہورہے تھے۔91 رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

> ''سید مودودی کی ادارت میں نکلنے والے ترجمان القرآن کے مقالات اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے ارباب نظر اور اہل علم کے لئے باعث فخر و رشک ہوگئے تھے''۔92

ان مضامین نے ہندوستان جس عظیم شخصیت کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ علامہ اقبال تھے۔ مولانا کی تحریروں سے متعلق علامہ کی رائے یہ تھی ''یہ مولوی رسول اللہ کے قلم سے ان کے دین کو پیش کر رہا ہے۔93 علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کریں اور کچھ ایسے افراد کو جو جدید علوم سے بہر ور ہوں، چند ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں، جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہوتا کہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لئے کوشاں ہوسکیں۔94 چنانچہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اقبال

نے جس شخصیت کو پنجاب آنے کی دعوت دی وہ سید مودودی کی تھی۔95 ۱۹۳۷ء میں مولانا لاہور تشریف لئے گئے اور اپنے تین روزہ قیام کے دوران علامہ سے روز ملاقاتیں کیں۔ جن میں یہ غور کیا گیا کہ مسلمانوں کے لئے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ بقول سید مودودی:

> ''اس معاملے میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں تھے۔اس وقت دو اہم نکات پیش نظر تھے۔ ایک یہ کہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پُر کیا جائے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی عہد حاضر میں لوگوں کو ناکافی اور ناقابل عمل نظر آرہا ہے دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کی فکری وعملی رہنمائی کے قابل ہوں''۔

چنانچہ یہ طے پا گیا کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارت میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق ''دارالاسلام'' تجویز کیا تھا ایک ادارہ قائم کروں، جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے۔96 ۱۹۳۸ء میں مولانا دہلی سے پٹھان کوٹ منتقل ہوگئے۔ اپنے مقصد سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا:

> ''بہرحال میں تصفیہ کر چکا ہوں کہ خواہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کروں گا۔ اور آخر وقت تک جاری رکھوں گا۔قطع نظر اس کے کہ کامیابی ہو یا نہ ہو۔ مسلمانوں کی اس وقت جو حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے اس کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ آئندہ دس بیس سال اس ملک کی قسمت کے لئے فیصلہ کن ہیں، اگر اس وقت ہم مدافعت کے لئے کھڑے نہ ہوئے تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا۔

> آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھ پر سکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینے میں لایا ہوں۔ اور ہر لحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔97

دارالاسلام میں مودودی صاحب نے ایک ''ماڈل اسلامک کمیونٹی'' قائم کی جوان کے خیال اور توقع کے مطابق ہندوستان بھر میں اسلامی اصلاحات کے کام کی رہنمائی کرسکتی تھی۔ سید مودودی کی سرگرمیوں کا زیادہ تر تعلق سیاست سے تھا، تاہم دارالاسلام کے تعلیمی اور تربیتی مقاصد پر بھی توجہ دیتے رہے۔98 یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کانگریس کی وزارتیں تھیں، ہر طرف ہندوؤں کا تسلط نظر آتا تھا یہ چیز بڑی پریشان کن تھی کیونکہ مسلمانوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں، اور انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> ''جب میں ۱۹۳۷ء میں دہلی سے واپس حیدر آباد جارہا تھا تو میرے ڈبے میں ایک کانگریسی لیڈر ڈاکٹر کھرے بھی سفر کررہے تھے۔ ان سے کچھ مسلمان باتیں کرنے لگے ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ جیسے اب کانگریسی لیڈر ہی اس ملک کے حکمران ہیں اور مسلمان ان کی رعیت۔ گویا یہ مانگنے والے اور وہ دینے والے، ان لوگوں کی ساری گفتگو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے سامنے پورا نقشہ آگیا کہ اب مستقبل میں مسلمانوں کا کیا حشر ہونے والا ہے''۔99

یہ بدلتی ہوئی صورتحال انتہائی سنگینی کی طرف بڑھ رہی تھی، انگریز اقتدار میں ہندو، برصغیر کی سب سے بڑی طاقت کی صورت میں ابھر رہے تھے واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ جب انگریز جو اقلیت میں تھے اور اجنبی قوم کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے، انھوں نے اپنی تہذیب وثقافت، علمی وتمدنی ترقیوں سے اہل ہند کو متاثر کیا اور ان کی زندگی میں تہذیبی انقلاب برپا کردیا، تو ہندو تو اسی سرزمین کے باسی تھے، اکثریت

میں تھے ان کی تہذیبی وتمدنی جڑیں برصغیر میں انتہائی گہری تھیں۔ لہٰذا وہ مقتدر ہونے کی صورت میں ہندو تہذیب کا احیاء کریں گے۔ انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں وہ ہندوستان کی غالب طاقت بن گئے تھے اور مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے، اب ان کی سیاست ایک نیا رنگ اور نیا رخ استعمال کر رہی تھی۔ اپنی مکمل بالادستی قائم کرنے کے لئے وہ انگریز تسلط سے نجات کے خواہاں تھے۔ یہ نجات مسلمانوں کے تعاون کے بغیر سہل نہ تھی۔ لہٰذا اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے انہوں نے اشتراکیت، متحدہ قومیت اور وطن پرستی کے نظریات متعارف کرائے۔ مسلمانوں کا ایک با اثر طبقہ جو کانگریس اور کانگریسی نظریات کا حامل تھا مسلمانوں کو کانگریس کی طرف کھینچ رہا تھا۔100

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد کانگریسی رہنماؤں کا رویہ بدل گیا۔101 وہ اس بات سے کم تر کسی بات کے لئے تیار نہ تھے کہ مسلم لیگ کے تمام ممبران اسمبلی کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے تابع ہو جائیں، اور اسمبلیوں میں اپنا الگ وجود ختم کر دیں، چنانچہ کانگریس نے طے کیا کہ مسلمان رہنماؤں کو نظر انداز کر کے براہِ راست مسلمان عوام کو اپنے ساتھ ملایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے رابطہ مہم Mass Contect کے نام سے الگ شعبہ قائم کر کے کام شروع کر دیا گیا۔102 پنڈت نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی۔

> ''ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ ورانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت وشنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں، ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور کرتے ہیں گویا ۲ ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جارہی ہے، اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا

اسی میں ہے، کہ اپنی بے کاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کے لئے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے، تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ جو سوال ایک زمانے سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔103

یہ وہ وقت تھا کہ محمد علی جوہر اور علامہ اقبال وفات پا چکے تھے۔ محمد علی جناح ہندوستان کی صورتحال سے دلبرداشتہ تھے، ایسے وقت میں ابوالاعلیٰ مودودی نے جواب تک صرف بنیادی دعوت اور مغربی افکار پر تنقید اور اسلامی افکار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا اور ترجمان القرآن میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا اور واضح کیا کہ:

''یہ تحریک قطعی طور پر شدھی کی تحریک ہے اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور اسلامی جماعت سے خارج ہوگیا، تو وہ خواہ ہندومت میں جائے یا بے مت ہو جائے دونوں صورتیں یکساں ہیں، البتہ دونوں شدھیوں میں فرق یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا، جبکہ دوسری دام ہمرنگ زمیں کا حکم رکھتی ہے، اور اس کی فوج میں فقیہ، محدث اور مفسر تک سرگرم عمل نظر آ رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیش رو تحریک سے ہزار درجہ خطرناک ہے۔104 شردھانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جارہی ہے۔105

سید مودودی کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے شریف الدین پیرزادہ لکھتے ہیں ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں مولانا مودودی نے ترجمان القرآن میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعے کانگریس کو بے نقاب کیا اور مسلمانوں کو خبردار۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ بیان کی کانگریس کی لادینیت کا تمسخر اڑایا اور ہندوستان کے لیے جمہوری طرز حکومت کی غیر موزونیت ثابت کی اس لیے کہ ہندوستانی جمہوریت میں چار ہندو ووٹوں کے مقابلے میں صرف ایک مسلم ووٹ ہوگا۔106

سید مودودی کے لئے دوسرا معرکہ وہ تعلیمی منصوبہ تھا جو کانگریس نے وردھا اور ودیا مندر کے نام سے متعارف کرایا تھا، جس کا مقصد فکر گاندھی کی ترویج واشاعت تھا۔107 ان تازہ ہندوانہ اسکیموں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے تمدن، تہذیب اور ثقافت کو تباہ کردیا جائے۔ مسلمانوں کی زبان، روایات اور تاریخ کو بھی مسخ کردیا جائے، اور پھر جن ذرائع سے ممکن ہو سکے ان لوگوں میں ہندوانہ رسوم ورواج جاری کردیے جائیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو اسکولوں میں مجبور کردیا جائے کہ وہ ''بندے ماترم'' کا ترانہ پڑھا کریں۔ بندے ماترم کا مقصد ومطلب یہ تھا کہ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کو تمام خداؤں پر برتری حاصل ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کو بھی ہندوستان کی تمام اقوام پر فوقیت حاصل ہے۔108 مودودی صاحب اس صورتحال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کانگریس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے، اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ کو خود نظر آجائے گا کہ نقشے میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجیے یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکیم کے مطابق تمام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائے گی109 وہ بنیادی تصورات جن پر

یہ اسکیم تیار کی گئی ہے حسب ذیل ہیں ''مہاتما گاندھی نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایسی راہیں نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہوا اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے''۔ اسکیم کا نام ہی ''بنیادی قومی تعلیم'' کی اسکیم ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اسی لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کر ہندوستانی کے سوا ان کی اور قومیت بھی ہے''۔110

گاندھی جی نے صاف طور پر واضح کیا کہ ہم نے وردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے۔ اس لیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے اختلاف پیدا کرنے کا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جاتی ہیں''۔111 اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کر کے گاندھی جی کے مذہب کی تعلیم داخل کر دی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پا کر نکلے گی اس کے اخلاقی تصورات دین گاندھی پر مبنی ہوں گے۔112

اسی طرح سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو ودیا مندر اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اسکیم خالصۃً دیہی علاقوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کیے جائیں گے ان کا نام ''ودیا مندر'' تجویز کیا گیا ہے۔113 اس اسکیم کی قلعی کھولتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے، ایک عام ہندوستانی مندر کے معنی ہندوؤں کی عبادت گاہ ہی سمجھتا ہے۔ مگر سی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابلِ اعتراض نہیں ہے، گویا

اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابل اعتراض ہونی چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے، خود مسلمانوں کے کرنے کا نہیں بلکہ ان حکمرانوں کے کرنا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں، ان کا نام ودیا مندر نہیں بیت العلم رکھ لیں۔ مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جاسکتا ہے جہاں کم از کم چالیس (۴۰) لڑکے پڑھنے والے ہوں، اور جس کے لئے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائیداد وقف کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہوں کہ ان کی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہوسکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کرسکتے وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہوگی''۔114

۱۹۳۹ء میں سید مودودی نے براہِ راست سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور لاہور منتقل ہوگئے جہاں وہ اسلامیہ کالج میں اسلامی علوم پر لیکچر بھی دینے لگے۔ لاہور میں انہیں اپنی سرگرمیوں کے لیے وسیع میدان مل گیا انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے موضوع پر، تقاریر اور مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔115 اس کے ساتھ ہی کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریے کی حقیقت واضح کی، جس کا پرچار کانگریس کے مسلمان علماء کر رہے تھے۔ ان میں ابو الکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابرینِ ملت نمایاں تھے۔ ابو الکلام آزاد نے اپنی قسمت کو مکمل طور پر کانگریس سے وابستہ کر دیا تھا،116 ان کی کوشش تھی کہ علماء کا رخ مسلم حقوق کی حمایت سے موڑ کر کانگریسی موقف کی طرف پھیر دیں۔117 مولانا حسین احمد مدنی بھی ہندوستانی قوم پرستی کے اصول کو پورے جوش کے ساتھ تسلیم کرتے تھے، لہٰذا ان تمام اخباروں نے جو مولانا حسین احمد سے قرب رکھتے تھے بالخصوص الجمیعۃ دہلی اور مدینہ بجنور نے اپنے کالم ان اشتمالیوں،

کانگریس کے تنخواہ دار کارکنوں اور ایسے دیگر لوگوں کی تحریروں کے لیے کھول دیئے جو ملت اسلامیہ کی جداگانہ ہستی اور ان کی ثقافت کو تباہ کرنے والے نظریات پیش کر رہے تھے۔ ان میں ایک نظریہ یہ تھا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ رہے ہیں وہ یک سنگی ''ہندوستانی قوم'' کا جزو ہیں، اور انہیں لازمی مطابقتیں پیدا کر لینی چاہئیں۔118 ان میں سے بعض یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اس اقدام سے ہندوؤں کے لئے قبول اسلام کے دروازے کھل جائیں گے، مولانا حسین احمد نہ صرف ان خیالات کے حامی تھے بلکہ اس کی تلقین مساجد سے بھی شروع کر دی تھی،119 مولانا حسین نے اپنے دلائل کے حق میں ایک رسالہ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے ۱۹۳۹ء کے اوائل میں شائع کیا تھا۔120

مولانا مودودی نے اس رسالے کا ایک مفصل تردیدی جواب شائع کیا تھا۔ درحقیقت مولانا مودودی کا جواب اس قدر مدلل، مستند، شائستہ اور مسکت تھا کہ متحدہ قومیت کے کسی حامی میں اس کا جواب الجواب دینے کی قابلیت نہیں تھی۔ مولانا مودودی نے واضح کیا کہ مولانا حسین احمد کو انگریزوں سے جو نفرت ہے وہ اس کی رو میں بہہ گئے ہیں اور تاریخ وحقائق کو مسخ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب نے قانونی اصطلاحات مثلاً پرسنل لاء (شخصی قانون)، اور بنیادی حقوق کے معنی اور جدید مملکت میں ان کی وسعت اور عمل سے مولانا حسین احمد کی عدم واقفیت کو بالتشریح بیان کیا، مولانا مودودی کی برتر علمیت، موثر دلائل، بے لوث منطق اور سیاست وقانون کے جدید تصورات کا علم ایسا تھا کہ ان کے اعتراضات کا جواب دینا جمعیت سے وابستہ گروہ کے لئے ناممکن ہو گیا۔121 حقیقت یہ ہے کہ مفتی کفایت اللہ نے جو ایک فقیہ تھے اس نسبت سے منطق اور علمی تقاضوں سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔ اپنے رفقاء کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس بحث کو جاری رکھنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ان کی رائے میں مولانا مودودی حق پر تھے۔122

سید مودودی کی متحدہ قومیت کے نظریے خلاف جدوجہد کو واضح کرنے کے لئے محمد سرور اپنی کتاب میں ''جماعت اسلامی۔ دعوت تاریخ'' کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں ''مودودی صاحب نے اپنا دامن ہر قسم کی لادینی تحریکوں سے پاک رکھا، کانگریس کے متحدہ قومیت کے سیلاب کو روکنے کے لئے جس شخص نے

سب سے پہلے قلم اٹھایا وہ ترجمان القرآن کا مدیر تھا۔ ''سیاسی کشمکش'' حصہ اول و دوم لکھ کر بس نے مسلمانان عالم کو متحدہ قومیت اور ماس کونٹیکٹ اور واردھا اسکیموں کے جال میں پھنسنے سے بچایا وہ مودودی کی ذات تھی۔ علامہ اقبال نے پنجاب آنے کے لئے آپ کو اسی غرض سے دعوت دی تھی کہ ہندی قومیت میں جذب ہونے سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ مودودی نے ''مسئلہ قومیت'' لکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کانگریس کے دلائل کا قلعہ مسمار کر دیا اور دو قومیت کے ان عناصر کا خاتمہ کر دیا جن کی اشاعت کانگریس اور اس کی ہمنوا جماعتیں کر رہی تھیں۔123

۱۹۳۹ء کے اواخر میں ہندوستان میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں عالمی سطح پر دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ برطانوی وائسرائے نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے اس وعدے پر تعاون حاصل کرنے کی درخواست کرنی شروع کر دی تھی، کہ جنگ کے بعد ان کے ملک کو آزادی اور خود مختاری دے دی جائے گی۔124 جبکہ 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵' کے تحت قائم شدہ صوبوں کی کانگریسی قیادت نے جنگ میں انگریزوں کی مدد نہ کرنے کی مہم جاری کر دی، اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو فوری طور پر آزاد کر دیا جائے۔ اس مطالبے کا صرف ایک ہی مفہوم تھا کہ برطانیہ، برصغیر کی حکومت کو کانگریس کے حوالے کر دے۔125 اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ان حالات میں کمیٹی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کر لے۔ کمیٹی، کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی جائیں۔126 چنانچہ نومبر ۱۹۳۹ء تک کانگریسی وزارتوں نے استعفے دے دئے کانگریس کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے محمد علی جناح کے ایماء پر ۲۲ دسمبر کو یوم نجات و تشکر منایا۔127

ہندو راج سے نفرت کے جذبے نے مسلمانوں کے دلوں میں مسلم حکومت کی خواہش پیدا کر دی۔ مسلمانوں کی تقسیم پسندی، ہندوؤں کی ناروا داری کا منطقی نتیجہ تھی۔ پاکستان کا تصور عوامی تخیل پر چھا رہا

تھا،128 آخر کار ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں وہ مشہور قرارداد منظور کی گئی جس میں تقسیم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے پاکستان، مسلم عوام کے عقیدے میں داخل ہو گیا۔ ہندوؤں نے جتنی زیادہ قوت سے اس کی مذمت کی مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی احساس ہوتا گیا۔129

چنانچہ ارباب لیگ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شدومد سے کیا جارہا ہے۔ خود اس کا نظام نامہ یا قانون اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیے۔ اس غرض سے یوپی کی صوبائی مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کردی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے۔ یہ مجلس اسلامی نظام سے متعلق سفارشات مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلس اسلامی میں سید مودودی بھی شامل تھے۔130 گاندھی جی نے قرارداد لاہور پر ایک مضمون ''ایک چکرادینے والی صورتحال'' میں لکھا:

> ''میں کس طرح ایک ناممکن بات پر رضامند ہونے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ یا راغب کروں؟ ایک جیتی جاگتی اور زندہ جان کی چیر پھاڑ کا مطالبہ کرنا اس کی جان اور حیات طلب کرنے کے مترادف ہے۔ یہ جنگ کے لئے ایک نقارہ ہے''۔131

جماعت اسلامی کا قیام:۔

۱۹۴۱ء کا سال کئی اعتبار سے برصغیر کے لئے اہم تھا، عالمی سطح پر اس برس کے دوران ہٹلر نے روس پر فوج کشی کر کے جنگ میں ایک بدلا ہوا عسکری توازن رونما کیا، تو دسمبر میں جاپان نے مشرق بعید میں ایک خطرناک صورتحال پیدا کی۔ اور اس کے نتیجے میں ہندوستان میں ایک طرف ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور دوسری طرف انڈین نیشنل آرمی ظاہر ہوئی۔132 تیسری طرف مسلمانوں میں مزید بیداری کی علامت کے طور

پر جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا اس کے بانی سید مودودی تھے اس جماعت کے قیام کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے جناب مودودی لکھتے ہیں:

''تحریک خلافت کی ناکامی بعد کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشار فکر وعمل میں مبتلا رہے اس کو دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا۔ مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم، تجربہ، قوت اور اثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے اور ان کو رفع کرنے کے لئے متحد ہو کر تدابیر اختیار کریں گے، جو ان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اختیار کرنی چاہئیں۔ لیکن دن پر دن گزرتے چلے گئے اور یہ امید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی، اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں اب دین وملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے، کہ مسلمان کو ان کے عوام اور خواص، علماء اور زعماء سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو 'مسلم قوم' ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا جائے کہ تمہارے لیے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک میں ہے، جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر وتدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا''۔133

چنانچہ سید مودودی نے طے کیا کہ اب ترجمان القرآن کے ذریعے کسی بھی کام پر اکتفا نہ لیا جائے، بلکہ آگے بڑھ کر عملی اقدام کیا جائے۔ کسی منظم اور باقاعدہ کوشش کے بغیر اب اس ملک میں اسلام کی حفاظت اور سربلندی ممکن نہیں، اگرچہ سید مودودی خود اس وقت صرف ۳۴ برس کے تھے اور اس طرح کے کسی کام کا تجربہ بھی نہ تھا اس لیے طبیعت میں ایک فطری جھجک تھی۔ سوچتے تھے کہ اس آواز پر کوئی لبیک کہنے والا بھی ملے گا یا نہیں، خود اپنی صلاحیت کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہ تھا، سوچ بچار اور غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ''یہ سب کچھ تجربہ ہی بتائے گا، اگر کوئی اور آدمی آگے بڑھ کر یہ کام کرنے والا نہیں تو مجھے ہی اس کو کرنا چاہیے۔134

سید مودودی نے ترجمان القرآن میں اسلامی تحریک کی تشریح اور اس کے لیے کام کرنے والی ایک جماعت کی ضرورت کو واضح کر دیا تھا اور اس جماعت میں شمولیت کے لیے دعوت عام دے دی تھی، جس پر تقریباً ۷۵ افراد ترجمان القرآن کے دفتر میں جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں سید مودودی نے تحریک اسلامی کے پس منظر کو واضح کرتے ہوئے کہا:

> ''ایک وقت تھا کہ میں خود روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اس پر عمل پیرا تھا۔ جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے، آخر کار کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف متوجہ ہوا اور اسلام کو از سر نو سمجھا اور اس پر ایمان لایا۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے قلب کو اس طرف سے مطمئن کر دیا، تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدائی چند سال الجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے، اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل

میں جاری کرنے کے لئے پیش قدمی شروع کی۔135 خدا نہ کرے کہ ہم اس دین کی خدمت کرنے کے بجائے اس سے بچائے کہ ہم اس دین کے لئے کچھ کرنے کے بجائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کا موجب بن جائیں"۔136

سید مودودی نے اپنی تحریک کو جماعت اسلامی کے نام سے منسوب کیا۔ چھ افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمہ امیر جماعت کا انتخاب تھا۔ کمیٹی کے ارکان نے غور وخوض اور صلاح ومشورے کے بعد ابوالاعلیٰ مودودی کا نام منصب امارت کے لئے پیش کیا جس پر سب کا اتفاق ہوا۔137 سید مودودی جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد دوبارہ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے، اور جماعت کی تنظیم وتوسیع میں تندہی سے مصروف ہوگئے۔ انہیں چونکہ علمی کاموں سے فطری لگاؤ تھا اس لیے یہ کام بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا اور سیاسی کام سے زیادہ اپنے علمی کاموں کے حوالے سے عالمگیر شہرت حاصل کی، لیکن اس سے بھی کہیں عظیم تر ان کا یہ کارنامہ ہے کہ، ان کی فکر سے متاثر ہوکر لاکھوں نوجوانوں کی سیرت وکردار میں انقلاب آ گیا اور عصر حاضر کے مادی دور میں ان کے اندر تقویٰ اور جہاد کے اوصاف ابھرے۔138

جماعت اسلامی نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اپنی حقیقت اور اہمیت کو ہمعصر رہنماؤں سے تسلیم کرالیا تھا۔ اس کی حقیقی بنیادی وجہ سید مودودی کی بھاری بھرکم علمی وسیاسی شخصیت تھی۔ ۱۹۴۱ء میں سید مودودی کے نمائندے کی حیثیت سے جناب قمرالدین صاحب نے قائداعظم سے ملاقات کی جو پینتالیس (۴۵) منٹ جاری رہی۔ قمرالدین صاحب کے بیان کے مطابق:

"قائداعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے۔ اور پھر کہا، مولانا (مودودی) کی خدمات کو وہ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول ان کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں

ہے۔ جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اس فوری حل طلب مسئلے کی طرف متوجہ ہے، جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکے گا۔139

لیکن سید مودودی کردار کی تطہیر پر زیادہ زور دیتے تھے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی دین کی طرف مناسب رہنمائی نہ کی گئی تو وہ اپنے آپ کو ہندوستان کے معاشرتی ماحول میں ضم کر دیں گے۔ اور اسلام سے دور ہو جائیں گے ان کو مسلمانوں کی نسبت اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی، کیونکہ مسلمان اس لیے مسلمان نہیں تھے کہ وہ یک ملی یا قومی وجود سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ اس لئے مسلمان تھے کہ ان کا عقیدہ اسلام پر تھا۔ اس لئے ان کے ذہن میں اولین ترجیح اس بات کو حاصل تھی کہ اسلام کے ساتھ مسلم وفاداری کو تقویت پہنچائی جائے۔140 یہی وہ اختلافی نقطۂ نظر تھا جس کے باعث سید مودودی نے قیام پاکستان کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ عملی تعاون نہ کیا، یہی وجہ ہے کہ جب مسلم لیگ مجلس عمل نے آپ کو شرکت کی دعوت دی تو آپ نے جواب دیا:

''آپ حضرات ہرگز گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلاف کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا، دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ حصہ لوں تو کس طرح ادھوری تدابیر میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں۔ نہ داغ دوزی سے ہی مجھ کو کبھی دلچسپی رہی ہے۔ اگر کلی تخریب کلی تعمیر پیش نظر ہوتی تو میں دل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لئے تیار تھا۔ میرے لئے مناسب یہی ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی طرح دیکھتا رہوں، کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں، اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا

نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقہ سے کوئی
بہتر نتیجہ نکال دکھایا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا، اور ممکن ہے
کہ اس کو دیکھ کر میں مسلک کلی سے مسلک جزئی کی طرف منتقل ہو
جاؤں''۔141

عالمی سطح پر بدلتی ہوئی صورتحال ہندوستانی سیاست کو بھی متاثر کر رہی تھی،۱۹۴۲ء کے اوائل میں جاپانی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس پر برطانوی حکومت نے برطانوی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر اسٹیفرڈ کرپس (Sir stafford Cripps) کو نئی تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا۔ ان تجاویز میں یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان میں ایک دستور ساز مجلس قائم کی جائے گی، جس کی سفارشات کو برطانوی حکومت منظور کرلے گی اور نافذ کردے گی، اس طرح اختیارات لازماً ہندوستان کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔142 اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگریس نے کرپس کے واپس جانے کے بعد ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی مشہور قرارداد منظور کی چنانچہ کانگریس کے سب اہم لیڈر گرفتار کرلیے گئے۔ جب دو سال کی قید کے بعد ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی رہا ہوئے تو جنگ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں ایک بار پھر تبدیلی ہوئی، لندن کے ایک اخبار نیوز کرانیکل کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''اگر ہندوستان کو آزادی دے جائے تو وہ برطانیہ کا ساتھ دے گا اور جنگی کارروائیوں میں کھلے دل سے تعاون کرے گا۔143

جون ۱۹۴۵ء وائسرائے ہند لارڈ ویول (Lord Wavell) نے کانگریس اور مسلم لیگ کو اپنی وزارت میں شامل کرنے کے لئے شملہ میں کانفرنس منعقد کی جس میں مسلم لیگی اور کانگریسی لیڈروں کو مدعو کیا گیا، چنانچہ کانگریس کے سب سے اہم لیڈر جیل سے رہا کئے گئے۔ کانفرنس جاری ہی تھی کہ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور کانفرنس ناکام ہوگئی۔144 اس کانفرنس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس اپنے آپ کو تمام برصغیر کے باشندوں کا نمائندہ بتاتی تھی، لیکن قائداعظم یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھے ان کا مطالبہ تھا کہ اگر حکومت میں نمائندہ عناصر کو شامل کرنا ہے تو مسلمان نمائندوں کا انتخاب

مسلم لیگ سے کیا جائے۔ شملہ کانفرس کا ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ تمام پارٹیاں اس پر متفق ہوئیں کہ انتخابات جلد سے جلد کرائے جائیں۔145

مسلم لیگ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر انتخابات میں شریک ہونا چاہتی تھی اس تصور کو نکھارنے اور اسے فروغ دینے میں مولانا مودودی کی تحریروں نے اہم کردار ادا کیا تھا، جس کا سلسلہ انہوں نے ''مسئلہ قومیت'' کے نام ترجمان القرآن میں جاری کیا تھا۔ اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے جناب ظفر احمد انصاری صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس موضوع پر مولانا ابوالاعلی مودودی صاحب نے''مسئلہ قومیت'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جو اپنے دلائل کی محکمی، زور استدلال اور زور بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اور اس کا چرچا بہت تھوڑے عرصے میں اور بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں ہوگیا۔ اس اہم بحث کی ضرب متحدہ قومیت کے نظریہ پر پڑی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ قومیت کے مسئلے پر یہ بحث محض ایک نظری بحث نہ تھی، بلکہ اس کی ضرب کانگریس اور جمیعت العلمائے ہند کے پورے موقف پر پڑتی تھی۔ ہندوؤں کی سب سے خطرناک چال یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ان کی جداگانہ قومیت کا احساس کسی طرح ختم کر کے ان کے ملی وجود کی جڑیں کھوکھلی کردی جائیں۔ خود مسلم لیگ نے اس بات کی کوشش کی کہ اس بحث کا مذہبی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے، تا کہ عوام کانگریس کے کھیل کو سمجھ سکیں اور اپنے دین اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں''۔146

نتیجتاً ۱۹۴۶ء میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کو فتح حاصل ہوئی، ان انتخابات نے جناح کے اس دعوے کو درست ثابت کر دیا کہ مسلمان پوری طرح مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔147

لیکن سید مودودی کے خیال میں جداگانہ رائے دہی، اسمبلیوں میں نشستوں کا توازن، اور ملازمتوں میں تناسب کی تخصیص مسلم قوم کے سیاسی مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔148 ان کے نزدیک پاکستان بلاشبہ مسلمانان ہند کا ایک جزوی حل تھا، کیونکہ اس سے ان مسلمانوں کے لیے جو لازمی طور پر ہندوستان میں رہ جاتے، نہ سلامتی کی کوئی ضمانت حاصل ہوتی تھی اور نہ اسلامی خطوط پر ترقی کے امکانات نظر آتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے لیے یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل تھا، کہ ہندوستان میں اسلام پر کیا بیتے گی۔149 چنانچہ انہوں نے برصغیر میں اسلام کی کلیت کو بچانے کے لئے تین متبادل تجاویز پیش کیں:

الف:۔ ایک وفاق بین الاقوام جو وفاق شدہ اقوام کی ایک ریاست ہوگا، جہاں ہر قوم مقتدر ہوگی اور اپنی ثقافتی آزادی و خود مختاری کی حامل ہوگی۔

ب:۔ وہ اسکیم جو "ہندوستان کے ثقافتی مستقبل" میں ڈاکٹر عبداللطیف نے تیار کر کے پیش کی ہے نافذ کی جائے اور علیحدہ علیحدہ منطقوں کی حد بندیاں کر دی جائیں تا کہ متعلقہ قومیتوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہو سکیں۔ مرکز کم سے کم امور اپنے پاس رکھے۔ باہمی تبادلۂ آبادی کے لئے پچیس (۲۵) سال کا عرصہ مقرر کیا جائے۔ مشرقی بنگال، حیدر آباد، بھوپال، جوناگڑھ، چندرا، ٹونک، اجمیر، دہلی، اودھ، شمال مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان مسلمانوں کو دیئے۔ سکھوں کے لئے اور پست اقوام کے لئے اگر وہ خواہش کریں تو علیحدہ منطقے مخصوص کر دیے جائیں۔

ج:۔ یا اگر دونوں مذکورہ متبادل صورتیں قابل قبول نہ ہوں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو علی الترتیب ۲ علیحدہ علیحدہ وفاقی ریاستیں ایک بین الوفاق کی صورت میں ہونی ضروری ہیں۔ ان دونوں وفاقوں کے درمیان دفاع، مواصلات اور تجارت کی حد تک ایک معاہدے یا عہد نامے کا ہونا بھی ضروری ہے۔150

مارچ ۱۹۴۷ء میں برطانوی کابینہ نے تین ارکان پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن بھیجا جس کا مقصد یہ تھا

کہ ہندوستان کے دستور کی تشکیل کا کوئی طریقہ سوچ کر نکالے، یہ ''وزارتی مشن کا منصوبہ'' کہلاتا ہے۔ اس میں کانگریس کی بد دیانتی اور مشن کے اراکین کا کانگریس کی جانب جھکاؤ کے باعث، مسلم لیگ ہر ممکن کوشش کے باوجود تعاون جاری نہ رکھ سکی۔ چنانچہ لیگ نے مشن کی تجاویز قبول کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا تمام مسلمانوں کو ہدایت کردی گئی کہ وہ سرکاری خطابات ترک کردیں اور ایک آزاد پاکستان حاصل کرنے کے لئے بلا واسطہ مہم چلانے کا فیصلہ کرلیا۔151 اس دوران میں مجلس دستور ساز کے انتخابات ہوگئے اور اس نے کام کرنا شروع کردیا، مگر مسلم لیگ کے ارکان نے شرکت نہیں کی۔ اب برطانیہ عظمی اور کانگریسی حلقوں میں یہ محسوس کیا گیا، کہ ایک ایسی جماعت کا بنایا ہوا دستور جس میں مسلمان شریک نہیں ان پر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۹۴۷ء کو ایک اور منصوبے کا اعلان کیا گیا جس سے پاکستان کے وجود میں آنے کا جواز مستحکم ہوگیا۔152

سید مودودی نے مئی ۱۹۴۷ء کے کل ہند اجتماع میں ۳ جون ۱۹۴۷ء کی تجویز تقسیم سے تقریباً ایک ماہ قبل خطاب عام کے اختتام پر فرمایا:

> ''اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا، اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا، پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کرکے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں گے، جسے ہم مسلمان خدائی دستور قانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں، اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں یہ خدا پرستانہ خلافت جو محمدﷺ کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لیے، اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی

ہے"۔153

۱۴ اگست ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جشن کا دن تھا۔154 اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں

"مجھے اس وقت صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں نے تقسیم کو آزادی کے ساتھ اور کھلے دل سے نہیں مانا ہے۔انہیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہوگی اور وہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکے گی"۔155

لہٰذا مسلمانوں کی اس فتح کو ناکامی میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، تقسیم ہند کے موقع پر پنجاب میں سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا گیا۔سکھوں نے ہندو دہشت گردوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے قتل عام میں حصہ لیا اور شدید جانی و مالی نقصان پہنچایا۔شمالی ہند اور بنگال میں سات لاکھ کے قریب بے گناہ انسانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور بیشتر مورخین نے اس بات کی تصدیق کی ہے، کہ تقسیم ہند کے موقع پر ہندوستانی مسلمانوں نے ایسا محسوس کیا جیسے قیامت آ گئی ہو۔

دہلی کے فسادات پر پروفیسر شریف المجاہد نے روز نامہ ڈان کراچی کے ایک اقتباس سے حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے"ہندوستان دہشت گرد تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ (R.S.S) کے دہشت گردوں کے پاس دہلی اور دہلی کے گردونواح کے دیہاتوں کے مکمل نقشے موجود تھے انہیں یہ علم تھا کہ کس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں جہاں ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو ختم کیا گیا۔156 لیکن مسلمانوں اور ان کے قائدین نے ہندوؤں کی تمام منفی کارروائیوں کے باوجود، پاکستان کے استحکام کے لئے ہجرت کے مشکل عمل کو نہ روکا لیکن مسئلہ ان مسلمانوں کا تھا جو ہندوستان میں ہی رہنا چاہتے تھے۔ ہجرت کے بارے میں سید مودودی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ چھوڑ کر

پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں۔ اور تبادلۂ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرار دادا سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کرلیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابل عمل ہے، مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ نہ حل کر سکے گی، کیونکہ ایسی صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھاتے پیتے لوگ، یا بہت برداشتہ خاطر افراد دو خاندان یا کچھ منچلے قسمت آزما لوگ ہی عمل کرسکیں گے۔ مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی، اور اس کا کسی بڑے پیمانے پر مہاجرت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ الاّ یہ کہ کسی وقت خدانخواستہ وہ حالات پیش آجائیں جو بہار میں پیش آئے ہیں، رہی دوسری صورت تو مجھے امید نہیں، کہ آئندہ پچاس سال تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو، اور ڈھائی تین کروڑ غیر مسلموں کو ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل کرنے کا انتظام کرسکیں گی۔ خواہ وہ دل سے ایسا کرنا چاہیں تاہم اگر کوئی اس امید پر جینا چاہے تو ضرور جئے''۔157

مولانا طفیل محمد صاحب بیان کرتے ہیں، ۳رجون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند یعنی قیام پاکستان کا حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان ہوا، تو ہم لوگ دارالاسلام میں تھے،مولانا مودودی اور مرکز جماعت میں مقیم، ہم سب لوگوں نے یہ اعلان ریڈیو دہلی سے سنا۔ اس ابتدائی اعلان میں یہ تاثر دیا گیا تھا، کہ ضلع گورداسپور پاکستان میں شامل ہوگا۔ لیکن دونوں آزاد ریاستوں بھارت اور پاکستان کی قطعی حدود کا اعلان ۱۴راگست کو باؤنڈری کمیشن کرے گا۔ ۱۴ اگست کو باؤنڈری کمیشن کی طرف سے بھارت اور مغربی پاکستان کے درمیان سرحد کے اعلان میں ضلع گورداسپور کو بھارت میں شامل کردیا گیا۔158 اس اعلان کو سنتے ہی

مولانا مودودی نے فرمایا:

''گورداسپور کی بھارت میں شمولیت، کشمیر کا بھارت سے الحاق، اس پر بھارت کے تسلط کی کھلی سازش ہے۔ پاکستان کو فوراً ایک آدھ بٹالین فون بھیج کر ریاست کا تعلق بھارت سے منقطع کر دینا چاہیے، ورنہ ایک دفعہ بھارت ریاست میں گھس گیا تو اسے بے دخل کرنا آسان نہ ہوگا''۔

جب آٹھ دس روز تک بھی پاکستان کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی تو مولانا اس قدر مضطرب تھے کہ انہوں نے فرمایا:

''اگر یہاں (دارالاسلام میں) میرے پاس سو (۱۰۰) بندوق بردار بھی ہوتے، تو میں لاہور جانے سے پہلے راوی پار کر کے ریاست کا تعلق بھارت سے منقطع کرنے کا انتظام کرتا، خدا معلوم پاکستان کے ذمہ دار کیا سوچ رہے ہیں''۔159

افرادی قوت کی عدم دستیابی کے باعث مولانا اپنی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، اور بدلتی ہوئی مخدوش صورتحال کے وجہ سے آپ بھی ۲۹ اگست کو ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اور ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور'' میں اقامت گزین ہوئے۔160

پاکستان آمد کے بعد سید مودودی نے اپنی ساری جدوجہد پاکستان کو ایک خالص اسلامی مملکت بنانے میں مرکوز کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں جنوری اور مارچ کے درمیانی عرصے میں مولانا مودودی نے ریڈیو پر پانچ تقریریں کیں۔ جن میں اسلام کی روحانی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کی نمایاں ترین خصوصیات بیان کیں۔ ان کے نزدیک اسلام محض ایک نعرہ نہ تھا۔ ان کا شمار ملک کے ان چند رہنماؤں میں ہوتا ہے، جن کا عمل ان کے قول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ جب انہوں نے ملک کے لئے خالص

اسلامی دستور بنانے کا مطالبہ کیا تو ان پر ریاست کے دشمن ہونے کا الزام عائد کر کے انہیں ۴/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گرفتار کرلیا گیا اور وہ ۲۸/مئی ۱۹۵۰ء تک محبوس رہے۔161

سید مودودی نے جیل میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، انہوں نے علماء اور دیگر مختلف مذہبی گروپوں کو خطوط کے ذریعے متحرک رکھا، اور انہیں دستور ساز اسمبلی پر اسلامائزیشن کے لیے دباؤ ڈالنے پر مسلسل آمادہ کرتے رہے۔162 ۱۹۴۹ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی مسلسل جدوجہد اور گفت وشنید کے نتیجے میں وہ قرارداد مقاصد ۱۲ مارچ کو منظور ہوگئی، جس میں خدا کی حاکیت کا واشگاف اعلان کیا گیا اور جو دستور کی اساس اور بنیاد قرار دی گئی،163 اور جس میں وہ تمام مطالبات شامل تھے جو مولانا مودودی نے ملک کو اسلامی دستور کی بنیادیں فراہم کرنے کے لئے کیے تھے۔164

دسمبر ۱۹۴۹ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے بعد دستور ساز اسمبلی میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لئے کوئی فرد اس خلا کو پورا نہ کرسکا۔ کلیم بہادر لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کو طے کرنے کے سلسلے میں، مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے پاکستانی علماء کی ایک نمائندہ کانفرنس جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں طلب کی، جس کی صدارت سید سلیمان ندوی نے کی، اس کانفرنس میں دیوبندی، اہلحدیث، اہل تشیع اور بریلوی علماء نے شرکت کی۔ جماعت اسلامی سے صرف مولانا مودودی کو شرکت کی دعوت دی۔ اس کانفرنس کا ۲۲ نکات پر مبنی ایک مخصوص اور متعین ایجنڈا تھا اس کے زیادہ تر شرکاء مولانا مودودی کے علاوہ اسلامی دستوری خاکہ کے متعلق کوئی خاص تجاویز کے حامل نہ تھے۔

مولانا مودودی کے لیے بقول کلیم بہادر یہ ایک پہلا سنہری موقع تھا کہ وہ تمام علماء کو اپنے خیالات سے آگاہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ اس سے قبل بیشتر علماء مولانا مودودی کے اسلامی اور دستوری خیالات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہ تھے بلکہ اس کے برعکس مولانا کی دستوری و اسلامی تشریحات کو بہ نظر استحسان بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس کانفرنس نے اسلامی ریاست کے ۲۲ اساسی اور بنیادی نکات متعین کیے جو بالاتفاق رائے

کانفرنس نے منظور کیے کلیم بہادر نے صراحت سے لکھا ہے'مولانا مودودی نے اس کا کانفرنس پر بہت اہم اور قابل لحاظ اثرات مرتب کیے اور اپنی وقیع آراء کے ذریعے علمی و دستوری اہلیت و قابلیت کا لوہا منوایا۔164

سید مودودی کی دستوری جدوجہد پر این میری شمل اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''۱۹۴۱ء میں قائم کی گئی ''جماعت اسلامی'' کی صورت میں ان کے پاس کافی موثر قوت موجود تھی۔ یہ جماعت اطاعت امیر کے اصولوں پر چلتی ہے، اور عملی اغراض و مقاصد کے ہر حوالے سے پاکستان کی واحد منظم مذہبی جماعت ہے۔اس کے پاس ایک ٹھوس لائحہ عمل موجود ہے۔ اپنے جذبہ یگانگت، اظہار یکجہتی اور ضرورت مند افراد کی مدد کا جذبہ رکھنے والے کارکنوں کی وجہ سے یہ جماعت طالبعلموں تک میں کسی نہ کسی حد تک مقبول ہے۔اس کے ارکان نے پاکستان کے آئین میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کروانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے''۔165

قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کو ملک کی سیاست میں پہلی مرتبہ ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے صوبائی انتخابات میں عملی طور پر حصہ لینے کا موقع ملا۔ سید مودودی نے جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد اور مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

''ہمارے لائحہ عمل کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آئینی ذرائع سے اس مملکت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے، اور اسے بروئے کار لاکر قوانین، نظم ونسق، تعلیم، مالیات، معاش نظام، فلاح عمومی، دفاع اور خارجی سیاست میں ایسی

اصلاحات کی جائیں، جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرنے والا ایک ملک بن جائے۔166 چنانچہ اس میں آئینی طریقہ کار سے حکمرانوں کی تبدیلی کا کچھ بھی امکان باقی ہو، تو پھر صحیح راستہ یہی ہے کہ عوام الناس کو فاسق قیادت اور صالح قیادت کے فرق سے آشنا کیا جائے، صالح قیادت کی طلب اور اس کی معرفت ان میں پیدا کی جائے''۔167

قابل افسوس بات یہ تھی کہ اتنے واضح مقصد کے باوجود نہ صرف حکومت، بلکہ دیگر سیاسی و مذہبی جماعتوں نے مودودی صاحب کی شدید مخالفت کی، اور تمام مذہبی جماعتوں کا جماعت اسلامی کے خلاف ایک متحدہ محاذ بن گیا۔ ملتان کے ایک مولوی صاحب نے 'خطرے کی گھنٹی' بجائی اور شائع کرائی کہ سید مودودی، مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں، چنانچہ سید مودودی نے لکھا ''کوئی اللہ کا بندہ آنکھیں رکھتا ہو اور دیکھنا چاہتا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ، دراصل ہمارا یہ آخری قدم نظام فسق وضلال کے قلعے کی طرف براہِ راست پیش قدمی ہے۔ اور ایک فیصلہ کن ضرب ہے جو ٹھیک اس کے فیصلوں پر جا کر پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ قدم نہ اٹھایا تھا کسی نہ کسی طرح ہمیں برداشت کیا جا رہا تھا۔ مگر جونہی کہ یہ قدم ہم نے اٹھایا قیادت فاسقہ اور اس کے مددگار سب کے سب یک لخت بھڑک اٹھے۔ پاکستان سے لے کر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی، پرانے پرانے دشمن، جو کبھی جمع نہ ہو سکتے تھے اسی خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہو گئے۔ دیوبندی اور بریلی گلے مل گئے، پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہو گیا۔ اہل حدیث اور منکرین حدیث متفق ہو گئے، قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا۔ ہندوستان کے کانگریسی علماء تک دینی حمیت کے تقاضوں سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں۔ حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شان تواضع کے ساتھ جماعت اسلامی کی وہ ساری برائیاں

گنوا دیں، جو ان کے خیال مبارک میں تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے، کہ یہ قدم ہم نے ٹھیک صحیح رخ پر اٹھایا ہے، تو نہ معلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے، ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی اس گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آرہے ہیں، جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتے دیکھ کر اس پر طاری ہوا کرتی ہے۔168 تاہم انتخابات کے غیر شفاف ہونے کے باعث جماعت اسلامی غیر معمولی کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

۱۹۵۳ء میں سید مودودی کو ایک اور کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، جب پنجاب میں قادیانیوں کو جدا گانہ اقلیت اور قادیانی وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبہ نے زور پکڑا، اگر چہ مسئلہ انجمن احرار نے اٹھایا تھا، لیکن اس کو فیصلہ کن انجام تک پہنچانے میں سید مودودی نے اہم کردار ادا کیا۔169 انہوں نے ''قادیانی مسئلہ'' لکھ کر نہ صرف اس مطالبے کی تائید کی بلکہ قادیانیت کی اصلیت بھی واضح کردی۔ انہوں نے لکھا:

> ''قادیانیوں کی تکفیر کا معاملہ دوسرے گروہوں کی باہمی تکفیر بازی سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ قادیانی ایک نئی نبوت لے کر اٹھے ہیں اور ان تمام لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں، جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہ لائیں۔ قادیانی مسلمانوں کے اندر مسلمان بن کر گھستے ہیں، اسلام کے نام سے اپنے مسلک کی اشاعت کرتے ہیں، مناظرہ بازی اور جارحانہ تبلیغ کرتے ہیں، اور مسلم معاشرے کے اجزآء کو توڑ توڑ کر اپنے جدا گانہ معاشرے میں شامل کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔.....
>
> دیکھنا یہ چاہیے کہ ایک مطالبہ، جس ضرورت کی بناء پر کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ یہاں اختلاط کا نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے نہ کہ اقلیت کو۔ اس لئے اکثریت یہ مطالبہ کرنے پر مجبور ہے کہ

اس اقلیت کو آئینی طور پر الگ کر دیا جائے، جو ایک طرف عملاً الگ ہو کر علیحدگی کا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے، اور دوسری طرف اکثریت کا جز بن کر اختلاط کے فوائد بھی سمیٹتی چلی جاتی ہے، ایک طرف وہ مسلمانوں سے مذہبی و معاشرتی تعلقات منقطع کر کے اپنی الگ جتھہ بندی کرتی ہے، اور منظم طریقے سے ان کے خلاف ہر میدان میں کشمکش کرتی ہے، دوسری طرف مسلمان بن کر مسلمانوں میں گھستی ہے۔ اپنی تبلیغ سے اپنی تعداد بڑھاتی ہے۔ مسلم معاشرے میں تفریق کا فتنہ برپا کرتی ہے، اور زندگی کے ہر میدان میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے متناسب حصے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ حصہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس صورتحال کا سراسر نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے، چنانچہ اقلیت نہیں بلکہ اکثریت اسے جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتی ہے''۔170

اس احتجاج پر حکومت نے جو ردِعمل ظاہر کیا، اس کے نتیجے میں نہ صرف جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی، بلکہ سید مودودی اور متعدد دیگر علماء کو حوالۂ زندان کر دیا گیا۔ جناب مودودی پر بغاوت کے الزام کے تحت کارروائی ہوئی اور انہیں موت کی سزا سنا دی گئی۔171

الطاف حسین قریشی بیان کرتے ہیں، قادیانی مسئلے پر جب مولانا گرفتار ہوئے اور فوجی عدالت نے سزائے موت دینے کا فیصلہ دیا، تو ہم چار پانچ ساتھیوں نے مولانا سے ملنے کا فیصلہ کیا، جب ہم ان سے ملنے گئے، تو انہوں نے وہ خاص لباس زیب تن کیا ہوا تھا جو سزائے موت کے قیدیوں کو دیا جاتا ہے، ہم سب افسردہ اور مایوس تھے، میں نے عالم حسرت میں پوچھا مولانا اب کیا ہوگا؟ مولانا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا ''اللہ تعالیٰ مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے زندگی نہیں چھین سکتی، اور اگر میرا وقت آن پہنچا ہے تو پھر مجھے کوئی بھی زندگی نہیں بخش سکتا''۔172

مولانا کا یہ عزم صمیم ہی تھا، جس نے حکومت وقت کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا ان کی سزائے موت کے خلاف ملک میں ہی نہیں، عالمی سطح پر بھی شدید احتجاج ہوا، جس سے مولانا کی عالمگیر شہرت اور اہمیت ثابت ہوئی اور سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔173 مولانا نے یہ جیل بھی صبر وتحمل سے گزاری اور ظالم سے کوئی رعایت طلب نہیں کی، اور عمر قید کے خلاف کسی قسم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس دوران وہ اپنی مشہور تفسیر ''تفہیم القرآن'' کی تکمیل میں مصروف رہے، یہاں تک کہ ایک عدالتی فیصلے کے تحت مولانا کی قید خلاف قانون قرار پا گئی اور وہ ۱۹۵۵ء کے آخر میں باعزت طور پر رہا کر دیے گئے۔174

حکومت کی یہ منفی کارروائیاں سید مودودی کے حق میں مفید اور معاون ثابت ہوئیں اور ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی جماعت بھی اہم قوت وحیثیت کی مالک بن گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جب ۱۹۵۶ء کا دستور منظور ہوا تو جماعت اسلامی، اور اس کی اتحادی جماعتوں کے بہت سے مطالبات اس کا حصہ بن چکے تھے۔ اس پر دینی جماعتوں نے اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے دیگر قومی اداروں کو بھی دستور کی اسلامی دفعات کے تابع بنوانے کی مہم شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ملکی سیاست میں جماعت اسلامی کے کردار کے لئے راہیں کھلتی چلی گئیں۔175 تاہم یہ المناک واقعہ ہے، کہ عین اس وقت جب اس دستور کو عملی جامعہ پہنانے اور اسلامی ریاست کی بنیاد بنانے کے اقدامات کیے جا رہے تھے، صدر اسکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان نے ملی بھگت کر کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا۔ دستور منسوخ کر دیا اور جماعت اسلامی سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا۔ اسی مہینے ایوب خان نے سکندر مرزا سے اختیارات لے کر عنان اقتدار پر قبضہ کر لیا۔175

مارشل لاء نے جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دے کر، سید مودودی کے کندھوں پر سے جماعتی اور تنظیمی ذمہ داریوں کا بوجھ اتار دیا تھا، اب وہ اپنے علمی و تصنیفی اور تحقیقی کام میں پوری تندہی اور سرگرمی سے مصروف ہو گئے۔ عرصہ دراز سے ان کی خواہش تھی کہ وہ ان مقامات کو دیکھنے جائیں جن کا قرآن کریم

میں ذکر ہوا ہے، تاکہ ان مقامات پر انبیاء کرام کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے جغرافیائی پس منظر کو بہتر طور پر جان سکیں، اور وہ تفہیم القرآن میں ان مقامات کے بارے میں جدید ترین معلومات دے سکیں۔176

عرب ممالک کے علمی دوروں کے دوران سید مودودی نے اپنی شخصیت کے کتنے گہرے نقوش ثبت کیے، اس کا اندازہ اس دعوت سے ہوتا ہے جو انہیں سعودی حکومت نے دی تھی۔ پاک و ہند کے جید علماء کی موجودگی میں، شاہ سعود نے مدینہ میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی میں معاونت کے لیے سید مودودی کا انتخاب کیا تھا، چنانچہ ۱۹۶۱ء میں سید مودودی نے اسلامی یونیورسٹی کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس منصوبے سے وہ فکری و تعلیمی خلاء پر ہو جائے گا، جو الازہر یونیورسٹی کے لادینیت اور قوم پرستی کا شکار ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ سید مودودی کہتے ہیں:

> ''مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی کے لیے جو خاکہ میں نے پیش کیا اور جسے شاہ کی مقرر کردہ کمیٹی نے منظور کر لیا، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور علم الکلام کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ، جدید قانون، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور متقابل مذاہب کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی یا جرمنی میں سے کسی ایک زبان کی تحصیل بھی لازمی ہوگی۔ اس خاکے میں تعلیم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ محدود اصطلاحی معنوں میں نہ تو لادینی ہے نہ مذہبی، یہ یونیورسٹی تمام قدیم اور جدید تعلیمی اداروں سے مختلف اور یکتا مقام کی حامل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی سے ایسے مسلمان علماء تیار ہو کر نکلیں، جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے بھی پوری طرح ماہر ہوں، اور اسلامی اصولوں کو آج کی زندگی کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت

رکھتے ہوں۔177

مئی ۱۹۶۲ء کو مکہ معظمہ کے قصر شاہی میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس شروع ہوئے جس میں ۳۲ ممالک کے قریباً ۱۲۰ نمائندے شریک ہوئے، پاکستان سے سید مودودی مدعو تھے۔ مولانا نے موتمر کے اجلاس میں ''معاشرتی انصاف کی حقیقت اور اسے قائم کرنے کی تدابیر'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا، جس میں بتایا کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس سے معاشرتی انصاف اور عدل قائم ہوتا ہے۔ مقالہ ایسا موثر تھا کہ سوشلسٹ مصر کے مفتی سمیت سب ہی نے پسند کیا۔178

عالمی سطح پر سید مودودی کی علمی و دینی صلاحیتوں کا اعتراف، اور ملکی سطح پر ارباب اقتدار کی جانب سے انتہائی شدید مخالفت ان کی حیثیت اور اہمیت کو ختم کرنے کے اقدامات، مولانا کی زندگی کا تکلیف دہ تضاد تھا۔ آمریت کے خلاف آواز بلند کرنا ان کا ایسا جرم تھا، جس کی پاداش میں ۱۹۶۴ء میں جماعت اسلامی کے دفاتر بند کردیے گئے، سرکردہ ارکان پر پابندیاں لگادی گئیں اور سید مودودی کو گرفتار کرلیا گیا۔179 تاہم جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں پیش ہوا تو عدالت نے حکومت کے اقدامات کو باطل قرار دے دیا۔180

مولانا کی رہائی کے وقت ملک میں صدارتی انتخابات کی مہم کا سلسلہ زور وشور سے جاری تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح، ایوب خان کے مخالف صدارتی امیدوار تھیں۔ مادر ملت ہونے کے باعث پاکستانی عوام پر اپنے خاص اثرات رکھتی تھیں۔ مولانا مودودی نے اپنے دور اسیری میں ہی محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لہٰذا ۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو جماعت اسلامی کی مرکزی کمیٹی نے اس فیصلے کی تصدیق کردی، اور جماعت نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا اعلان کردیا۔181 مخالفین نے جماعت کے اس فیصلے پر سخت تنقید کی اور اسلام میں عورت کی سربراہی کے مسئلے کو اٹھایا۔ سید مودودی نے ان کے جواب میں فرمایا:

''اب میں مختصراً اس مسئلے پر بحث کروں گا کہ اسلام میں عورت ملک کی سربراہ بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں ان ارباب غرض سے چند سوالات

کرنا بے محل نہ ہوگا، کیا اسلام عورتوں کو وزیر یا سفیر بنانے کی اجازت دیتا ہے؟ کیا مخلوط تعلیم، معاشرے میں مرد وزن کا اختلاط اور دفاتر میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی ملازمت، اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے؟ کیا اسلام مسلمان عورتوں کو کھلے عام اور حکومت کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی ثقافتی تقریبات میں گانے اور ناچنے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا اسلام فی الواقع مسلمان لڑکیوں کو فضائی میزبان بننے اور مسافروں کو شراب پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ اگر پاکستان میں ان سب باتوں کی اجازت ہے تو پھر صدارتی انتخاب کا مسئلہ آتے ہی ان حضرات کی اسلامی حس کیوں جاگ اٹھی ہے؟ پھر ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام میں مملکت کے سربراہ کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ مرد ہو اور یہ دیکھنا ضروری نہیں ہے کہ اس میں اور اوصاف بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ اگر کبھی قوم کو ایسی صورتحال درپیش ہو کہ اسے دو شخصیتوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے جن میں سے ایک کے خلاف سوائے اس کے اور کچھ کہا نہ جا سکتا ہو کہ وہ عورت ہے، اور دوسرا ہے تو مرد، لیکن اس میں ان اوصاف میں سے ایک وصف بھی نہ پایا جاتا ہو، جو، ایک عادل اور صالح قیادت کے لئے ضروری ہیں، تو ایسی صورت میں کیا اسلام کی شدبد رکھنے والا کوئی بھی شخص اول الذکر کو چھوڑ کر موخر الذکر کے حق میں رائے دے سکتا ہے"۔182

صدارتی انتخاب کی مہم کو سید مودودی اور جماعت اسلامی نے اپنی دعوت کو پھیلانے، آمریت کو بے نقاب کرنے اور جمہوریت بحال کرنے کے لئے استعمال کیا۔183 جماعت اسلامی اور عوامی حمایت کے

باعث محترمہ جناح، ایوب خان کے خاف مضبوط ترین امیدوار تھیں۔ لیکن جب انتخابی نتائج کا اعلان ہوا تو ایوب خان کامیاب قرار دیے گئے۔ جس سے ملک میں مایوسی اور ناامیدی کی فضا پیدا ہوگئی،184 لیکن ایوب خان، سید مودودی کی اہمیت اور ان کے اثرات کو ختم نہ کر سکے، بلکہ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے اچانک پاکستان پر حملہ کر دیا، تو ایوب خان نے سر عام مولانا مودودی سے مدد طلب کی اور اس جنگ کو جہاد قرار دینے کی اپیل کی، تاکہ عوام مذہبی جذبے سے جنگ میں حصہ لیں اور جانی و مالی وسائل مذہبی فریضہ سمجھ کر جہاد پر خرچ کریں،185 یہ تھا سید مودودی کی عظمت کا برملا اعتراف، چنانچہ سید مودودی کا مفصل بیان شائع ہوا جس میں آپ نے فرمایا:

''پاکستان کو دارالاسلام کی حیثیت حاصل ہے، اور اس کا دفاع بلاشبہ جہاد ہے، اور ہر مسلمان کا فرض ہے، کہ خون کا آخری قطرہ بہہ جانے تک پاکستان کی ایک انچ زمین پر بھی دشمن کے قدم نہ بڑھنے دے''۔186

پاکستانی فوج کے ساتھ پوری قوم نے نہایت بہادری سے اس جنگ میں حصہ لیا، اور بھارت کو شکست پر مجبور کر دیا، اور وہ اقوام متحدہ سے جنگ بندی کا طلب گار ہوا، ایوب خان نے ایوان صدر میں حزب اختلاف کے تمام زعماء کے سامنے صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے مشورہ طلب کیا، سید مودودی نے صدر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''جنگ کوئی کھیل نہیں ہے جسے ہر روز چھیڑا جاسکے، بھارتی فوج میدان میں شکست کھا چکی ہے۔ اب ضرورت صرف اس قدر ہے کہ ہم اپنے قدموں پر مضبوط رہیں۔ آپ چند دنوں میں ہی دیکھیں گے کہ بھارتی حکومت آپ کی تمام شرائط کو تسلیم کرے گی، اگر ایک دفعہ جنگ بندی قبول کرلی تو جو کچھ ہماری فوجوں نے جیتا ہے، وہ ہم میز پر

ہار بیٹھیں گے اور کشمیر کا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوگا۔

سید صاحب کی رائے حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ حکومت نے جنگ بندی قبول کر لی اور تاشقند میں جا کر ہماری فوجی جیت کو ہار میں تبدیل کر دیا اور کشمیر بھارت کا حصہ بن گیا۔187

۱۹۶۷ء میں سید مودودی اور صدر ایوب کے درمیان ایک بار پھر اس وقت اختلاف رائے ہوا، جب حکومت نے شوال کا چاند نظر نہ آنے کے باوجود جمعرات کی عید کا اعلان کر دیا۔ سید مودودی ن حق گوئی کا جرم کرتے ہوئے سرکاری عید سے اختلاف کیا، اور نہ صرف اگلے روز جمعہ کو عید منائی بلکہ خطبۂ عید الفطر بھی دیا۔ نتیجتاً ایک بار پھر اسیر زنداں ہوئے، اور مارچ میں خاموشی سے انہیں رہا کر دیا گیا۔188 عاصم نعمانی صاحب نے جناب مودودی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس سے مودودی صاحب کی بذلہ سنجی، اور ایوبی دور کے مصائب کے خلاف پختہ عزم کا اظہار ہوتا ہے:

> ''بیماری کے دنوں میں گھر میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ دل کی تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ ہر وقت لیٹے رہیں، مزاج پرسی کے لئے آنے والے چند حضرات کو اندر بلایا گیا۔ ان میں صاحبزادہ محمد ابراہیم بھی تھے۔ وہ پلنگ پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئے اور مولانا کی ٹانگیں دبانے کی کوشش کرنے لگے، مولانا نے ٹانگیں سکیڑ لیں، ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور فرمایا اتنا بڑا آمر مجھے نہ دبا سکا تو آپ کیا دبائیں گے''۔

مولانا کا اشارہ صدر ایوب خان کی طرف تھا۔189

ایوب خان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا دور مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے لئے کوئی نئی سیاسی تبدیلی نہ تھی۔ اس دور میں سید مودودی کا انتہائی اہم کارنامہ قادیانیوں کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دلوانا ہے، بھٹو صاحب کے بھی جماعت کے ساتھ تعلقات آمرانہ نوعیت کے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں مسٹر بھٹو نے

عام انتخابات کا اعلان کیا تو تمام اسلام پسند جماعتیں باہم متحد ہوگئیں، اس اتحاد کو مولانا مودودی کی اشیرباد بھی حاصل تھی۔ انتخابات میں دھاندلی کی گئی اور بھٹو صاحب اقتدار پر قابض رہ کر آمرانہ اقدامات کرتے رہے، تو مودودی صاحب نے بھٹو سے اخبار کے ذریعے مطالبہ کیا کہ وہ وزارت عظمٰی سے استعفیٰ دے دیں، ورنہ قوم انہیں معاف نہ کرے گی۔190

۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کی بے اعتدالیوں کے خلاف رونما ہونے والے فوجی انقلاب میں جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آئے۔ ان کے دور میں جماعت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ دور جماعت کی کامیابیوں اور سیاسی اثرورسوخ کا دور تھا۔ اس دور میں جماعت کو وزارتیں بھی ملیں اور اپنے نظریات کے فروغ کی سہولتیں بھی،191 لیکن یہ دور سید مودودی کی ذات کے اعتبار سے خوشگوار نہ تھا۔ ان کی صحت انتہائی گر چکی تھی، گردے کی بیماری کے پرانے مریض تھے اور مرض سنجیدہ صورت اختیار کر رہا تھا، مزید یہ کہ ان کو دل کا دورہ بھی پڑا اور جوڑوں کا درد بھی بڑھ گیا، یہاں تک کہ کھڑا ہونا مشکل تھا۔ نماز بھی بیٹھ کر پڑھنے لگے تھے۔192

فروری ۱۹۷۹ء میں آپ کے اعزاز میں شاہ فیصل ایوارڈ دینے کی تقریب منعقد ہوئی، تو آپ اپنی خرابی صحت کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کی نمائندگی ان کے صاحبزادے حسین فاروق اور جمات کے ساتھی خلیل احمد حامدی صاحب نے کی،193 اس تقریب کے مہمان خصوصی سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد تھے۔ دیگر شرکاء میں ولیعہد شہزادہ فہد، شاہی خاندان کے افراد، وزرائے حکومت، اعلی سرکاری وفوجی حکام، رئیس الجامعات، پروفیسر اور دانشوروں کے علاوہ دیگر ممالک کے مفکرین بھی شامل تھے۔194 شاہ خالد نے اپنی افتتاحی تقریب میں فرمایا:

> ''ہم یہ چاہتے تھے کہ شاہ فیصل فاؤنڈیشن کا پہلا ایوارڈ ایسی شخصیت کو دیا جائے جس نے اسلام کے بارے میں ہمہ پہلو کام کیا ہو۔ ایسے افراد تو موجود تھے اور ہیں جنھوں نے محض فکری کام تو کیا ہے، مگر عملی

میدان میں ان کا کوئی حصہ نہیں، اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جنہوں نے عملی کام تو کیا ہے مگر ان کا کوئی فکری کام نہیں۔ اس لحاظ سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے فکری اور عملی دونوں میدانوں میں فروغ اسلام کے لیے بے مثال کام کیا ہے۔ انہوں نے آغاز شباب سے اب تک ایک طویل جہاد کیا ہے۔ پوری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص اسلامی قوانین کے غلبہ و نفاذ کے لیے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان کا لٹریچر دنیا کی تیس (۳۰) بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ عصر حاضر کا نوجوان سب سے زیادہ انہی سے متاثر ہوا ہے، چنانچہ احیائے اسلام کی تحریک پوری دنیا میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو بڑی حد تک انہی کے کام کا نتیجہ ہے''۔195

عاصم نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا محترم کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ تنہا فیصل فاؤنڈیشن نے نہیں کیا۔ ایوارڈ کمیٹی نے دنیا بھر کے ۵۰۰ سے زیادہ مسلم تنظیموں اور شخصیات کو ایک سوالنامہ بھیجا تھا، اور رائے طلب کی تھی کہ شاہ فیصل فاؤنڈیشن کا پہلا ایوارڈ کسے دیا جائے، چنانچہ ۹۰ فیصد اداروں اور شخصیات کا یہی ایک جواب تھا کہ ''صرف اور صرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی''۔196

شاہ خالد نے مودودی صاحب کے نمائندوں کو ایک میڈل اور ایک سند کے197-A علاوہ دو لاکھ ریال کا چیک عنایت کیا۔ خلیل احمد حامدی صاحب نے مولانا کا پیغام پڑھ کر سنایا، جس میں اس اعزاز کے دیے جانے پر خوشی اور شرکت نہ کر سکنے پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سعودی فرمانروا کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔197

۱۹۷۹ء کے وسط میں سید مودودی اپنے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے ہمراہ علاج کے

لئے امریکہ چلے گئے،198 روانہ ہونے سے پہلے مولانا محترم نے شاہ خالد کی جانب سے عنایت کردہ رقم کا چیک ادارہ معارف اسلامی کے ڈائریکٹر مولانا خلیل احمد حامدی کو دے دیا تھا۔ ایوارڈ کی یہ رقم انہی دنوں میں مولانا محترم کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی تھی،199 امریکہ میں علاج کے دوران ابتدائی طور پر تو فائدہ ہوا پھر پیٹ کی تکلیف ہوئی تو آپریشن ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ستمبر کے دوسرے ہفتے میں ہی حالت نازک ہوگی۔ ۲۲ ستمبر کو صبح کے وقت انتقال کر گئے۔200

عاصم نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا کا انتقال اس وقت ہوا جب ہسپتال میں کوئی تیمار دار آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ مولانا نے کاغذ کے ایک پرزے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے۔

"I am muslim and Pakistani"

پاکستانی کے الفاظ پورے نہ لکھے تھے کہ آپ ہمیشہ کی نیند سو گئے،201 مولانا کی میت ۲۵ ستمبر کو عین ان کی سالگرہ کے دن لاہور پہنچی،202 ۲۶ ستمبر کو مولانا مرحوم کی قذافی اسٹیڈیم میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ قطر یونیورسٹی کے استاد اور ایک شعبے کے ڈین جناب یوسف قرضاوی نے امامت کرائی آپ قطر سے جنازہ میں شرکت ہی کے لئے تشریف لائے تھے۔ صدر پاکستان محمد ضیاء الحق صاحب اور گورنر پنجاب لیفٹننٹ جنرل سوار خاں صاحب نے بھی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اس سے قبل بفیلو، نیویارک، لندن اور کراچی میں بھی نماز جنازہ ادا کی گئی تھی۔ ۲۹ ستمبر کو امام کعبہ محمد بن عبداللہ بن سبیل تعزیت کے لیے تشریف لائے،203 مولانا محترم کی تدفین ان کے گھر کے احاطے میں واقع ۵۔اے، ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں عمل میں آئی۔204

حوالہ جات

-1 قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر۔ (۱۹۸۷ء)، ''برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ''، اشاعت سوم، کراچی: شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی۔ ص ا

-2 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ (۱۹۹۹ء)، ''تحریک آزادی ہند اور مسلمان'' اشاعت ۱۷، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ۔ ص ۴۰۔۴۱ جلد اوّل

-3 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ (۱۹۴۸ء)، نشانِ راہ۔ اشاعت اول، حیدرآباد دکن: مکتبۂ جماعت اسلامی، ص ۲۳۔۲۴

-4 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ (۱۹۷۱ء)۔ تجدید واحیائے دین، اشاعت ۱۱، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ۔ ص ۱۱۷

-5 ایضاً، ص ۱۲۰

-6 ایضاً، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶

-7 ایضاً، ص ۱۲۸

-8 مہر، غلام رسول۔ (۱۹۵۶ء)، سرگزشت مجاہدین، اشاعت اوّل، لاہور: کتاب منزل، ص ۳۷۱

-9 ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان'' مترجم ڈاکٹر صادق حسین، اپریل ۱۹۹۷ء، لاہور: کی دارالکتاب اردو بازار ص ۷۶ (اشاعت ......

حواشی۔ باراوّل کے ترجے میں (۱۹۴۴ء) میں ہوا۔ ص ۱۲۲۔۱۲۳ پر ہے قید بعبور دریائے شور اور ضبطی املاک کی سزائیں دی گئیں، اقبال اکیڈمی موچی گیٹ لاہور

-10 قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر۔ (جولائی ۱۹۹۴ء) علماء میدان سیاست میں، اشاعت اوّل

(اردو ترجمہ) کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی ص ۲۰۹ جولائی ۱۹۹۴ء

-11 منگلوری، طفیل احمد، سیّد۔ (دسمبر ۱۹۴۷ء) مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور: حماد الکتبی، شیش محل روڈ، ص ۴۸

-12 محمد میاں، مولانا۔ (۱۹۸۶ء) علمائے ہند کا شاندار ماضی، کراچی: مکتبۂ رشیدیہ اردو بازار ص ۷۳، جلد پنجم

-13 ایضاً

-14 خان، سرسیّد احمد۔ (۱۹۵۷ء)، اسباب بغاوت ہند، باب الاسلام پریس، ص ۱۲۹۔۱۳۰

-15 علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد پنجم، محولہ بالا: ص ۶۳

-16 مسلمانوں کا روشن مستقبل، محولہ بالا۔ ص ۱۰۹۔۱۱۰

-17 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ نشانِ راہ، محولہ بالا، ص ۲۴

-18 عابد حسین، سیّد، (جنوری ۱۹۶۵ء)، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ص ۳۵

-19 مرتبین، عطاء اشرف اور نظامی، قیوم۔ (۱۹۶۸ء)، پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد، لاہور: گلوب پبلشرز، لوہاری گیٹ، ص ۳۵

-20 احمد، وصی۔ اکتوبر (۱۹۵۱ء)، ''اسباب تقسیم ہند'' کراچی: دیگر تفصیلات ندارد، ص ۱

-21 ایضاً ص ۴

-22 غلام محمد، چودھری۔ تاریخ جماعت اسلامی تاسیسی پس منظر، تذکرہ سیّد مودودی، اکتوبر ۱۹۹۸ء، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۴۵۷ جلد ۲

-23 Ram Gopal. (1959) Indian Muslims, A Political History. Mumbay: Asia Publishing House P. 5

حواشی الف ۲۳۔ عبداللطیف، بنگل کے ضلع فرید پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک فاضل مؤرخ تھے جنھوں نے تاریخِ عالم لکھی۔ عبداللطیف نے کلکتہ مدرسہ میں تعلیم پائی اور انگریزی میں مہارت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۹ء میں وہ ڈپٹی

مجسٹریٹ مقرر ہوئے، پھر مختلف ملازمتوں پر مامور رہ کر ۱۹۸۷ء میں پنشن لی۔ (بحوالہ، تاریخِ پاک و ہند، ریاست علی ندوی، ص ۱۰۷)

حواشی، ب ۲۳۔ عبداللطیف کی قائم کردہ لٹریری سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ اونچے اور متوسط طبقوں کے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مطالعہ پر آمادہ کیا جائے تاکہ ان کی نظر میں وسعت اور روشنی پیدا ہو، اور وہ انگریزوں سے قریب آئیں، انگریز حکومت کی ملازمت اور ان آزاد پیشوں میں حصہ لے سکیں جن کے لیے اب انگریزی تعلیم لازمی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ کم سے کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حکومت کا وفادار بنایا جائے۔ چنانچہ نواب عبداللطیف نے علماء سے جن میں وہابی تحریک کے ایک ممتاز رہنما مولوی کرامت بھی شامل تھے یہ فتوے حاصل کیے کہ ماتحت ہندوستان دارحرب نہیں ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے، (بحوالہ، ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ص ۳۵)

-24 ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، ص ۳۵

-25 سراج الدین، منشی (۱۸۹۰ء) ''لیکچروں کا مجموعہ'' ۔ آگرہ، مطبع مفیدِ عام، ص ۲۴۴

-26 حالی، الطاف حسین۔ (۱۹۸۶ء) ''حیات جاوید'' پاکستان میں اشاعت نو، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ص ۳۴۰

-27 اسمٰعیل پانی پتی، شیخ۔ (۱۹۵۹ء) ''مکتوباتِ سرسیّد''، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۱۸۸

-28 نظامی، خلیق احمد، پروفیسر۔ (جنوری ۱۹۶۶ء)، ''تاریخی مقالات'' اشاعت اوّل، دہلی: ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، ص ۲۸۹

-29 منگلوری، طفیل احمد۔ محولہ بالا، ص ۲۰۹

-30 مودودی، نشان راہ، محولہ بالا، ص ۲۴۔ ۲۵ حواشی ۲۹ جب انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم و سیاسی تصورات سے ہندوستانی قومیت کی بنیاد پڑ رہی ہے تو خود ہی اس بات کی

کوشش کی کہ ہندوستانیوں کی کوئی ایسی تنظیم وجود میں آجائے جوان کے زیر اثر اور ماتحت ہو، کیونکہ مختلف علاقوں میں ہندوستانیوں کی ایسی ایشن مثلاً بنگال میں انڈیشن ایسوی ایشن، مدراس میں مہاجن سبھا قائم ہو چکی تھی، چنانچہ مسٹر ہیوم نے ہندوستانی انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو ایک تنظیم قائم کرنے کا مشورہ دیا اور ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔ (بحوالہ: چراغِ راہ، نظریۂ پاکستان نمبر ص ۱۷۴)

-31 مسلمانوں کا روشن مستقبل، محولہ بالا، ص ۲۸۴۔ ۲۸۵

-32 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان، جلد اوّل، محولہ بالا۔ ص ۲۵۶

-33 پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد۔ محولہ بالا، ص ۵۲

-34 چراغِ راہ۔ (دسمبر ۱۹۶۰ء) ''نظریۂ پاکستان نمبر'' مرتب، خورشید احمد، کراچی: ادارہ چراغِ راہ، ص ۱۸۰

-35 قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر۔ (۱۹۸۷ء)، ''جدوجہد پاکستان'' اشاعت دوم، ترجمہ، زبیری، ہلال احمد، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ص ۴۵

-36 حسن ریاض، سیّد۔ (۱۹۹۲ء)، پاکستان ناگزیر تھا، اشاعت ششم، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ص ۶۲

-37 حواشی۔ ترکوں نے صلیب احمر کے جواب میں ہلال احمر کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی تقلید میں ہندوستان کے ہر شہر میں ہلال احمر کمیٹیاں قائم ہوگئیں۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں جب وفد انصاری کے لیے چندہ کی اپیل کی تو مسلمانوں نے کس طرح لبیک کہا اسے میر محفوظ علی کی زبانی سنیے جو مولانا محمد علی کے ساتھی اور کامریڈ کے منیجر تھے۔ وہ فرماتے ہیں ''اپیل نے کامریڈ کے دفتر میں روپوں کی بارش کر دی۔ کامریڈ کی فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے موصول ہوئے ہیں اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شَل ہو گیا۔ یہی حال مولانا ظفر علی خان کے شہرۂ آفاق اخبار روزنامہ زمیندار کا تھا''۔ (بحوالہ تحریک خلافت، قاضی عدیل عباسی، ص ۳۴)

38- نہرو، جواہر لال۔ فروری ۲۰۰۳ء۔ تلاش ہند لاہور: تخلیقات مزنگ روڈ، ص ۲۲۵

39- پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد، محولہ بالا، ص ۹۸

40- ایضاً، ص ۹۹

41- پاکستان ناگزیر تھا، محولہ بالا۔ ص ۶۴

42- پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد، محولہ بالا ص ۱۰۰

43- ایضاً، ص ۱۰۱۔

حواشی۔ ۴۳۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) کے فوراً بعد برصغیر کی سیاست میں جو اصطلاح رواج پائی۔ وہ ہندوستانی قومیت (انڈین نیشنلزم) اور ہندوستانی قوم پرستی کی اصطلاح تھی۔ اس اصطلاح کے مطابق برصغیر کے تمام باشندے ہندوستانی تھے۔ یہ اصطلاح آل انڈیا کانگریس کی اصطلاح تھی اور اس کی مدد اور تائید سے کانگریس سارے برصغیر کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی تھی۔
(بحوالہ قائداعظم اور آزادی کی تحریک، پروفیسر جیلانی کامران، ص ۳۲)

44- حواشی۔ الف خلافت کمیٹی کے ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی، ان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی۔ لیکن جیسا متوقع تھا وائسرائے نے برطانوی حکومت کے رویے اور اس کی پالیسی کو معقول قرار دیا۔ اور مسلمانوں کی بے چینیوں کو بے بنیاد اور جو کچھ پیش آ چکا تھا اسے ترکی کی غلط پالیسی اور رویے کا ناگزیر ردعمل قرار دیا۔ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق وائسرائے نے یادداشت کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اگر مسلمانوں کا کوئی وفد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے بھیجا جائے تو حکومت وفد کو لندن جانے کے سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کرے گی، لیکن خود انہوں نے کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کر دی، (بحوالہ ہماری آزادی، ابوالکلام آزاد۔ ص ۹)
حواشی ب۔ ۴۴۔ یہ پہلا دھکہ تھا جو مسلمانوں کو لگا اور جو امیدیں حکومت برطانیہ کی وفادار مسلم رعایا نے ہز ایکسیلینسی حضور وائسرائے دام اقبالہٗ کی ذات بابرکت سے وابستہ کی تھیں وہ سب خاک میں

مل سیں۔ سیلن صدیوں کی پالی ہوئی غلط تمنائیں اور نارسا امیدیں کب ساتھ چھوڑتی ہیں چنانچہ جو وفد مرتب ہوا اس کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان، سید حسن، مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالقاسم اور سیکریٹری حسن محمد حیات منتخب ہوئے۔ (بحوالہ تحریکِ خلافت، قاضی عدیل عباسی۔ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰)

45- عباسی، قاضی محمد عدیل۔ (۱۹۹۷ء) تحریکِ خلافت اشاعت دوم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص ۱۶۔ ۱۷

حواشی، الف۔ ۴۵۔ مولانا ابوالکلام نے خلافت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے واضح کیا کہ ''اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحبِ حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔ صدیوں سے اسلامی خلافت کا نصب العین سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہوا۔ اور اس وقت از روئے شریعت تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی۔ جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا، اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔ اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا مسئلہ نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی، یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا، پس اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا اولین فرض ہوگا کہ یہ اس قبضے کو وطن سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔

اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرم شریف۔ اس لے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جان کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں، پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں نہ جانے دیں۔ علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہو گا بلکہ بیک وقت تمام مسلمانانِ عالم کا فرض ہو گا۔

(بحوالہ: مسئلہ خلافت، ابوالکلام آزاد، ص ۲۸۳ سے ۲۸۶)

حواشی ب ۴۵۔ تحریک خلافت میں متعدد مسلمان رہنماؤں اور علماء نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے بڑے بڑے جید علماء اعلیٰ درجے کے سیاستدان اور بے بدل مقررین بڑے پر جوش انداز میں سرگرم عمل ہو چکے تھے کہ اسی دوران ہندوؤں نے ''سوراج'' یعنی آزادی کی تحریک شروع کر دی۔ اسی سوراج کے حوالے سے ہندوؤں اور ہندو لیڈروں نے تحریکِ خلافت کے سائے میں مسلمانوں کا ساتھ دینا شروع کر رکھا تھا۔ ساتھ ساتھ ان کی تحریک سوراج بھی چل رہی تھی۔ کانگریس نے اپنی پالیسیوں کے حوالے سے مسلم لیگ کے ساتھ خاص ہم آہنگی پیدا کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ امر اچھنبے سے مبرا نہیں تھا کہ ہندو اور کانگریسی لیڈر تحریک خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ بلکہ اسی دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ متحدہ ہندوستان کے مطالبے پر متفق ہو گئیں۔ (بحوالہ اکابرینِ تحریک پاکستان، چراغ علی، ص ۶۵۷)

-46 قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت۔ محولہ بالا ص ۱۳۱

حواشی۔ ۴۶۔ ب۔ ترک موالات کی اسکیم یہ تھی کہ حکومت سے ہر طرح کا عدم تعاون کیا جائے، گورنمنٹ کے خطابات واپس کر دیے جائیں۔ عدالتوں، درسگاہوں کا مکمل بائیکاٹ ہو، ہندوستانی تمام نوکریوں سے استعفیٰ دے دیں اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ماتحت جو قانون ساز ادارے بننے والے ہیں ان میں کوئی حصہ نہ لے۔ (بحوالہ قاضی عدیل عباسی، تحریکِ خلافت ص ۱۳۱)

حواسی۔ الف ۴۶۔ امرتسر میں خلافت کمیٹی، کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس منعقد کیے جس میں مسٹر گاندھی نے جو ایک ہوشیار سیاستدان تھے اور واقعات اور حالات کے نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے تھے یہ محسوس کیا کہ اگر تحریکِ خلافت کامیاب ہوگئی تو اس سے مسلمانوں کا وقار بڑھ جائے گا اور کانگریس نے ہندو اکثریت کے اقتدار کے لیے جو بنیادیں استوار کی ہیں وہ منہدم ہو جائیں گی، چنانچہ مسٹر گاندھی نے علی برادران کے ساتھ مل کر ملک میں تحریک عدم تعاون چلانے کا فیصلہ کیا۔ بظاہر یہ تحریک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے مقصد کے تحت چلائی گئی تھی لیکن اصل مقصد اس تحریک کا یہ تھا کہ تحریکِ خلافت کو سبوتاژ کیا جائے۔ تحریکِ عدم تعاون کا اگر ایک مقصد انگریز کانگریس کے سیاسی وقار کو نمایاں کرنے اور اسے پریشان کرنا تھا تو دوسری طرف خلافت کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے وقار کو ختم کرنا تھا۔ (بحوالہ پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد۔ محولہ بالا ص ۱۰۶)

-47 عباسی، قاضی محمد عدیل۔ تحریک خلافت، محولہ بالا ص ۱۵۶۔ ۱۵۷

-48 ایضاً، ص ۱۷۵

حواشی ۴۸۔ الف۔ تحریکِ خلافت نے ہندوستان کی سیاست اور تحریک آزادی میں ایک شدید جوش اور ولولہ پیدا کر دیا، مسلمانوں نے اس وقت محسوس کیا تھا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوگیا تو دیگر مسلم ممالک میں بھی آزادی کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جائے گا اور وہ بھی ایک مرحلے پر آزاد ہوسکیں گے۔ یہ ایک بنیادی مقصد تھا جس نے انہیں تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ تحریکِ خلافت کے مقصد سے برعظیم کے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا اور اس میں عمل و قربانی کی ایک تازہ روح ڈال دی۔ وہ اس میں شدومد سے حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب حکومت سے عدم تعاون اور ترک موالات کا منصوبہ بنایا گیا تو مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (بحوالہ، ستیارام، پٹا بھائی، تاریخ کانگریس۔ جلد اوّل ص ۲۰۲)

حواشی ۔ ۴۸ ب۔ مسلم لیگ اگرچہ تحریک خلافت و ترک موالات کی مخالف نہیں تھی۔ مگر یہ نوابوں، تعلقداروں اور سرمایہ داروں کی جماعت۔ اس کے اراکین کوئی عملی حصہ نہیں لے رہے تھے اور اصلیت تو یہ تھی کہ خلافت کمیٹی نے مسلم لیگ کو عضو معطل بنا دیا تھا۔ (بحوالہ عباسی، قاضی محمد عدیل، تحریک خلافت۔ ص ۲۷۳)

حواشی ۴۸۔ ج۔ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانانِ ہند سول نافرمانی کر کے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیں اور احمد آباد کے کانگریس سیشن میں انڈین ری پبلک کا جھنڈا اڑائیں گے۔ انہوں نے مسلمان سپاہیوں کو ہدایت دی وہ انگریزی فوج میں شریک نہ ہوں اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی کانفرنس ختم ہونے پر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے علاوہ شرکائے جلسہ جنہوں نے اس اعلان کی تائید کی تھی۔ ڈاکٹر کچلو، شنکر اچاریہ، مولانا نصیر احمد، پیر غلام مجدد اور مولانا حسین احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

ہندوستان میں ان گرفتاریوں نے سنسنی پھیل گئی اور ہر شخص کے دل میں جیل جانے کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ ستمبر کو گاندھی جی نے مسلمانوں کو ہدایت کرتے ہوئے کہا ''ہم عدم تشدد کی پالیسی پر چلیں گے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم بالکل مجہول ہو جائیں، ہم کو علی برادران کے اس اصول کی جو انہوں نے سپاہیوں کے فرائض کے متعلق بیان کیے برملا تائید کر کے جیل کو دعوت دینی چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ بغیر ان کے لڑائی جاری رکھی جا سکتی ہے کیونکہ یہ اگر صحیح ہے تو نہ ہم سوراج حاصل کر سکتے ہیں اور نہ خلافت کو بچا سکتے ہیں۔ (بحوالہ، خلیق الزمان، چوہدری، شاہراہ پاکستان۔ ص ۳۸۹)

حواشی ۴۸۔ د۔ مشہور اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیدکر لکھتے ہیں۔ تحریکِ خلافت کی جو تائید کانگریس نے کی اس کا اثر کانگریس کی ابعاد ثلاثہ پر بہت زبردست پڑا۔ کانگریس کو حقیقتاً عظیم اور طاقتور بنانے والے ہندو نہیں تھے، مسلمان تھے۔ (بحوالہ قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر۔ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔ (ص ۳۷۱)

حواشی ۔ ۴۸۔ س۔ تحریکِ خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج

کے لیڈر سوامی شردھانند نے جامع مسجد کے منبرہ پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور مسلمانوں نے ذوق و شوق سے ان کو ایسا کرنے دیا۔ اس کے بعد جلوس نکلا اور چاندنی چوک پہنچا تو وہاں گورکھا فوجوں کی سنگینوں کے سامنے سوامی جی نے اپنا سینہ کھول دیا۔ اس واقعہ کی شہرت عام ہوئی اور تمام ہندوستان جوش سے دیوانہ ہوگیا۔ (بحوالہ، عباسی، قاضی محمد عدیل، تحریک خلافت، ص ۸۴)

49- ''اردوئے معلیٰ'' (مئی ۱۹۱۳ء) جلد ۱۴، نمبر ۵، ص ۱ (ضمیمہ)

50- خورشید احمد، (دسمبر ۱۹۷۲ء)، ادبیاتِ مودودی، اشاعت اوّل، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ا

51- علی، نقی۔ فروری ۱۹۸۰ء، سیّد مودودی کا عہد، لاہور: البدر پبلیکیشنز، اردو بازار، ص ۱۵

52- یوسف، محمد۔ (نومبر ۱۹۵۵ء) ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں'' نمبر اشاعت، لاہور: البدر پبلیکیشنز اردو بازار، ص

حواشی۔ ۵۲۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں ''تحریکِ خلافت کے دور شباب میں مولانا نے تین انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا، میرے علم کی حد تک یہ ترجمہ مولانا کی وہ پہلی علمی اور ادبی کاوشیں ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ افسوس کہ یہ کتابیں اب ناپید ہیں۔ خاصی تلاش وجستجو کے بعد انڈیا آفس لائبریری سے ان میں سے ایک ''ترکی میں عیسائیوں کی حالت'' کی نقل حاصل کر سکا ہوں۔ دوسری کتابوں کا نام ''سمرنا میں یونانی مظالم'' اور ''مسئلہ خلافت'' ہیں۔ مگر میں ان کو ابھی تک حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ یہ تینوں کتابیں دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ نے ۱۹۲۲ء میں شائع کی ہیں۔ (بحوالہ، ادبیات مودودی، ص ۱۶۔ ۱۷)

53- عبد، عبدالرحمٰن، چوہدری۔ (جولائی ۱۹۸۸ء) ''مفکرِ اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودی'' اشاعت سوم، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ، ص ۶۵

54- رضا، سیّد ولی۔ (۱۹۹۹ء) مودودی اور جماعت اسلامی، اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے معمار، ایڈیٹر علی رہنما، لاہور: تخلیقات، ص ۱۳۳

55- آفاقی، علی سفیان۔ (۱۹۵۸ء) ''ابوالاعلیٰ مودودی'' اشاعت دوم، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ص ۶۴

56- ایضاً

57- سلیم، سیّد محمد، پروفیسر۔ صفت برق چمکتا ہے، تیر افگر بلند، تذکرہ، سیّد مودودی، ص ۱۹۱۔ جلد ۲ محولہ بالا

58- مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ محولہ بالا۔ ص ۶۶

59- ایضاً

60- جدوجہد پاکستان، ص ۵۳، محولہ بالا

61- تحریکِ خلافت، ص ۲۵۴۔ محولہ بالا

62- مودودی اور جماعت اسلامی، ص ۱۳۴، محولہ بالا

63- علی نقی، سیّد مودودی کا عہد ص ۱۵، محولہ بالا

64- برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، ص ۳۶۲

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، موبلا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ موبلا مسلمانوں کی ایک برادری ہے جو اسلامی تاریخ کے آغاز ہی سے مالابار میں رہتی چلی آ رہی ہے۔ ان کے اجداد عرب سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ (بحوالہ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ)

65- خلیق الزماں، چوہدری، (اپریل ۱۹۸۷ء)، شاہراہ پاکستان، کراچی: انجمن اسلامیہ پاکستان، ص ۴۰۰ حواشی۔ ۶۵ الف۔ تحریک عدم تعاون گاندھی جی نے پنڈت مدن موہن مالویہ کے شدید دباؤ کے تحت بند کی۔ پنڈت مدن موہن انتہائی متعصب اور تنگ نظر مہا سبھائی لیڈر تھے۔ وہ کانگریس میں بھی شامل تھے اور انہیں کانگریس میں مقتدر حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے گاندھی جی اور دیگر ہندو کانگریسی لیڈروں کے قلوب میں یہ خطرہ پیدا کر دیا کہ اگر تحریکِ عدم اعتماد اور تحریک خلافت کے اشتراک کی وجہ سے انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تو انگریز کے چلے جانے کے بعد مسلمان افغانستان، ایران اور ترکی کی مدد سے ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔ اور ہندوؤں

نے برطانوی اقتدار میں ہندو اکثریت کی حکومت کا جو خواب دیکھا تھا وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا، اور ہندو ڈیڑھ صدی کے بعد پھر مسلمانوں کے غلام بن جائیں گے (بحوالہ پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد۔ص ۱۵۹)

حواشی ۶۵ ب۔ دوسری جانب حکومت برطانیہ کے مفادات بھی ہندو مسلم اختلافات سے وابستہ تھے۔ برطانوی حکومت جس کی بنیادیں ان قومی تحریکوں کی وجہ سے متزلزل ہو رہی تھیں۔ قدامت پسند اور سرکار پسند ہندوؤں کی وساطت سے پنڈت مالویہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس خطرہ کا احساس گاندھی جی کو دلائیں اور انہیں مجبور کریں کہ تحریک عدم اعتماد کو بند کر دیں۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے فروری ۱۹۲۲ء میں تحریک عدم تعاون کو ختم کر دیا۔ (بحوالہ ایضاً ص ۱۱۰)

حواشی ۶۵ ج۔ گاندھی جی نے چوری چورا کے حادثے کی وجہ سے عدم تعاون کی تحریک کو معطل کر دیا۔ سیاسی حلقوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوگئی۔ حکومت نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ انہیں چھ برس کی سزا دی گئی اور عدم تعاون کی تحریک دم توڑ گئی۔ (بحوالہ آزاد، ابوالکلام، انڈیا ونس فریڈم، ص ۹۵)

-66 خلیق الزماں، چوہدری، ''شاہراہ پاکستان'' محولہ بالا ص ۴۰۰۔۴۰۱

-67 محمد یوسف ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں'' محولہ بالا، ص ۱۷۰۔۱۷۱

-68 ایضاً، ص ۱۷۱

-69 ایضاً، ص ۱۷۲

-70 عبدالباقی، رانا۔ ستمبر (۲۰۰۴ء)، ''جنوبی ایشیا میں تہذیبی کشمکش، ایک تجزیاتی جائزہ'' نمبر اشاعت راولپنڈی: عبدالقادر پبلیکیشنز، ص ۲۷

حواشی ۷۰ الف۔ ۱۹۲۱ء میں ہندو مہا سبھا قائم ہوئی ہندو مہا سبھا کے اہم لیڈر لالہ جیت رائے اور پنڈت مدن موہن مالویہ جو ہندو یونیورسٹی بنارس کے بانی کے طور پر مشہور ہوئے تھے۔ مسلمان

مخالفت کی وجہ سے ہندوؤں میں گاندھی جی کی طرح مقبول تھے۔ سنگھٹن کی تحریک ہندو مہا سبھا کا منصوبہ تھی۔ جس کا آغاز ڈاکٹر مونجے نے ۱۹۲۳ء میں کیا۔ (بحوالہ ایضاً)

حواشی ۰۷ ب۔ سنگھٹن کے معنیٰ ہیں ایک ساتھ جوڑ کر مضبوطی سے باندھنا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو اچھی طرح منظم قوم بنا دیا جائے تا کہ وہ مضبوط ہو جائیں۔ اور کسی فوری ضرورت کے وقت صورتحال سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ چنانچہ ہندوؤں کو ایسے اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی گئی جو مسلمانوں کے خلاف فسادات میں بروقت کام آ سکتے تھے۔ مثلاً لاٹھیاں، اینٹوں کے ٹکڑے اور بنوٹ، اس کے ساتھ ساتھ مسلم دکانداروں، دست کاروں اور کاریگروں کا معاشی مقاطعہ شروع کر دیا گیا، (بحوالہ برصغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ۔ ص ۳۶۳۔۳۶۴)

حواشی ۰۷ ج۔ ڈاکٹر مونجے کے علاوہ لالہ ہردیال نے بھی ہندو سنگھٹن کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ لالہ ہردیال ہندوؤں کی فوری روایات پر مبنی ہندو ریاست قائم کرنے کے حامی تھے۔ جس میں سنسکرت، ہندی زبان، ہندو میلوں کے فروغ، ہندو قومی مشاہیر کا احترام، ہندوؤں کے مقدس مقامات اور ثقافت سے محبت اور مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنانا شامل تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمان ہندوؤں کی رسومات کو اپنا لیں اور ہندو اکابرین کا احترام کریں اور اپنے آپ کو محمڈن ہندو کہلائیں تو انہیں ہندو ریاست میں رہنے کا حق دیا جا سکتا ہے۔ (بحوالہ جنوبی ایشیاء میں تہذیبی کشمکش، ص ۶۳

حواشی ۰۷ الف۔ شدھی کے معنی پاک کرنے کے ہیں۔ یہ تحریک سوامی شردھانند نے شروع کی تھی جس کا مقصد نومسلموں کو واپس ہندو مذہب پر لانا تھا۔ (بحوالہ برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ ص ۳۶۵)

حواشی ۰۷ د۔ شدھی کی تحریک بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی، اس میں ہندو اپنی عددی برتری اور اکثریت کے باعث مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو پاک کر کے اپنے دھرم میں شامل کرنا چاہتے تھے، (بحوالہ چراغِ راہ، نظریۂ پاکستان نمبر ص ۱۸۶)

حواشی ۷۰ س۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں بابو رام موہن رائے نے دہریت کا مقابلہ کرنے کے لیے یا عیسائی مشن کی سرگرمیوں سے اپنی قوم کو بچانے کے لیے معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کی ایک تحریک شروع کی تھی اس سے برہمو سماج پیدا ہوا۔ بابو رام موہن رائے کے بعد کیشب چندر رائے نے اس کو اور زیادہ آگے بڑھایا، بنگال کی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسی ہی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پونا میں پراتھنا سماج، اس کے لیڈر ایم جی راناڈے تھے۔ شمالی ہند میں آریہ سماج، مدراس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی۔ تمام قرائن اس کی تائید میں ہیں کہ آریہ سماج ہندوؤں کی سازش سے وجود میں آیا اور انگریزوں ہی نے سوامی دیانند سرسوتی کی شخصیت کی تعمیر کی۔ ورنہ وہ متھرا میں ایک ذہین طالب علم تھے۔ آریہ سماج کی تقویت اور ترقی میں تھیوسوفیکل سوسائٹی نے انا کی خدمت انجام دی۔ آریہ سماج ابتدا سے جارحانہ انداز میں اسلام کے خلاف ہے۔ سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے اسی کے دو بڑے لیڈر تھے۔ عرصے بعد سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر کے اس ہندو مسلم اتحاد کو تباہ کیا جو تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کے زمانے میں بڑی کوشش سے ترقی کی کئی ابتدائی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اور لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی تحریک شروع کر کے فرقہ وارانہ ہنگاموں کے لیے ہندوؤں میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ (بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۴۹۔۵۰)

71- پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد۔ محولہ بالا ص ۱۱۰

72- حسن ریاض، سیّد۔ ۱۹۹۲ء ''پاکستان ناگزیر تھا'' اشاعت ششم، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ص ۱۵۱

73- جعفری، رئیس احمد۔ (دسمبر ۱۹۶۳ء)، سیرت محمد علی، لاہور: محمد علی اکیڈمی، ص ۴۱۴

74- ستیارامیہ، بی پٹاھی، ڈاکٹر۔ سنہ اشاعت ندارد ''تاریخِ کانگریس''، ا، دہلی: انڈین بک کمپنی، چرچ روڈ کشمیری گیٹ، جلد اوّل، ص ۲۹۸

کتاب انتہائی حستہ ہے۔ اردو ترجمہ میں تاریخ اشاعت نہیں ہے۔ یہی انگریزی میں یہ
A History of National Congress کے نام سے بمبئی سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔

75- ایضاً ۲۷۶

76- خلیق الزماں، چوہدری۔ شاہراہ پاکستان، ص ۴۴۰۔۴۴۱

77- ستیا رامیہ، تاریخ کانگریس۔ محولہ بالا، ص ۲۶۷

78- ایضاً

79- عبد، عبدالرحمٰن۔ ''مفکر اسلام سیّد مودودی''۔ ص ۴۷

80- مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد۔ (اپریل ۱۹۹۳ء) ''آفتاب تازہ'' اشاعت اوّل، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۲۳۔۲۴

81- تذکرہ، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۱۵۵

82- جعفری، رئیس احمد۔ (۱۹۸۷ء) ''دیدوشنید'' اشاعت ثانی، کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی، ص ۵۶

83- مودودی اور جماعت اسلامی۔ ص ۱۳۵، محولہ بالا

84- مراد، خرم۔ ''قرآنی پیغام کی ترجمانی، سیّد مودودی کی زبانی'' تذکرہ سیّد مودودی، (اکتوبر ۱۹۹۸ء)، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، جلد ۳ ص ۲۶۵

85- غلام محمد، چوہدری۔ تاریخِ جماعت اسلامی، تاسیسی پس منظر، تذکرہ، سیّد مودودی، اکتوبر ۱۹۹۸ء، لاہور: ادارہ معارف اسلامی جلد ۲، ص ۴۷۳

86- خالد، سلیم منصور، (س ن)، وثائق مودودی، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۵۷۔۵۸

87- تاریخ جماعت اسلامی، تاسیسی پس منظر، ص ۴۹۲

حواشی ۸۷۔ ۱۹۳۰ء میں بمبئی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے جن کی تمام زندگی کانگریس کے لیے کام کرتے، دکھ اٹھاتے اور صعوبتیں برداشت کرتے گزری تھی

اپنے جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا۔ "گاندھی فرقہ پرست مہا سبھائیوں میں چھپے گئے ہیں۔ اور اب وہ ہندو دھرم کے غلبے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں تا کہ ہندو دھرم کا غلبہ ہو اور مسلمان اس غلبے میں غرق ہو جائیں۔ سول نافرمانی کرتے وقت بھی انہوں نے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ فاتحانہ انداز میں مسلمانوں کے اوپر چھا جائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی جبری تبدیلیٔ مذہب پر ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ جبری تبدیلیٔ مذہب کا عمل برصغیر برصغیر میں مسلمانوں کی ہلاکت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ انہوں نے دیدہ و دانستہ ہندو مسلم سمجھوتے کو توڑ دیا اور اب ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے کہ ہم پچھلے سمجھوتے انہی وعدہ شکنوں کے منہ پر واپس مار دیں"۔ (قائداعظم کی تحریک۔ پروفیسر جیلانی کامران۔ ص ۴۶۔۴۷)

88- ''برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ'' محولہ بالا، ص ۳۷۱۔۳۷۲

89- ایضاً

90- ''ترجمان القرآن'' مولوی ابو مصلح حیدرآباد دکن سے نکالتے تھے۔ سیّد مودودی نے ان سے یہ پرچہ خرید لیا اور اسی نام سے اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔

91- سیّد مودودی کا عہد، تقریر، ص ۲۵

92- جعفری، رئیس احمد، دید وشنید، محولہ بالا، ص ۵۶

93- سرور، محمد۔ (مئی ۱۹۵۶ء)، مولانا مودودی کی تحریک اسلامی نمبر اشاعت ندارد، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ص ۱۹

94- عقیل، معین الدین، ڈاکٹر۔ (۱۹۸۶ء) اقبال اور جدید دنیائے اسلام، طبع اوّل، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، ص ۳۶۳

95- فاروقی، ابوراشد۔ (جولائی ۱۹۷۷ء) اقبال اور مودودی، طبع اوّل، لاہور: مکتبۂ تعمیر انسانیت، ص ۲۰

-96 ...منظرِ اسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودی محولہ بالا، ص ۱۳۱

-97 وثائق مودودی، ص ۸۳

-98 مودودی اور جماعت اسلامی، ص ۱۳۷

-99 ''چراغ راہ، تحریک اسلامی نمبر'' ص ۲۹۹

-100 علماء میدان سیاست میں، ص ۴۱۷

-101 ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس، ملک کی گیارہ ریاستوں میں سے آٹھ میں برسراقتدار آئی تھی۔
(بحوالہ انڈیا ونس فریڈم۔ ابوالکلام آزاد، ص ۴۷)

-102 تاریخ جماعت اسلامی، تاسیس پس منظر ص ۴۹۳ تذکرہ سیّد مودودی، جلد ۲، محولہ بالا

-103 مودودی، ابوالاعلیٰ۔ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، جلد اوّل، محولہ بالا، ص ۲۱۷۔ ۲۱۸

-104 ایضاً

-105 ایضاً

-106 پیرزادہ، شریف الدین۔ (اگست ۱۹۶۵ء)، پاکستان منزل بہ منزل، طبع اوّل، کراچی: گلڈ اشاعت گھر، ص ۲۴۲

-107 حواشی۔ گول میز کانفرنسوں کے فوراً بعد گاندھی نے ہندوستان گیر منصوبہ بندی کی ابتدا کی۔ اور اپنے طرز کے اداروں کو قائم کیا۔ (۱) گاندھی آشرم (۲) گاندھی سیوا سنگھ (۳) گاندھی ہریجن سیوا سنگھ (۴) گاندھی ہندی پرچار سنگھ (۵) گاندھی ناگری پرچار سنگھ (۶) گاندھی گرام سدھار سنگھ (۷) گاندھی کھری پراستان (۸) گاندھی واردھا تعلیمی سنگھ (۹) گاندھی گنور کھشا سبھا۔ یہ ایسے ادارے تھے جو گاندھی کی سیاسی فکر کی تبلیغ اور استحکام کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۹ء کے دوران اور صوبائی خودمختاری کے ہندو اکثریتی صوبوں میں ان اداروں کی کارگزاری اس زمانے کا غالباً ایک بے حد بھیانک باب ہے۔ حقیقت میں ان اداروں کے ذریعے ہندو سیاسی فکر اپنے

نیشنلزم کو ایک ملک گیر نظام میں بدلنا چاہتا تھا، (بحوالہ قائد اعظم اور آزادی کی تحریک۔ ص ۵)

108- چراغ، محمد علی۔ (۲۰۰۳ء)، ''اکابرینِ تحریک پاکستان''، سنگ میل پبلیکیشنز، ص ۶۲ ۷

109- مودودی، تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان، محولہ بالا ص ۴۲۷

110- ایضاً، ص ۴۲۸

111- ایضاً، ص ۴۳۲

112- ایضاً، ۴۳۶

113- ایضاً، ۴۳۹

114- ایضاً، ص ۴۴۰

115- مودودی اور جماعت اسلامی، ص ۱۳۷

116- علماء میدانِ سیاست میں، محولہ بالا، ص ۴۱۶

117- ایضاً، ۴۲۱

118- ایضاً، ۴۲۰ ان مطابقتوں کا مطلب یہ تھا کہ اکثریت کے طرزِ زندگی اور طور طریقوں سے مکمل مماثلت پیدا کر لیں۔

119- ایضاً

حواشی۔ ۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کی اس منطق کو بڑی شد و مد سے ٹھکرا دیا تھا کہ قومیں اوطاق سے نہیں بنتیں بلکہ قوموں کی تشکیل ادیان سے ہوتی ہے۔ اس واضح نظریے کے بعد سے تو تحریک پاکستان کی جدوجہد میں لاتعداد علمائے حق نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کی حمایت کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ اور الگ وطن پاکستان نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ (بحوالہ۔ اکابرینِ تحریک پاکستان، ص ۸۱۶، محولہ بالا)

120- علماء میدانِ سیاست میں۔ ص ۴۲۶

121- ایضاً

122- ایضاً، ص ۴۲۷

123- مولانا مودودی کی تحریک اسلامی۔ محولہ بالا ص ۲۲۔۲۳

124- اکابرینِ تحریکِ پاکستان، ص ۶۲، ۷، محولہ بالا

125- قائداعظم اور آزادی کی تحریک، ص ۹۰، محولہ بالا

126- آزاد، ابوالکلام۔ (س ن) ہماری آزادی، لاہور: طیب پبلشرز، ص ۱۰۳

127- ''برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ'' ص ۳۸۳، محولہ بالا۔

حواشی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی، حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی مرضی معلوم کیے بغیر اسے جنگ میں جھونک دیا۔ کانگریس کے خیال میں یہ ہندوستان کی کھلی توہین تھی کہ اس کا منشاء معلوم کیے بغیر برطانوی حکومت نے اسے شریکِ جنگ قرار دے دیا۔ اور اس کے وسائل کو جنگ کے لیے استعمال کیا، کوئی خوددار اور آزادی پسند قوم ایسے رویے کو برداشت نہیں کر سکتی، نتیجتاً کانگریس وزارتوں سے مستعفی ہوگئی۔ (بحوالہ آزاد، ابوالکلام، انڈیا ونس فریڈم ص ۱۱۱ محولہ بالا)

128- جدوجہد پاکستان، ص ۲۰۹، محولہ بالا

129- برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ۔ ص ۳۸۸ محولہ بالا

130- تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان، جلد اوّل ص ۲۵۔۲۶ مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۱۹۹

131- پاکستان منزل بہ منزل، ص ۲۷۹، حواشی۔ جب مسٹر راج گوپال اچاریہ نے مسلمانوں کے حق خود ارادی کو تسلیم کرنے کے لیے کانگریس کو راغب اور ہموار کرنے کی کوشش کی تو گاندھی نے اعلان کیا کہ میں ہندوستان کی چیر پھاڑ کو ایک گناہ سمجھتا ہوں، (بحوالہ ایضاً)

132- قائداعظم اور آزادی کی تحریک، ص ۱۰۴ محولہ بالا حواشی۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا مقصد پورے برصغیر کو کانگریسی قیادت کے لیے حاصل کرنا تھا۔ اور اگست ۱۹۴۲ء میں اس تحریک سے مراد برطانیہ

ے خلاف عام بغاوت پھیلانا تھا، (بحوالہ بالا ایضاً ص ۹۵)

حواشی۔ انڈین نیشنل آرمی، سبھاش چندر بوس نے قائم کی تھی اس کی ابتدا دسمبر ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ لیکن جنوری ۱۹۴۲ء میں آزاد ہند فوج کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کا ہیڈ کوارٹر جرمنی میں تھا۔ (بحوالہ ایضاً ص ۱۲۲)

133- تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان۔ص ۳۳۔۳۴ محولہ بالا

134- چراغِ راہ، تحریک اسلامی نمبر۔ص ۸۷

135- ''رودادِ جماعت اسلامی'' (س ن) مرتبہ، شعبۂ تنظیم جماعت، جمال پور: مکتبۂ جماعت اسلامی دارالاسلام، سن اشاعت ندارد، ص ۴، حصہ اوّل

136- ایضاً، ص ۱۳

حواشی الف۔ جماعت اسلامی سے قبل ۳۴۔۱۹۳۰ء میں علامہ عنایت اللہ مشرقی ''خاکسار تحریک'' قائم کر چکے تھے۔ علامہ مشرقی مغربی علوم کے ماہر تھے اور ریاضی میں جرمنی سے امتیازی سند حاصل کر چکے تھے۔ جرمنی میں حصولِ تعلیم کے دوران ہی انہوں نے ہٹلر کی نازی پارٹی کو قائم ہوتے اور ایک زبردست سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھرتے دیکھا۔ آگے چل کر انہی خطوط پر ''خاکسار تحریک'' اٹھائی۔ بحوالہ، پوری، آبادشاہ۔ ''تاریخ جماعت اسلامی'' ۱۹۸۹ء اشاعت اول، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، حصہ اوّل، ص ۱۴۶

حواشی ب۔ خدائی خدمت گار یا سرخ پوش تحریک، یہ تحریک خان عبدالغفار خان نے ۱۹۲۹ء میں قائم کی تھی۔ ان کی اپنی دینی اور دنیاوی تعلیم بہت زیادہ نہ تھی، خدمت کا جذبہ اور قائدانہ صلاحیت موجود تھی۔ خدائی خدمت گار تحریک انگریزوں کے مقابلے میں پٹھانوں کو منظم کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ فی سبیل اللہ خدمت عوام، سادہ دل اور جذبہ دین والے پٹھانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ انگریزوں نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھ کر اس کو کچلنے کی کوشش کی۔ بے گناہوں کا

خون بہا لو اس تحریک لے پر جوش نو جوان سرخ پوش بن گئے۔ (بحوالہ۔ سی سی، سید مودودی کا عہد، ص ۲۷۵، محولہ بالا)

137- روداد جماعت اسلامی، ص ۷ا محولہ بالا، حواشی۔ الف۔ منصب امارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد مودودی صاحب نے کہا ''میرے لیے یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے، میرا مرنا اور جینا اس کے لیے ہے، کوئی اس پر چلنے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو بہر حال مجھے تو اس راہ پر چلنا اور اسی راہ میں جان دینا ہے، کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا، کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا، ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہیں ہے''۔ (بحوالہ ایضاً) حواشی ۱۳۷ ب۔ سیّد ولی رضا کے مطابق مسلمانوں کی ایک نئی تنظیم کا قیام، مولانا مودودی کے منصوبوں کا حصہ تھا۔ جس میں سے ایک یہ تھا کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا حل تلاش کیا جائے، ان منصوبوں کی تفصیل پہلی بار انہوں نے اپنے رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں بیان کر دی تھی، انہیں بہت جلد فعال، سرگرم اور نو جوان علماء کی حمایت حاصل ہوگئی جنہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں تاسیس جماعت کے موقع پر نئی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھنے والے علماء میں سب سے زیادہ قابل ذکر مولانا سیّد ابوالحسن ندوی اور منظور نعمانی تھے۔ مولانا ندوی بعد میں ندوۃ العلماء کے ریکٹر مقرر ہو گئے، مولانا نعمانی، ممتاز دیوبندی عالم تھے۔ مولانا مودودی جماعت کے سربراہ منتخب ہوئے۔ ان تاسیسی ارکان کی تعداد ۷۵ تھی۔ مولانا مودودی ۱۹۷۲ء تک اکتیس سال اس عہدے پر فائز رہے۔ (بحوالہ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے معمار، ص ۱۴۷۔ ۱۴۸)

138- مظفر، حسین، سر۔ (مارچ ۱۹۹۵ء) احیائے اسلام کے دو اسلوب، لاہور: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن ملتان روڈ، ص ۴۵

139- تحریک آزادی ہند اور مسلمان۔ ص ۲۶۔ ۲۷، محولہ بالا

-140 علماء میدان سیاست میں۔ ص ۱۲۲۔۱۲۲، حولہ بالا

-141 تحریک آزادئ ہند اور مسلمان۔ ص ۲۱

-142 برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۹۰

-143 آزاد، ابوالکلام۔ (۱۹۹۷ء)، انڈیا ونس فریڈم، مترجم محمد حبیب، کراچی: ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ص ۴۹

-144 پاکستان انقلاب سے پہلے، انقلاب کے بعد۔ ص ۱۳۴

-145 ایضاً

-146 چراغِ راہ، نظریہ پاکستان نمبر، ص ۲۳۲

حواشی۔ سیّد حسن ریاض، ایڈیٹر دہلی نے اعتراف کیا ہے کہ مسلم لیگ، مولانا مودودی کے دو قومی نظریہ پر مضامین کو پھیلاتی تھی اور نظریۂ پاکستان کی تائید میں استعمال کرتی تھی۔ (بحوالہ احمد، خورشید، پروفیسر، تذکرۂ زندان، ۱۹۶۵ء، اشاعت اوّل، کراچی: مکتبۂ چراغِ راہ، ص ۲۴۸)

-147 برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۹۲

-148 پاکستان منزل بہ منزل، ۲۴۲

-149 برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ۴۴۴

-150 چراغِ راہ، نظریہ پاکستان نمبر، ص ۵۱۷

-151 برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۹۳،

حواشی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔ ''لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس اور اس کے لیڈروں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا تھا اور کئی بار کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ مولانا کی رائے میں لیگ کو خوش کرنے سے زیادہ خود برطانوی مفاد کا تحفظ تھا۔ اگر ہندوستان کیبنٹ مشن پلان کے مطابق آزاد ہوتا تو برطانیہ کے لیے ہندوستان کی صنعتی اور معاشی

زندگی میں پہلے جیسا دن رہنے کا امکان ختم ہو جاتا۔ اس کے برعکس ہندوستان کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے صوبوں کی الگ ریاست بن جانے سے برطانیہ کو ہندوستان میں پاؤں ٹیکنے کی ایک جگہ ملتی تھی۔ ایک ایسی ریاست جس میں مسلم لیگ برسرِ اقتدار ہو، مستقل طور پر برطانیہ کے حلقۂ اثر میں رکھی جاسکتی تھی۔ اس کا اثر ہندوستان کے رویے پر بھی پڑ سکتا تھا۔ ہندوستان کو یہ دیکھ کر کہ پاکستان میں برطانیہ کا اڈہ ہے، برطانیہ کے مفاد کا خیال رکھنا پڑے گا، شاید اور کسی صورت میں وہ اتنا لحاظ نہ کرتا، (بحوالہ انڈیا ونس فریڈم ص ۲۸۸)

152- برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، ص ۳۹۴ محولہ بالا

153- تحریک آزادئ ہند اور مسلمان، ص ۲۴، محولہ بالا

154- حواشی۔ کانگریس قیادت کا کام اس اعتبار سے کئی درجے زیادہ سہل اور آسان تھا کیونکہ کانگریس کے حامیوں کی اکثریت تھی، آئینی طریقہ کار جمہوری تھا، پارلیمانی ادارے اکثریت کو اقتدار سونپنے کے حق میں تھے اور ہندوستان ایک انتظامی اکائی اور وحدت کے طور پر موجود تھا۔ ایسی صورت میں آزادی کا اصل مطلب اقتدار کی منتقلی تھا اور انگریز وائسرائے کی جگہ کانگریسی قائدین کے آجانے سے گاندھی اور نہرو کے ''پورن سوراج'' کا مقصد پورا ہو جاتا تھا۔ ایسے اجزاء کی موجودگی میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کانگریس کے لیے ۱۹۴۷ء کا سال محض اقتدار کی منتقلی تھا۔ لیکن ہمارے لیے یہ برس ہر اعتبار سے آزادی کا سال ہے۔ کانگریس کو اقتدار حاصل ہوا لیکن ہمیں آزادی حاصل ہوئی۔ (بحوالہ، قائداعظم اور آزادی کی تحریک، ص ۱۸۳۔۱۸۴)

155- انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۰۴ محولہ بالا

156- جنوبی ایشیا میں تہذیبی کشمکش، ص ۷۷۔۷۸، محولہ بالا

حواشی ۱۵۶۔ مسلمانوں کے قتل عام پر جس ہندو لیڈر کا ضمیر جاگا وہ گاندھی جی تھے۔ دہلی میں جب راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے تربیت یافتہ دہشت گردوں کی جانب سے سردار پٹیل کی

پشت پناہی میں ہونے والے قتل عام کو نہ روکا جاسکا تو گاندھی نے اپنے سیاسی ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے مدن برت کا اعلان کیا اور ساری زندگی ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے باوجود R.S.S کے دہشت گردوں کے سامنے اپنی زندگی میں بازی لگا دی (بحوالہ ایضاً)

157- ''روداد جماعت اسلامی'' (۴۷-۱۹۴۶ء) مرتبہ شعبۂ تنظیم جماعت، لاہور، شعبہ نشر و اشاعت، جماعت اسلامی، ص ۱۷۹۔ جلد پنجم

158- محمد، میاں طفیل۔ ''وہ اس زمانے میں اسوہ رسول کا ایک نمونہ تھے''۔ تذکرہ، جلد ۳، ص ۲۲ حواشی۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع گورداسپور، فیروز پور، جالندھر اور امرتسر کی مختلف تحصیلوں میں مسلمان آبادی کا فی صد تناسب غیر مسلموں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ یہ وہ علاقے ہیں جنہیں آبادی کے لحاظ سے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ علاقے پاکستان سے متصل تھے۔ اس طرح بہت سے علاقے جن میں آبادی زیادہ تھی کمیٹی کے طے شدہ اصول کے مطابق پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا لیکن انہیں ہندوستان میں شامل کر دیا تھا۔ (بحوالہ محرکات تحریک پاکستان کرامت علی خان، ص ۱۸۶)

159- مفکر اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۱۲ محولہ بالا حواشی۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو جہانگیر پارک کراچی کے عظیم الشان جلسۂ عام میں مولانا مودودی نے عوام سے خطاب کیا اور اپنا مشہور و معروف حسبِ ذیل چار نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی پیش کیا۔

(۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس ملک میں پوری کرے۔

(۲) تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے، منسوخ کیے جائیں اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ نافذ کیا جائے جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

(۳) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہو۔

(۴) حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔ (بحوالہ "تحریک اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں" مرتب اسعد گیلانی۔ص ۹۲

160- مریم، جمیلہ۔ (۱۹۶۹ء) "اسلام ایک نظریہ ایک تحریک" ترجمہ آباد شاہ پوری، لاہور: محمد یوسف خان اینڈ سنز، سنت نگر، ص ۲۰۲

حواشی ۱۶۰۔ ۱۹۴۸ء میں بھارت کے ساتھ سیز فائر کی پابندیاں قبول کرنے کے بعد پاکستان نے کشمیر میں اٹھنے والی شورش کی حمایت کرنا شروع کر دی تھی، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ نیم فوجی دستے روانہ کرنا پڑے۔ ان لڑاکا افراد کو منظم کر کے ان کی جدو جہد کو جہاد کا عنوان دے دیا۔ اس پر مودودی صاحب نے یہ مؤقف اختیار کر کے حکومت کی کوششوں کو زک پہنچائی کہ "ایسی خفیہ جنگ جہاد کے زمرے میں نہیں آتی، حکومت کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ ایک طرف سیز فائر کی پابندی کا عہد کرے اور دوسری طرف در پردہ جہاد کی پشت پناہی کرتی رہے۔ جہاد کے لیے مرکزی حکومت کو باقاعدہ اعلان کرنا پڑتا ہے اور اس کی وجوہ بھی بتانا ہوتی ہیں۔ حکومت کا موجودہ منافقانہ طرزِ عمل، لڑائی کو جہاد نہیں بنا سکتا"۔ سیّد مودودی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مسئلہ کشمیر پر بھارت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کرے یا اس نے جس سیز فائر پر اظہارِ رضامندی کیا ہے اس کی پوری طرح پابندی کرے۔ خفیہ لڑائی اور سفارتی شعبدہ بازی اسلام میں قابل قبول نہیں ہوتی۔ حکومت نے مودودی کے اس مؤقف کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔ اس نے فوراً جماعت پر بھارت نوازی اور وطن دشمن سرگرمیوں کا الزام لگا کر مولانا مودودی سمیت جماعت کے کئی لیڈروں کو بغاوت پھیلانے کے جرم میں جیل بھیج دیا۔ (بحوالہ، مودودی اور جماعت اسلامی۔ ص ۵۱)

161- مودودی اور جماعت اسلامی۔ص ۱۵۱

162- اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۳۰۲۔محولہ بالا

163- Bahadur Kaleem. (1978) Jamaat Islami of Pakistan Political Thought and political action. Lahore: progressive book. urdu bazar. P II

164- شمل، این میری۔ (اپریل ۲۰۰۰ء)، برصغیر میں اسلام، ترجمہ، ارشد رازی، لاہور: پرنٹ لائن پبلشرز، ص۲۶۴

165- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۵۲ء)، جماعت اسلامی، مقصد۔ تاریخ اور لائحہ عمل، بار چہارم، لاہور: مکتبۂ جماعت اسلامی۔ص ۱۰۰

166- ایضاً

167- مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص۲۵۲محولہ بالا

168- جماعت اسلامی، مقصد، تاریخ، لائحہ عمل، ص۱۰۴۔۱۵۵

حواشی الف۔ قادیانیت نئی نبوت پر استوار ہوئی تھی۔ اس کو قائم کرنے والا غلام احمد قادیانی نبوت کا دعویدار اور ایک نئے دین کا سرخیل تھا۔ یہ فرقہ قادیانی عقائد سے انکار کرنے والوں کو کافر قرار دیتا تھا۔ قادیانیوں نے اپنی نمازیں، اپنی رشتہ داریاں، اپنا جینا مرنا سب مسلمانوں سے الگ کر لیا تھا، (بحوالہ، تاریخ جماعت اسلامی، آبادشاہ پوری)۔

حواشی ب۔ انگریزوں کا یہ خودکاشتہ پورہ مسلمانوں کے اندر رہ کر انگریزوں کے لیے جذبہ ہمدردی وحمایت پیدا کرنے کے لیے کام کر رہا تھا۔ (بحوالہ تذکرہ جلد۲، ص ۴۶۸)

169- مودودی اور جماعت اسلامی، ص۱۵۲

170- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (فروری ۲۰۰۹ء) ''قادیانی مسئلہ اور اس کے مذہبی سیاسی اور معاشرتی پہلو''۔ اشاعت ۹، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز۔ ص۴۰۔۴۱

171- مودودی اور جماعت اسلامی، ص۱۵۲

172- بدر، خرم۔ (ستمبر ۱۹۸۸ء) سید مودودی کی سیاسی زندگی، کراچی: صبا پبلیکیشنز، ۹۲۔ حواشی جماعت اسلامی کے قائم مقام امیر سلطان احمد صاحب، سیّد مودودی سے ملنے جیل گئے تو وہاں مودودی صاحب کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی اور ان کے بیٹے عمر فاروق موجود تھے۔ سیّد مودودی کشادہ روئی کے ساتھ سب سے ملے۔ اور اپنے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ''بیٹا ذرا نہ گھبرانا، اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا۔ اور اگر اس کا حکم ہی نہیں تو پھر چاہے یہ اُلٹے لٹک جائیں لیکن مجھ کو نہیں لٹکا سکتے۔ (بحوالہ، ابوالاعلیٰ مودودی، علی سفیان آفاقی، ص ۱۴۴)

حواشی ب۔ عبدالستار نیازی بھی اس جرم میں قید تھے۔ سیّد مودودی کے بعد ان سے ملاقات کی۔ گفتگو شروع ہوئی تو کہنے لگے'' آپ لوگ بالکل نہ گھبرائیں۔ مولانا مودودی تو بڑی شخصیت ہیں یہ لوگ مجھ کو بھی پھانسی پر نہیں چڑھا سکتے۔ ہمارا واسطہ جن لوگوں سے پڑا ہے وہ بڑے بزدل ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ (بحوالہ سابق ص ۱۳۴)

173- گیلانی، اسعد۔ (۱۹۸۶ء)، سیّد مودودی دعوت و تحریک، اشاعت دوم، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز ص ۱۶۹

174- مودودی اور جماعت اسلامی، ص ۱۵۲، محولہ بالا

175- اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک، ص ۳۱۰، محولہ بالا

176- مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۸۷

177- اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۳۱۳

178- مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ۲۹۵

179- مودودی اور جماعت اسلامی۔ ص ۱۵۳

180- اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۳۱۵

Saulat, Sarwat, November 1979, Maulana Maududi Karachi, -181
International Islami publisher, P.60

182- پاکستان کے سیاسی صورتحال کا جائزہ۔ از مولانا مودودی ص ۱۴۔۱۶، شائع کردہ جماعت اسلامی، بحوالہ اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۲۱۷۔ ۲۱۸

183- مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۳۴۳۔۳۴۴

184- ایضاً، ص ۳۴۹

185- اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار۔ ص ۱۵۴

186- ایشیاء، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء، بحوالہ مفکرِ اسلام، سیّد مودودی، ص ۳۵۱، محولہ بالا

187- مفکر اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۳۵۶۔ ۳۵۷

188- ایضاً، ص ۳۷۱، چاند کا مسئلہ یہ تھا کہ صدر ایوب کو یہ بات سمجھا دی گئی تھی کہ جمعہ کی عید دو (۲) خطبوں کے باعث حاکمِ وقت پر بھاری ہوتی ہے۔ اتفاق سے اس سال بھی چاند نظر نہ آنے کی صورت میں جمعہ کو عید ہوئی۔ لہٰذا رویت ہلال کمیٹی نے حکمِ حاکم کے تحت قبل از یوم اعلانِ عید کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے رصدگاہ کے مہتمم نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ۱۱ جنوری بدھ کی شام ہلال موجود نہیں تھا تو نظر کیسے آ سکتا تھا۔ اور بھارت میں بھی چاند نظر نہیں آیا۔ پورے مغربی پاکستان میں مطلع صاف تھا اور چاند نظر نہیں آیا تھا۔ لہٰذا تمام جید علماء کرام اور ۹۸ فیصدی پاکستانی عوام نے جمعرات کو روزہ رکھا اور جمعہ کو عید منائی۔ بحوالہ ایضاً، ص ۳۶۷

189- نعمانی، عاصم۔ (مارچ ۱۹۹۳ء)، سیّد مودودی کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات، بار دوم، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۳۹۳۔۳۹۴

190- سیّد مودودی، دعوت و تحریک، ص ۴۸۷، محولہ بالا

191- اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار، ص محولہ بالا

192- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۴۸۷، محولہ بالا

193- یادگار لمحات، ص محولہ بالا

194- ایضاً، ص ۳۰۹

195- ایضاً، ص ۳۰۹۔۳۱۰

196- ایضاً

197- ایضاً، ص ۲۱۱، عاصم نعمانی صاحب نے بالتفصیل اس پیغام کو تحریر کیا ہے۔ جو ص ۳۱۱ سے ۳۱۳ پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے وہ دو (۲) لاکھ ریال اس وقت کے زرِ مبادلہ کے مطابق تقریباً پونے چھ لاکھ روپیہ پاکستانی کے مساوی تھے۔

197-A- سند کی نقل باب کے آخر میں منسلک ہے۔

198- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۴۸۸

199- یادگار لمحات، ص ۳۱۳

200- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۴۸۸، پاکستانی وقت کے مطابق شام پونے چھ بجے مولانا کا انتقال ہوا۔

201- یادگار لمحات، ص ۳۲۰

202- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۴۸۸

203- یادگار لمحات، ص ۳۲۱۔۳۲۲

204- دعوت وتحریک، ص ۴۸۸

بسم الله الرحمن الرحيم

شاہ فیصل ایوارڈ



براءة جائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام

إن هيئة جائزة الملك فيصل العالمية بعد اطلاعها على نظام جائزة الملك فيصل العالمية المصادق عليه من مجلس أمناء مؤسسة الملك فيصل الخيرية بالقرار رقم ١١/٦٨/٩٨ وتاريخ ١٠/٨/١٣٩٨هـ وعلى محضر لجنة الترشيح والاختيار لجائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام بتاريخ ٣ ربيع الأول ١٣٩٩هـ تقرر منح:

سماحة الشيخ العلامة السيد أبي الأعلى المودودي

جائزة الملك فيصل العالمية لخدمة الإسلام لهذا العام ١٣٩٩هـ وذلك تقديرا لجهوده المخلصة في خدمة الإسلام والمسلمين وخاصة في المجالات الآتية:

١- عمله منذ شبابه المبكر في العمل الصحافي الإسلامي الجاد، ونيابته بعد ذلك بإنتاج كثيف يتميز بعلم غزير وفكر أصيل واسع.

٢- إسهامه إسهاما فعالا في تجديد الفكر الإسلامي وجعله ظاهرة مهيمنة على الحياة في جميع تصوراتها عند المسلمين في القارة الهندية.

٣- كفاحه البطولي وجهاده المستميت من أجل إحياء الروح الإسلامية وبعث القيم الإسلامية والمطالبة بجعل تعاليم الشريعة الإسلامية وأحكامها مطبقة بين المسلمين في حياتهم العملية، وذلك عن طريق حركته الإصلاحية التي تنطق بها مؤلفاته الرسالية العديدة والتي كان لها بالغ الأثر وتفاعل التجاوب مع تحركات الإصلاح في العالم وإن هيئة الجائزة إذ تمنحه ذلك فإنها ترجو الله أن يوفقه في جهاده وأن يكثر من أمثاله.

والله ولي التوفيق

رئيس هيئة الجائزة

صدرت في الرياض بتاريخ [illegible] من ربيع الثاني ١٣٩٩هـ
الموافق ٢٨ فبراير ١٩٧٩م

باب دوم

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا خاندان

فصل اوّل:۔

''اجدادِ مودودیؒ''

سید مودودی کو یہ شرف و اعزاز حاصل ہے کہ ان کا تعلق خاندان رسول سے ہے۔آپ کے شجرے کے مطابق اکتالیسویں پشت پر آپ کا سلسلہ حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔1

مولانا مودودی نے اپنی خودنوشت میں اپنے خاندان کا جو تعارف پیش کیا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں:

> میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس میں تیرہ سو برس تک سلسلہ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ سادات اہلِ بیت کی ایک شاخ تیسری صدی ہجری میں ''ہرات'' کے قریب ایک مقام پر آباد ہوئی تھی جو چشت کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔2

برصغیر کی روحانی تاریخ میں جن لوگوں نے کم و بیش ایک صدی تک امتیازی حیثیت حاصل کی وہ زیادہ تر تصوف کے چشتی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے چشت خراسان کا ایک مشہور شہر ہے۔ وہاں کچھ بزرگان دین نے روحانی اصلاح و تربیت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور وہ نظام اس مقام کی نسبت سے چشتیہ سلسلہ کہلانے لگا۔3 شجرۃ الانوار میں لکھا ہے:

> (چشت نام کے) دو مقام ہیں ایک شہر خراسان میں ہرات کے قریب واقع ہے۔ دوسرا چشت ہندوستان میں اوچ اور ملتان کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ خواجگان چشت، خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں۔4

اس روحانی سلسلے کے بانی کے بارے میں اتفاق رائے موجود نہیں بعض تاریخ نگاروں کے نزدیک یہ اعزاز خواجہ احمد ابدال چشتی کو حاصل ہے (ولادت ۲۶۰۔وفات ۳۵۵) جو شیخ ابو اسحٰق شامی کے مرید تھے۔5 خلیق احمد نظامی کے مطابق حضرت خواجہ ابو اسحٰق شامی (التوفی ۹۴۰ء) پہلے بزرگ ہیں جن کے اسم گرامی کے ساتھ تذکروں میں چشت لکھا ہوا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے حضرت خواجہ ابو اسحٰق شام کے رہنے والے تھے اپنے وطن سے چل کر بغداد آئے اور حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے زمانے کے مرتاض بزرگ تھے، اپنی پہلی ملاقات میں خواجہ ممشاد نے ابو اسحٰق سے فرمایا۔

آج سے لوگ تجھے ابو اسحٰق چشتی کہہ کر پکاریں گے، اور چشت اور اس کے نواح کے لوگ تجھ سے ہدایت پائیں گے، اور ہر وہ شخص جو تیرے سلسلہ ارادت میں داخل ہوگا اس کو قیامت تک چشتی کہہ کر پکاریں گے۔6

اسکے بعد خواجہ دینوری نے ان کو تذکیر و ارشاد حق کے لئے چشت روانہ کر دیا، جہاں ان کی پر خلوص جدو جہد سے ایک عظیم الشان سلسلہ کی داغ بیل پڑی اور چشت نے بہت جلد نامور روحانی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔7

خواجہ ابو احمد ابدال چشتی:

سید مودودی نے اپنی خودنوشت میں واضح کہا ہے کہ چشتیہ خاندان کے نامور بزرگ ابو احمد ابدال چشتی، حضرت مثنیٰ بن حضرت حسین کی اولاد سے تھے، انہی سے صوفیہ کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا ہے۔8 قدوۃ الدین آپ کا لقب تھا۔ ۲۶۰ھ میں خلیفہ عباسی معتصم باللہ کے عہد میں سلطان فرسانفہ کے ہاں چشت میں آپ کی پیدائش ہوئی، ظاہری حسن و جمال میں بھی بے نظیر تھے، چہرہ منور اس قدر چمکدار تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اندھیرے میں روشنی پیدا کر دیتا تھا تو مبالغہ نہیں۔ سات سال کی عمر سے آپ نے خواجہ ابو اسحٰق کی خدمت میں حاضری شروع کر دی تھی، اور علوم ظاہر یہ و باطنیہ دونوں حضرت خواجہ سے حاصل کرنے شروع

کر دیے تھے۔ ۱۶ سال کی عمر میں علوم ظاہریہ سے فارغ ہو کر شیخ ہی سے بیعت ہو گئے تھے۔9

روایت ہے کہ ایک دن خواجہ ابو احمد جب بیس سال کے تھے اپنے والد سلطان فرسنافہ کے ہمراہ شکار کے ارادے سے پہاڑ کی طرف گئے اثنائے سفر میں کہیں تنہا رہ گئے، والد سے بچھڑ گئے ایک پہاڑ پر پہنچے جہاں چالیس رجال الغیب ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ شیخ ابو اسحٰق شامی (چشتی) بھی اس جماعت میں موجود تھے، یہ دیکھ کر ان کو بڑا تعجب ہوا، گھوڑے سے اترے اور شیخ ابو اسحٰق کے قدموں پر گر پڑے، گھوڑا، ہتھیار جو کچھ ساتھ تھا سب وہیں چھوڑ دیا۔ پشمینہ پہن لیا، ان کے ساتھ روانہ و گئے، ہر چند کہ ان کے والد اور دوسرے لوگوں نے تلاش کیا کہیں نہ ملے، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ آپ شیخ ابو اسحٰق کے پاس ہیں اور فلاں جگہ موجود ہیں، باپ نے کچھ آدمیوں کو لانے کے لئے بھیجا، ہر چند سمجھایا، آپ واپس نہیں آئے اور کوئی بھی نصیحت کارآمد نہ ہوئی کہتے ہیں آپ کے باپ کا ایک شراب خانہ تھا، ایک دن موقع پا کر اندر پہنچ گئے اور تمام گھڑوں کو توڑنا شروع کیا۔ باپ کو معلوم ہوا غصہ میں چھت پر چڑھے اور ایک بڑا پتھر اٹھایا اور چاہا کہ سوراخ میں سے پتھر ان کو ماریں، سوراخ نے پتھر کو پکڑ لیا10 یا یوں کہیے کہ ہوا نے پتھر کو روک لیا اور وہ معلق ہو گیا، آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔11 یہ قصہ دیکھ کر باپ کو سخت حیرت ہوئی اور بیٹے کے ہاتھ پر شراب سے توبہ کر لی۔12

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ سفر میں تھے کہ اتفاقاً کسی ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں محض کفار کی آبادی تھی اور مسلمان کوئی قرب و جوار میں بھی نہ تھا، ان کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان ادھر کو جاتا اس کو مار پیٹ کر آگ میں جلا دیا کرتے، اسی طرح شیخ کے ساتھ بھی معاملہ کیا مگر رعب کی وجہ سے آگ میں ڈلنے کی ہمت نہ ہوئی، شیخ نے کہا تم فکر نہ کرو میں خود ہی آگ میں گر جاؤں گا، یہ کہہ کر حضرت شیخ اپنا مصلی آگ پر ڈال کر خود چلے گئے، حضرت کا وہاں پہنچنا تھا کہ آگ دفعۃً ٹھنڈی ہوگئی، یہ قصہ دیکھ کر سب متحیر ہو گئے اور اس قدر عظمت و وقعت شیخ کی ہوئی کہ دل و جان سے قربان ہونے لگے اور سینکڑوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔13

آپ کی عادت ایک قرآن دن میں اور دو قرآن شب میں ختم کرنے کی تھی۔ آپ صاحب الاسرار تھے لیکن سر ظاہر نہیں فرماتے تھے، کہتے ہیں آپ با اتفاق اہل زمانہ قطب ابدال تھے۔ نذرانہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ اچھے لباس اور اچھے کھانے سے بھی احتراز فرماتے تھے آپ کی وفات ۳ جمادی الآخر ۳۵۵ھ میں ہوئی۔ چشت میں آپ کا مزار ہے۔۱۴

خواجہ محمد چشتیؒ:

برصغیر میں جس بزرگ نے چشتی سلسلہ کی داغ بیل ڈالی وہ خواجہ محمد چشتی تھے، جو خواجہ ابو احمد ابدال کے لڑکے اور مرید تھے۔ علوم دینیہ کے مالک تھے، زہد و عبادت میں کامل تھے۔ کہتے ہیں کہ بحکم الٰہی ستر (۷۰) سال کی عمر میں محمود غزنوی (۹۷۱ء۔۱۰۳۰ء) کی مدد کے لئے اس کے ہمراہ سومنات پر حملے کے لئے گئے تھے۔ آپ کی برکتِ قدوم سے سومنات فتح ہوا آپ کی وفات ۴۱۱ھ کو ہوئی، آپ کا مزار بھی چشت میں ہے۔15 مولانا جامی لکھتے ہیں:

خواجہ محمد اپنے باپ کی وفات کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے، اس وقت چوبیس (۲۴) سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی، امور دینی اور معارف یقینی کو حاصل کیا، بڑے زاہد متقی تھے، دنیا اور دنیا داروں سے بچتے تھے، ہمیشہ زہد اور ترک دنیا کے رغبت دلایا کرتے تھے، کہا کرتے تھے ''جب ہمارا اوّل و آخر دنیا کا ترک ہے تو اپنے آپ کو اس دھوکہ اور غرور سے بچانا چاہیے''۔ ایک دفعہ سلطان محمود سبکتگین سومنات کی لڑائی کے لئے گیا ہوا تھا، خواجہ کو خواب میں دکھائی دیا کہ اس کی مدد کرنی چاہیے، ستر (۷۰) سال کی عمر میں چند درویشوں کے ساتھ جہاد کیا۔16 سید مودودی کی یاداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ابو محمد چشتی محمود غزنوی کے ہمعصر تھے اور ہندوستان کے جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ محمود آپ کا مرید بھی تھا۔ آپ نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی۔17

خواجہ ابو یوسف:

خواجہ محمد چشتی کے زہد و تقویٰ کے وارث خواجہ ابو یوسف تھے جو آپ کے خلیفہ اور بھانجے تھے، آپ کا لقب ناصر الدین تھا۔18 خواجہ ابو یوسف چشتی اپنی والدہ کی طرف سے حسنی تھے۔ اور سلسلہ نسب حضرت حسن مثنیٰ بن امام حسن تک پہنچتا تھا اور والد کی طرف سے بواسطہ امام علی نقی امام حسین تک پہنچتا تھا۔ ۴۵۹ میں آپ کی وفات ہوئی۔19 روایت ہے کہ خواجہ محمد کی ہمشیرہ جن کی عمر تقریباً چالیس سال تھی بھائی کی خدمت کی وجہ سے شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں، ہر وقت عبادت اور اطاعت الٰہی میں مشغول رہتی تھیں۔ ایک رات خواجہ محمد نے خواجہ احمد کو خواب میں دیکھا وہ فرماتے ہیں کہ ولایت شام میں ایک شخص محمد سمعان نامی ہے، جو عالم باعمل اور پرہیز گار ہے، اپنی ہمشیرہ کا ان سے عقد کردو، خواجہ نے ان کو بلوا کر اپنی ہمشیرہ کا ان سے عقد کردیا، خواجہ ابو یوسف چشت میں ان سے پیدا ہوئے۔20 خواجہ محمد ۶۵ سال کے بعد عیالدار ہوئے تھے، لیکن کوئی لڑکا بزرگ نہ ہوا تھا۔ خواجہ یوسف کو بمنزلہ فرزند کے پرورش کرتے تھے، علم اور راہ خدا کے سلوک کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد وہی ان کے قائم مقام ہوئے۔21 آپ طریقت کا جمال اور حقیقت کا کمال تھے، آپ کی کرامتیں کھلی ہوئی اور آپ کی ولایت کی واضح دلیلیں ہیں۔

منقول ہے:

''ایک مرتبہ خواجہ ابو یوسف چشتی راستے سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، چھت ڈالنے کے لئے ایک شہتیر چھت پر لے جایا جارہا ہے، لیکن وہ شہتیر عمارت سے چھوٹا تھا، لوگ پریشان تھے کہ اب کیا کریں، عین اس موقع پر خواجہ ابو یوسف وہاں پہنچ گئے، لوگوں نے آپ کو تمام صورتحال بتائی، جب یہ واقعہ آپ کو معلوم ہوا تو آپ گھوڑے سے اترے، اور مسجد کی دیوار پر چڑھے اور لکڑی کا ایک سرا اپنے دست مبارک میں لیا، اور کہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب اس

شہتیر کو عمارت پر لائے تو وہ اس جانب سے جدھر سے خواجہ نے اپنے
دست مبارک سے پکڑ رکھا تھا (خدا کی قدرت سے) ایک گز بڑھ گیا
یہاں تک کہ وہ خواجہ صاحب کی کرامت سے مسجد کی عمارت سے ایک
گز باہر نکل گیا آج بھی یہ شہتیر موجود ہے''۔22

آپ کی وفات ۴۵۹ھ میں ہوئی آپ کی عمر ۸۴ سال کی تھی23 جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے بڑے صاحبزادے خواجہ قطب الدین مودود کو تحصیل علم کی وصیت کی اور اپنا قائم مقام مقرر فرمایا اس کے بعد آپ کا وصال ہوگیا۔24 آپ کی وفات خلیفہ ابوجعفر قائم بن قادر باللہ عباسی کے عہد حکومت میں ہوئی یہ خلیفہ سلطان طغرل بیگ سلجوقی کا ہمعصر تھا، جس نے سلطان مسعود بن محمود غزنوی سے ملک خراسان فتح کیا تھا، بغداد میں بھی اسی کے نم کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، خواجہ ابو یوسف کی وفات کے وقت سلطان الب ارسلان خراسان کے تخت پر متمکن تھا۔25

خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ:

خواجہ ابو یوسف کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے صاحبزادے خواجہ مودود چشتی ان کے جانشین نامزد ہوئے مولانا مودودی اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''خواجہ مودود چشتی تمام سلاسل چشتیہ کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودیہ کے مورث اعلیٰ ہیں''۔26

قطب الاقطاب اور قطب الدین آپ کا لقب تھا۔شمع صوفیان و چراغ چشتیان وغیرہ خطابات سے مخاطب کیے جاتے تھے۔27 آپ بڑے عظیم الشان اور عالی مقام بزرگ ہوئے ہیں، تمام مشائخ زمانہ آپ کے ظاہری و باطنی علم کے کمالات کو مانتے تھے، آپ مریدین کی تربیت میں بے نظیر تھے۔28 آپ نے سات سال کی عمر میں تمام قرآن کو ترجمے کے ساتھ حفظ کرلیا تھا29 سولہ سال کی عمر میں تحصیل علوم ظاہریہ فرما چکے

تھے۔ بعض اہل تاریخ کی رائے یہ ہے کہ تکمیل علوم ظاہری سیکھنے کے بعد بمشورہ شیخ احمد فرمائی ہے۔30 حضرت خواجہ مودود نے ۲ کتابیں ''منہاج العارفین'' اور ''خلاصۃ الشریعت'' تصنیف فرمائیں جو اب ناپید ہیں۔31

خواجہ مودود کو حضرت شیخ احمد جامی کی صحبت اور تربیت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ جس وقت شیخ احمد، جام سے ولایت ہرات میں تشریف لائے لوگ ان کے کمالات اور کرامات دیکھ کر مرید اور معتقد ہو گئے اور اس کی بہت شہرت ہوئی32 جب وہاں سے شیخ جامی مزارات کی زیارت کے لئے چشت کی طرف متوجہ ہوئے اور یہاں خواجہ مودود چشتی کے ساتھ جو معاملات پیش آئے نفحات الانس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔33 مختصراً یہ کہ شیخ جام اس بات پر مامور تھے کہ خواجہ مودود چشتی کو نعمت دیں، خواجہ مودود بھی پہلے تو کسی اور طرف رجوع کر رہے تھے لیکن بعد میں اس بات کو سمجھ گئے اور حضرت شیخ کی خدمت میں آ کر معافی مانگی۔ آپ نے معاف کر دیا اور فرمایا کہ دو خدمتگاروں کو اپنے پاس رکھ کر باقی لوگوں کو رخصت کر دیں، اور تین دن یہاں قیام کریں، خواجہ صاحب نے اسی طرح کیا اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ اب فرمایئے کیا فرمان ہے۔ شیخ نے کہا پہلے مصلیٰ طاق پر رکھ دو اور علم حاصل کرو، انھوں نے کہا میں نے قبول کیا (کیونکہ خواجہ مودود کے والد نے بھی یہی وصیت کی تھی) اور کیا فرمان ہے شیخ نے فرمایا، علم سے فارغ ہو کر اپنے خاندان کو زندہ کرو کیونکہ تمہارے آبا و اجداد بزرگ اور صاحب کرامت تھے۔ خواجہ مودود نے کہا جب آپ مجھے احیائے خاندان کا حکم دے رہے ہیں تو آپ خود تبرکاً اس کام کا آغاز فرما دیں، حضرت شیخ نے فرمایا! آگے آؤ، ان کا ہاتھ پکڑا اور مصلیٰ پر بٹھایا اور تین بار کہا ''بشرط علم'' اس کے بعد خواجہ دو تین دن حضرت شیخ کی خدمت میں رہے اور بہت سے فوائد اور نعمتیں حاصل کیں۔ تھوڑے عرصہ بعد بلخ و بخارا جا کر علم حاصل کیا اور چار سال کے عرصے میں آپ تمام ظاہری و باطنی علوم میں بقدر وسعت و امکان کامل و مکمل ہو گئے اور ہر طرف سے طالبان راہ حق جمع ہوئے اور بلند مقامات حاصل کرنے لگے۔34

خواجہ سنجان، جن کا اصل نام رکن الدین محمود ہے، خواجہ مودود کی صحبت کا شرف حاصل کیا اور چند

دنوں چشت میں اقامت گزین ہوئے، کہا جاتا ہے کہ مدت اقامت میں بس بس چشت میں بے وضو نہیں رہے جب چاہتے کہ طہارت کریں سوار ہوتے اور چشت سے باہر جاتے، طہارت کرتے اور لوٹ آتے کہتے تھے کہ مزار چشت مبارک منزل اور متبرک مقام ہے جائز نہیں کہ وہاں بے ادبی کریں، کہتے ہیں پہلے ان کو خواجہ سنجان کہا جاتا تھا، خواجہ مودود نے ان کو شاہ سنجان کا لقب دیا تھا وہ ہمیشہ اس پر فخر کیا کرتے تھے۔35

خواجہ مودود کو کشف قلوب اور کشف قبور بھی حاصل تھا۔36 منقول ہے کہ بدخشاں کا ایک بزرگ زادہ خواجہ کی خدمت میں آیا اور مرید ہونے کے بعد اس نے خواجہ سے درخواست کی کہ اسے تبرک عطا کیا جائے، خواجہ نے نور باطن سے معلوم کر لیا تھا کہ ابھی اس کے گناہوں کی فہرست میں دنیا سے لگاؤ باقی ہے۔ اس لیے آپ نے اس کی درخواست قبول نہیں کی یہاں تک کہ وہ بہت سے بزرگوں کی سفارش لے آیا، خواجہ نے اس کو اپنی ٹوپی عنایت فرمائی اور ہدایت کی کہ اس ٹوپی کے آداب پوری طرح بجا لانا ورنہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ جب یہ بزرگ زادہ ٹوپی لے کر بدخشاں پہنچا اور وہاں آنے کے بعد دنیا اور خواہشات نفس میں مبتلا ہو گیا تو یہ خبر خواجہ مودود کو ملی آپ نے فرمایا کیا بات ہے ٹوپی نے ابھی تک کام نہیں کیا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسے کسی الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔37

خواجہ مودود کی وفات ۵۲۷ھ میں ہوئی38 یہ سلطان فخر الدین سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کا عہد حکومت تھا آپ کا مدفن چشت میں ہے39 سیر الاولیاء میں ہے کہ آپ کی نماز جنازہ پہلے مردان غیب نے پڑھی اس کے بعد خلق خدا نے جنازہ پڑھا پھر خدا کے حکم سے جنازہ ہوا پر لے جایا گیا اور لوگ جنازے کے پیچھے پیچھے چلے یہاں تک کہ اس جگہ پہنچے جو آپ نے اپنی قبر کے لیے پسند کی تھی، جب آپ کی یہ کرامت دیکھی گئی تو کئی ہزار کافر مسلمان ہو گئے۔40

خواجہ موصوف کے خلفا کی تعداد دس ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔41 برصغیر میں اس روحانی سلسلے کا

با قاعدہ آغاز خواجہ معین الدین چشتی سے ہوا جو خواجہ عثمان ہارونی کے مرید تھے اور انہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا خواجہ ہارونی سے ہی آپ کا سلسلہ خواجہ مودود چشتی پر منتہی ہوتا ہے۔42 مودودی صاحب کے مطابق

''خواجہ معین الدین اجمیری کے شیخ حضرت عثمان ہرَونی تھے ان کے شیخ جامی شریف زندنی اور ان کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین مودود تھے''۔43

عام روایت کے مطابق خواجہ معین الدین چشتی پرتھوی راج کے زمانے میں برصغیر آئے تھے۔44

سرزمین بلوچستان بھی خواجہ مودود کے اثرات سے فیضیاب رہی، تذکرہ صوفیائے بلوچستان میں ہے کہ باصفا ہستیوں کے روحانی اثرات جہاں برصغیر کے کونے کونے میں پہنچے وہاں بلوچستان کس طرح محروم رہ سکتا تھا، بعض بزرگ خود اس صوبے میں آئے اور عقیدت مندوں کو صفائے باطن سے بہرہ ور کیا اور واپس چلے گئے بعض اس صوبے میں نہیں آئے مگر ان کی تعلیمات یہاں پہنچیں بعض کے مریدوں نے یہاں رہائش اختیار کر کے رشد و ہدایت کی شمع روشن کی۔45 پیر کبار عطا اللہ المعروف آتو جو افغان قوم سے تھے چشت جا کر مودود چشتی کے مرید ہوئے چالیس برس تک اپنے مرشد کی خدمت میں رہے وفات سے قبل حضرت خواجہ مودود نے آپ کو خرقہ خلافت سے ممتاز فرما کر وطن کی طرف رخصت کیا46 اہل بلوچستان حضرت سلطان سخی سرور کے فیوض سے بھی بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ سلطان سخی سرور نے علوم ظاہری کی تکمیل مولوی محمد اسحٰق لاہوری سے کی، تصوف میں اپنے والد سے مستفیض ہوئے اور خواجہ مودود چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔47

خاندان مودودیہ کی جس شاخ سے میرا تعلق ہے اس کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان آئے ان کا اسمِ گرامی خواجہ مودود ثانی تھا جو ٦ واسطوں سے حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی کی اولاد میں تھے۔ ان کے بیٹے حضرت خواجہ علی نے پانی پت کے قریب موضع سرنامی میں قیام کیا۔ ان کے بیٹے حضرت

شاہ خواجلی پھر چشت واپس تشریف لے گئے۔ وہاں شاہ خراسان نے اپنی بیبی کی شادی ان سے کردی بن کے بطن سے ۸۶۹ھ میں حضرت ابوالاعلیٰ مودودی پیدا ہوئے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد حضرت ابوالاعلیٰ مودودی ہندوستان تشریف لائے۔ یہ سکندر لودھی کا زمانہ تھا اور سکندر اس زمانے میں راجہ نرور سے جنگ میں مشغول تھا۔ آپ اس لڑائی میں شریک ہوئے اور آپ ہی کے تیر سے راجہ مارا گیا۔ اس پر سکندر لودھی نے قصبہ براس مع ۱۲ گاؤں آپ کی جاگیر میں دیا۔ ۹۳۵ھ میں آپ نے وفات پائی۔48

علم تصوف اور تاریخ اسلام میں صوفیا کے کردار کے بارے میں مودودی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار مختلف مواقع اور اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ لہٰذا صوفیوں کے ایک طبقہ کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تصوف کے ضمن میں مودودی صاحب تحریر کرتے ہیں:

> تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے بلکہ مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہوگئی ہیں۔ جس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے، جس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری چیز اور جس تصوف کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز ہے۔49
>
> ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیاء میں پایا جاتا تھا۔ مثلاً فضل بن عیاض، ابراہیم ادھم، معروف کرخی وغیرہ۔ اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا، اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا، وہی افکار اور وہی اشغال و اعمال تھے جو کتاب وسنت سے ماخوذ تھے اور ان سب کا وہی مقصود تھا جو اسلام کا مقصود ہے۔ یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ س کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔50
>
> دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی، زرتشتی اور ودیدانتی

فلسفوں کی آمیزش ہوئی ہے، جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہو گئے ہیں، جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال خلط ملط ہو گئے ہیں۔ جس میں شریعت و طریقت اور معرفت الگ الگ چیز ہیں۔ ایک دوسرے سے کم و بیش بے تعلق، بلکہ بسا اوقات باہم متضاد بن گئی ہیں۔ جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے کے بجائے اس سے بالکل مختلف دوسرے ہی کاموں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں۔51

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلی قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسری قسم کے تصوف کی ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ ہم کلی طور پر تصدیق کرتے ہیں، اور نہ کلی تردید، بلکہ اس کے پیروؤں اور حامیوں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ براہ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ اس تصوف پر کتاب و سنت کی روشنی میں نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں۔52

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں نشو و نما پانے والے تصوف کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"پیران طریقت کے ہاتھوں ایک اور بیماری پھیل رہی تھی اشراقیت، رواقیت، مانویت اور ویدانت ازم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے نظام اعتقادی و اخلاقی میں

ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت وحقیقت شرع اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں، باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنالیا گیا تھا۔ اسی کوچہ کا قانون یہ تھا کہ حدود حرام وحلال رخصت، احکام دین عملاً منسوخ اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلی اختیارات جس فرض کو چاہے ساقط کردے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنادے۔ جس حلال کو چاہے حرام کردے اور جس حرام کو چاہے حلال کردے۔ ان عام پیروں سے بہتر جن کی حالت تھی ان پر کم وبیش فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدۃ الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بے کار کر دیا تھا''۔53

صحبت صوفیاء سے متعلق اپنی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

''صوفیاء کی صحبتوں سے میں نے اکثر استفادہ کیا ہے۔ ایک مدت تک میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جس باخدا بزرگ کا بھی پتہ چلا ان سے ضرور جا کر ملا اور ان کی صحبت میں جا کر بیٹھا۔ میرا اپنا خاندان بھی اہلِ تصوف ہی میں سے ہے اور میرے والد مرحوم تک بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رہا۔ تصوف کا تھوڑا بہت مطالعہ میں نے بھی کیا ہے اور متعدد صوفی بزرگوں سے توجہ لینے اور اشغال سیکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس لیے تصوف اور اہلِ تصوف کے بارے میں اپنے جن خیالات اور آراء کی بناء پر میں بدنام ہوں' انہیں آپ ایک ایسے شخص کے خیالات اور آراء نہ سمجھیں جو اس کوچہ سے بالکل نابلد ہے۔ میں نے تصوف کو بھی دیکھا ہے اور اہلِ تصوف کو بھی۔ اور اس کے اچھے اور

برے پہلو دیکھ کر ہی ایک نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ بس جس نتیجے پر پہنچا ہوں اسے ہر شخص مان لے۔ البتہ یہ ضرور عرض کرتا ہوں کہ میری رائے کو محض ایک سطحی رائے سمجھنے کی غلطی دوسرے لوگ بھی نہ کریں۔ اب بھی مجھے کسی صاحب کمال سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں ہے اور میری ہر رائے نظر ثانی کے قابل ہے۔54

خاندان کے روحانی پس منظر کے ساتھ ہی سید مودودی کے خون میں ایک ایسی نسل کی آمیزش تھی جو رزم و بزم کا امتزاج تھا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

ننھیال کی طرف سے میں ترکی الاصل ہوں۔ میرے نانا قربان علی بیگ اگرچہ صاحب قلم تھے مگر پشت با پشت سے ان کا پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ ان کے بزرگوں میں مرزا طولک بے عالمگیر کے عہد میں ماوراالنہر سے ہندوستان آئے اور فوجی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح شاہی خدمت بجالاتے رہے، لیکن جب شیرازۂ سلطنت درہم برہم ہوا تو یہ خاندان، نظام حیدر آباد سے منسلک ہوگیا55 آبائی پس منظر کے ساتھ قربان علی بیگ، صاحب قلم اور شاعر تھے، سالکؔ تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب کے خالص شاگردوں میں سے تھے، دہلی میں ان کا مکان غالب کے مکان سے متصل تھا56 سالکؔ کا یہ شعر زبان از خلائق ہے:

دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے57

سالک صاحب کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی والدہ ماجدہ رقیہ بیگم تھیں۔58

والد صاحب:

اپنے والد صاحب کے بارے میں سید مودودی اپنے مضمون ''میرا بچپن'' میں رقمطراز ہیں کہ میرے والد مرحوم، مولوی سید احمد حسن صاحب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے دو سال قبل دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ مدرسہ علیگڑھ کے ابتدائی دور کے طالبعلموں میں شامل تھے۔ سرسید مرحوم نے جب مدرسہ قائم کیا تو وہ اپنے خاندان اور رشتہ داروں میں سے بہت سے لڑکوں کو منتخب کر کے علیگڑھ چلے گئے تھے، چونکہ میری دادی مرحومہ سے ان کی قرابت داری تھی اس لیے والد مرحوم کا انتخاب بھی اسی سلسلے میں ہوا59 میرے والد چونکہ مدرسے کے اولین طلباء میں سے تھے لہٰذا قدرتی طور پر سرسید کی تحریک سے متاثر تھے۔60 اس زمانے میں مسلمانوں کا عام رجحان انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب دونوں کے خلاف تھا اور مسلمانوں میں شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی ہمارا خاندان اس نفرت میں عام مسلمانوں سے کچھ زیادہ تھا کیوں کہ ہمارے ہاں مذہب کے ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی61 اس کی دوسری وجہ بھی مولانا اپنے ایک انٹرویو میں بیان کی ہے:

> ''میرے خاندان کے متعلق دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء
> کے ہنگاموں میں اس خاندان کو سخت و شدید دشواریوں اور آزمائشوں
> کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے تشدد نے اس خاندان کے افراد میں
> ان کے خلاف شدید جذبہ نفرت پیدا کر دیا تھا''۔62

میرے دادا صاحب کو والد کا علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنا سخت ناگوار تھا مگر سرسید کے خیال سے خاموش تھے لیکن بہت جلد انھوں نے والد کو علیگڑھ سے واپس بلا لیا اس طرح وہ وہاں تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے الہٰ آباد جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کی ادھر ریاست دیوگڑھ میں ولیعہد کے اتالیق مقرر ہوئے کئی سال یہاں مقیم رہے لیکن جب ولیعہد محلاتی سازش کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا تو والد کو نہ صرف اس کا شدید رنج ہوا بلکہ ان کا مقصد قیام بھی ختم ہو گیا اس کے بعد کئی سال تک انھوں نے میرٹھ، غازی آباد، اور بلند شہر وغیرہ میں وکالت کی اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ایک مقدمہ میں وکالۃً اورنگ آباد دکن

تشریف لائے یہاں مولوی محی الدین خان صاحب صوبے کے میر عدل اور رشتے میں والد مرحوم کے چچا ہوتے تھے۔ان کے ایماء سے یہاں وکالت شروع کی اور چند ہی ماہ میں بڑی تیزی سے کامیابی حاصل کی63 اس کے ساتھ ہی ایک عرصہ تک مغربی طرز زندگی بھی اختیار کیے رکھا یہاں تک کہ دادا مرحوم نے انھیں کرسٹان (کرسچن) کا خطاب دیا اور ان کے کھانے کے برتن بھی علیحدہ کر دیے64 لیکن مولوی محی الدین کی صحبت نے رفتہ رفتہ والد صاحب پر ایسا اثر کیا کہ فرنگیت کے تمام اثرات باطل ہوگئے اور ان کی جگہ اسلامیت پوری طرح متمکن ہوگئی۔

۱۹۰۰ء میں والد مرحوم نے محی الدین خان سے بیعت کرلی اور ذکر وشغل ریاضیات ومجاہدات اور سلوک ومراقبہ میں مشغول ہوگئے تاہم اس کے اثرات اتنے پختہ نہ ہوئے تھے کہ عملی زندگی متاثر ہوتی چار سال تک دین ودنیا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، مگر ۱۹۰۴ء میں جبکہ میں صرف ایک سال کا تھا والد کے لئے ان دونوں کا نباہنا مشکل ہوگیا65 ان کی روحانیت آگے چل کر رہبانیت کا روپ دھارنے لگی، چنانچہ انھیں بری طرح یہ احساس ستاتا رہا کہ زمانہ دراز تک وہ ناجائز طریقوں سے روپیہ کماتے رہے ہیں، رفتہ رفتہ انہوں نے جھوٹے اور غیر مذہبی مقدمے لینے سے گریز کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ایک زمانہ میں حیدر آباد چھوڑ کر دہلی کا رخ کیا اپنا مال واسباب فی سبیل اللہ تقسیم کردیا جو وکالت کی آمدنی سے بنایا تھا دہلی پہنچ کر ایک معمولی سے مختصر مکان میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ مقیم ہوئے اور کفارہ ادا کرنے کی غرض سے ایک حجرے میں سکونت اختیار کرلی تین برس تک وہ اس حجرے میں عبادت وریاضت میں مصروف رہے ان دنوں ان کی خوراک جَو کی روٹی اور ابلا ہوا ساگ ہوا کرتی تھی۔66 جب تین سال اسی طرح زندگی بسر کرتے گزر گئے تو مولوی محی الدین نے ان کو پھر اورنگ آباد طلب کیا اور نصیحت کی کہ رجوع اللہ کے لئے ترک دنیا لازم نہیں ہے صرف یہ کوشش کرو جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ اس نصیحت پر عمل پیرا ہوکر والد نے پھر وکالت کا آغاز کیا مگر اب انداز مختلف تھا ہر موکل کو سب سے پہلے خود ان کی تحقیقات اور جرح وتنقید کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا جب انہیں کامل اطمینان ہوجاتا کہ اس کا معاملہ سچا ہے تب کہیں اس کی وکالت

کرنے پر راضی ہوتے میں اہل معاملہ کا ان سے رجوع کرنا کم ہوتا چلا گیا اور مالی مشکلات بڑھتی چلی گئیں لیکن ان کا مذہبی رنگ اور گہرا ہوتا چلا گیا اور ایسی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی کہ یہ گمان ہی مشکل تھا کہ کبھی انھیں انگریزی تعلیم اور تہذیب کی ہوا بھی لگی ہے ۱۹۱۵ء تک وہ اورنگ آباد میں وکالت کرتے رہے پھر خرابی صحت کے باعث میرے بڑے بھائی ابو محمد67-A کے پاس بھوپال چلے گئے وہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ان کو بالکل بے کار کر دیا چار سال اسی مرض میں مبتلا رہ کر ۱۹۲۰ء میں انتقال فرمایا۔67

فصلِ دوم:۔

ولادت و تربیت

والد کی وفات کے وقت سید مودودی کی عمر سترہ سال تھی وہ ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میری پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ والد مرحوم کے پاس آئے انھوں نے میری پیدائش کی پیشن گوئی کی تھی اور والد سے فرمایا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ چونکہ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی ہمارے خاندان میں گزر چکے تھے، اور انہی کی ذات سے ہندوستان میں ہمارے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس لئے والد نے اس ارشاد کو قبول کیا اور یاد رکھا چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو اس نام سے مجھے منسوب کیا۔68

میرے والد نے میری تربیت خاص توجہ اور محنت کے ساتھ کی، وہ نہ صرف دہلی کے شرفاء میں سے تھے بلکہ شرفاء کی زبان و تہذیب کے پاسدار بھی تھے اور اپنی اولاد میں بھی یہی خوبیاں پیدا کرنے کے خواہش مند تھے، انھوں نے ابتداء سے یہ خیال رکھا کہ میری زبان بگڑنے نہ پائے جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط یا بازاری رنگ چڑھ جاتا تو فوراً تنبیہ فرماتے اور درست ادائیگی کی تلقین کرتے یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان محفوظ رہی، وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھ اپنے دوستوں میں لے

جاتے تھے ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد تھے ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کے باعث میں مہذب عادات سیکھ گیا اور بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی والد کی اس تربیت کی وجہ سے شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔69

میری پیدائش سے قبل ہی کیونکہ میرے والد کا رجحان مذہب کی جانب زیادہ ہوگیا تھا۔ لہٰذا میری پیدائش کے ساتھ ہی انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ مجھے مولوی بنائیں گے، چنانچہ میری تعلیم بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی اور فارسی کے عربی زبان اور فقہ وحدیث کے درس پر زور دیا گیا،اور انگریزی زبان علوم، اور خیالات کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی۔ والد مرحوم کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاق و آداب کی تربیت کا بھی خیال تھا۔70
مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی جو والد کے بعد ان کا بڑا سہارا اور معاشی جدوجہد میں ان کے معاون تھے اپنے بھائی کے بچپن کے اہم واقعات کے ذکر میں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''ابوالاعلیٰ بڑا ذہین بچہ تھا۔ مذہبی امور سے چار سال کی عمر سے ہی شغف تھا، اتنی سی عمر میں والد صاحب کے ساتھ مسجد میں جاکر پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کا عادی ہوگیا تھا، پانچ سال کی عمر میں قرآن مجید کی تقریباً تیں ۳۰ آیات بامعنی یاد ہوچکی تھیں، اور روزے کی عمر کو پہنچے سے پہلے ہی اس نے باقاعدگی سے روزے رکھنے شروع کردیے تھے،ایک دن وہ صبح اٹھا تو اس کا روزہ تھا، گھر والوں کے اصرار کے باوجود اس نے روزہ نہ توڑا اور اس طرح کسی خارجی دباؤ کے بغیر ہی اس نے عمر سے پہلے روزہ رکھ لیا''۔71

ابوالاعلیٰ پانچ برس کے تھے کہ والد کے ہمراہ مسجد میں نماز کے لئے جایا کرتے تھے،ایک روز وہاں پہنچے تو مؤذن نہیں تھے۔ والد صاحب نے ویسے ہی بیٹے سے کہہ دیا تم آذان دے دو یہ کہہ کر وہ ذرا لوگوں کے ساتھ مصروف ہوئے تو اس چھوٹے سے بچے کو لوگوں نے جلدی جلدی وضو کر کے منبر پر چڑھتے ہوئے

دیکھا پھر اس نے اونچی آواز میں اذان لینی شروع کی، والد صاحب غور سے سنتے رہے انہیں پتہ تھا کہ ابوالاعلیٰ نے اذان نہیں سیکھی ہے اس لیے ڈر تھا کہ درمیان میں کہیں بھول نہ جائے، یا اٹک نہ جائے لیکن ابو الاعلیٰ نے بڑے اعتماد کے ساتھ پوری اذان صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کی۔ جب والد صاحب گھر آئے تو ان کا چہرہ خوشی و مسرت کے جذبات سے گلنار ہو رہا تھا، والدہ سے کہنے لگے آج تمہارے بیٹے نے کمال کر دیا، اذان دی اور کہیں بھولا نہ اٹکا، جتنے لوگ مسجد میں موجود تھے سب ہی بہت خوش ہوئے اور انھوں نے ابوالاعلیٰ کو پیار کیا۔72

ابتدائی تعلیم:

سید مودودی کے لیے ان کے والد نے ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ گھر کی یہ تعلیم ان کے لئے مدرسے کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی ان کی معلومات اپنے ہم عمر بچوں سے کہیں زیادہ تھیں، چنانچہ جب انھیں گیارہ سال کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت رشدیہ (آٹھویں جماعت) میں داخل کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اکثر مضامین میں اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ پوری جماعت میں سب سے کم عمر تھے۔73 اس کی وجہ جیسا کہ آفاقی صاحب نے بیان کی ہے، کہ مولانا کے والد وسیع النظر اور روشن خیال شخص تھے۔ انھیں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کا غم کھائے جاتا تھا چنانچہ اس زمانے کے سمجھدار اور حساس لوگوں کی طرح انھوں نے اپنے دونوں بچوں کو کم عمری ہی سے تاریخ اسلام کے ابواب کہانیوں کی صورت میں سنانے شروع کر دیے، آگے چل کر شکوہ ہند، مسدس حالی جیسی کتابوں کی باری آئی اور ان کتابوں کی ضمن میں زبانی طور پر انہوں نے اپنے بچوں کو ہندوستان کے تمام سیاسی حالات سے آگاہ کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بے حسی اور مظلومیت پر وہ خاص طور پر زور دیا کرتے تھے۔ ان حالات میں مولانا نے اپنے دیندار اور اہل علم والد کی زیر نگرانی تربیت پائی۔74

۱۹۱۴ء میں جناب مودودی نے مولوی (میٹرک) کا امتحان دیا۔75 ان کے اپنے بیان کے مطابق

وہ ریاضی میں کمزور ہونے کے باعث درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔ والد صاحب کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی لہٰذا وہ اورنگ آباد کو خیر آباد کہہ کر حیدر آباد آ گئے، اور مجھے دارالعلوم کی جماعت ''مولوی عالم'' میں داخل کرادیا۔ اس زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی صاحب صدر مدرس تھے۔ میں یہاں زیر تعلیم تھا ہی کہ والد صاحب خرابی صحت کے باعث بھوپال چلے گئے جہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور مجھے اپنی تعلیم جو صرف چھ ماہ ہی جاری رہ سکی تھی ترک کر کے بھوپال جانا پڑا اور والد کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔ لیکن ان کی بحالیٔ صحت کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔76 والد کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ ذوقِ مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اپنے مطالعہ سے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ جب میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے بعد میں نے ''آوارہ خوانی'' شروع کی۔ جو کچھ ملا پڑھ ڈالا' ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت ہی خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اٹھتا چلا گیا۔77

تشکیک اور ارتیاب سے ایمان و ایقان کی بنیادیں منہدم ہوگئیں۔ خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہی کیفیت رہی۔ تذبذب و تشکیک کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ عربی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ میں نے قرآن اور حدیث کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق و معارف کھلتے چلے گئے۔ بے یقینی کا غبار ڈھلتا گیا۔ میں نے دوسرے ادیان کی کتابوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ ادیان کے تقابلی مطالعہ نے مجھے ایک گونہ اطمینان عطا کیا۔ دراصل اب میں نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقانیت پر کامل یقین تھا۔78

میلانات و رجحانات:

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ سید مودودی کی زندگی کا نہ صرف آزمائشی دور تھا، بلکہ میلانات و رجحانات کا فکری دور بھی تھا۔ سلسلہ تعلیم کا منقطع ہونا اور والد کی وفات ذہنی و قلبی اذیت کا باعث تھا۔ اب عملی

زندگی اور اس میں پیش آمدہ مسائل مولانا کا امتحان لینے کے لیے تیار تھے۔[79] اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے مولانا کے پاس جو ہتھیار تھا وہ ان کا قلم تھا، ان کو فن تحریر و انشاء پر قدرۃً مہارت حاصل تھی گھر کی تربیت نے اس میں مزید نکھا پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اخبار نویسی کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۱۸ء میں آپ بجنور سے شائع ہونے والے اخبار مدینہ سے منسلک ہوئے لیکن ڈیڑھ دو سال سے زیادہ یہ کام جاری نہ رہ سکا اس کی وجہ غالباً بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے۔

عالمی سطح پر جنگ عظیم اول کے عالم اسلام پر اثرات، خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے خدشات نے مجموعی طور پر ہندوستان کو بھی متاثر کیا، یہاں تحفظ خلافت تحریک کے ساتھ فرنگی تسلط کے خلاف سیاسی تحریک کی ابتداء بھی ہو رہی تھی، اور ہر ذی الشعور شخص کسی نہ کسی طور اس کے خاتمہ کا خواہاں تھا۔ سید مودودی بھی اس صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انجمن اعانت نظر بندان میں شمولیت اختیار کر لی۔[80] آفاقی صاحب کے مطابق یہ ایک خفیہ سیاسی جماعت تھی، جو ہندوستان میں سیاسی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسے اکابرین اس جماعت کے ممبر تھے لیکن اس جماعت سے مولانا کا تعلق رسمی رہا اس جماعت کی حکمت عملی واضح نہ ہونے کے باعث سید مودودی اور ان کے بھائی جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔[81]

لیکن مولانا نے مختصر عرصہ میں بھی اپنی فکری صلاحیتوں کا اظہار کیا، چنانچہ اس جماعت کے روح رواں تاج الدین جو جبل پور سے ایک ہفت روزہ تاج کے نام سے نکالتے تھے انھوں نے اس کی ایڈیٹری کی ذمہ داری سید مودودی اور ان کے بھائی کو دی، لیکن حالات اخبارات کے لئے سازگار نہ تھے۔ لہٰذا مودودی برادران چند ماہ سے زیادہ یہ ذمہ داری ادا نہ کر سکے اور جبل پور سے بھوپال واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔[82] اس مایوس کن صورتحال میں ابوالخیر مودودی نے عملاً صحافت کے پیشے کو ترک کر دیا، جبکہ سید مودودی صحافت کو ذریعہ اظہار فکر بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے، لہٰذا ۱۹۲۰ء میں حالات کی موافقت کے باعث ہفت روزہ تاج کا دوبارہ اجراء ہوا مولانا نے ایک پھر اس سے وابستگی اختیار کی اور ان کی ذاتی کاوشوں سے مختصر عرصہ میں ہی

ہفت روزہ تاج روز نامہ میں تبدیل ہو گیا، اب مولانا کی سرگرمیوں کا میدان بھی وسیع ہو رہا تھا ان کی توجہ سیاست کی اور کی جانب بھی مبذول ہوئی اور تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کی صلاحیتوں کا بھی اظہار ہوا۔

تحریک خلافت کو سرگرم رکھنے کے لیے مولانا نے تحریری کام ترکی سے متعلق دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کر کے کیا، ''ترکی میں عیسائیوں کی حالت'' اور ''سمرنا میں یونانیوں کے انسانیت سوز مظالم'' اردو میں منتقل کر کے تعلیم یافتہ طبقے کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ترکی مہاجرین کی مدد کے لئے اپنے مختصر مشاہرے میں سے چندہ دیا اور اپنی تقریر کے ذریعہ عوامی سطح پر لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔83 جبکہ روز نامہ تاج میں ان کے فکر افروز مضامین کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی اس وقت منقطع ہو گیا جب مولانا کے ایک مضمون پر حکومت کے اعتراض کے باعث اخبار کے ایڈیٹر تاج الدین پر مقدمہ چلا اگرچہ مولانا پر کوئی گرفت نہ ہوئی تھی لیکن اخلاقی دباؤ کے باعث انھوں نے اپنی ذمہ داری پر صحافت کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا،84 اس کے لئے ان کے پاس وسیع مواقع تھے کیونکہ مسلمان اکابرین نے اہل ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لیے اخبار کو ہی ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ جن میں ابو الکلام آزاد مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر نمایاں تھے، اس کے علاوہ مختلف تنظیمیں بھی اپنے اخبارات شائع کرتی تھیں۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے دہلی آ کر جمعیت علمائے ہند کے تحت نکلنے والے اخبار مسلم سے وابستگی اختیار کی اور ۱۹۲۳ء تک بحیثیت مدیر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۴ء میں اسی تنظیم کے تحت شائع ہونے والے سہ روزہ اخبار الجمعیۃ سے منسلک ہوئے اور ۱۹۲۸ء تک ذاتی ذمہ داری پر فرائض ادا کرتے رہے۔85

سبق سوم:۔

شخصیت اور سیرت کا نشو و ارتقاء

دہلی میں قیام کے دوران مولانا نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد شریف اللہ خان مدرس دار العلوم مسجد فتح پوری دہلی سے متداول علوم کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی مدرس عالیہ فتح پوری دہلی سے علوم حدیث، فقہ اور عربی کی سند حاصل کی۔86 ۱۹۲۸ء میں اسی مدرسے سے جامع ترمذی اور موطا امام مالک کا سماع کیا۔ یہاں سے سند فراغ حاصل کی۔ اسی دور میں استاذ الاساتذہ مولانا عبدالسلام نیازی چشتی دہلوی سے خیر آبادی فلسفہ کی تکمیل کی۔87 بعد میں جامعہ عثمانیہ کی خواہش پر میر باقر داماد کی کتاب ''اسفار اربعہ'' میں سے دو کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حصول اسناد کے ساتھ ساتھ مولانا کے ذاتی مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اپنی مدت مطالعہ سے متعلق ان کا بیان ہے کہ ۱۹۲۸ء میں الجمیعۃ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد پانچ سال میں نے صرف لکھنے اور پڑھنے اور اپنی علمی استعداد بڑھانے میں صرف کیے۔88

مولانا الجمیعۃ کے مدیر ہی تھے کہ ۱۹۲۶ء کے آخر میں شدھی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ پیش آیا جو ایک مسلمان عبدالرشید کے ہاتھوں ہوا تھا۔89 ہندو اخبارات میں اس کی جانب یہ خیالات منسوب کیے گئے تھے کہ اس نے مذہبی تعصب کی بنا پر سوامی کو قتل کیا ہے اور یہ کہ اس نیک کام کو کرنے سے وہ جنت کا امیدوار ہے ایسے تاثرات کی اشاعت کے باعث اسلام کے دشمنوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انھوں نے علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی جرائد اور عمائد ملت کی متفقہ تصریحات کے باوجود اس واقعہ کو طبعی حدود تک محدود رکھنے کے بجائے امت مسلمہ کو بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا اور اعلانیہ قرآن کریم پر اس قسم کے الزامات عائد کرنے لگے کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے اس کی تعلیم امن و سلامتی کے خلاف ہے، اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر

کو گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اس کو قتل کرکے جنت میں جانے کی امید کرتے رہتے ہیں۔[90] بس دریدہ دہنوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے، امن قائم نہیں ہوسکتا اس لئے تمام عالم انسانی کو اس تعلیم کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان غلط خیالات کی نشر واشاعت اس کثرت کے ساتھ کی گئی کہ گاندھی جیسے شخص نے جو ہندو جاتی میں سب سے بڑے صاحب الرائے ہیں اس خیال کا اظہار رکھا کہ:

''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے''۔[91]

ایسے بیانات سے ہندوستان میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور اسلام پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔ ان بہتان تراشیوں اور دشنام طرازیوں پر زعمائے اسلام افسردہ تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے جامع مسجد دہلی میں جمعہ کے خطبے کے دوران فرمایا:

''اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی بندہ خدا اسلام کے صحیح تصور جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے جس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات اور الزامات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہوں۔[92]

اس اجتماع میں سید مودودی بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے اسلام کی مدافعت کے لئے علمی وتحقیقی کاوشوں کا آغاز کیا[93] اور الجمیعۃ میں الجہاد فی الاسلام کے نام سے مقالات کا سلسلہ شروع کیا، اسلامی قانون جنگ وصلح پر ان پر مغز مضامین کی تحریر کے وقت مولانا کی عمر فقط ۲۴ سال تھی،[۹۴] گویا انھوں نے کم عمری میں ہی برصغیر کی علمی زندگی پر اپنے گہرے اثرات ثبت کردیتے تھے۔ ان مقالات کو ہندوستان کے چوٹی کے دانشوروں نے سراہا جن میں مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال نمایاں ہیں۔[95]

علامہ کو سید مودودی کی تالیف الجہاد فی الاسلام پسند آئی وہ کہا کرتے تھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ جنگ و جہاد کے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں انہیں کسی تاویل یا تعبیر کے بغیر بڑے کرّ و فر سے پیش کیا۔96 ۱۹۲۸ میں مولانا الجمیعۃ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے اور خود کو تحقیق و تصنیف کے لئے وقف کر دیا۔ تاریخ کا موضوع آپ کی خاص دلچسپی کا مرکز تھا چنانچہ آپ نے ۱۹۳۱ء تک کے عرصہ میں تاریخ آل سلجوق کی تالیف کی اور تاریخ ابن خلکان کے ان حصوں کا ترجمہ کیا جو مصر کے فاطمی خلفاء سے متعلق تھے اس کے علاوہ تاریخ دکن اور آصف جاہ کی سیرت پر بھی کتاب تصنیف کی۔97

۱۹۳۲ء میں سید مودودی نے اپنے آزادانہ اظہار کے لئے ''ترجمان القرآن'' کو ذریعہ بنایا اور اس ماہنامہ کی عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لی ترجمان القرآن کے بانی ابو محمد مصلح علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے اور وہ اپنا پرچہ باقاعدگی سے علامہ کو بھیجتے تھے۔ سید مودودی کے دور ادارت میں بھی پرچہ ان کے نام جاتا رہا علامہ، مولانا کا رسالہ جستہ جستہ مقامات سے پڑھوا کر سننے کے عادی تھے۔98 ۱۹۴۰ء تک کی مختصر مدت میں مولانا کے تحقیقی مضامین کی فہرست اتنی طویل ہوگئی جو وقتاً فوقتاً کتابوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے جن میں اسلامی تہذیب اور اس کے اصول مبادی، تفہیمات، پردہ، تنقیحات، مسئلہ قومیت، تحریک آزادی ہند اور مسلمان شامل ہیں۔99

علمی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مولانا نے ۱۹۳۷ء میں خانگی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں ان کی زوجہ محترمہ دہلی کے متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کی شادی کو مختصر عرصہ ہی گزرا تھا کہ پرآسائش زندگی کو خیر آباد کہہ کر قصبہ پٹھان کوٹ کے گاؤں جمال پور میں اقامت اختیار کرنی پڑی۔100 اس کی وجہ مولانا کے نزدیک مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اسلامی اقدار کے احیاء اور اصلاح کا منصوبہ تھا جس کی ترغیب ان کو ہندوستان کے فلسفی شاعر علامہ اقبال نے دی تھی کیونکہ وہ ''الجہاد فی الاسلام'' کے علاوہ ترجمان القرآن میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین سے بھی متاثر تھے اور مولانا کو مسلمانان ہند کے مسیحا کی

نظر سے دیکھ رہے تھے۔101

علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ایک ایسا علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں سے اہل علم، اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں اور دنیا کے مسلمہ اصولوں کے مطابق دین الٰہی کی حقانیت ثابت کریں۔ اس غرض سے علامہ کے دوست اور عقیدت مند چودھری نیاز نے مارچ ۱۹۳۶ء میں اپنی ساٹھ ایکڑ کی زمین بمعہ چند ضروری مکانات، مسجد، کتب خانہ اور ایک دارالاقامۃ تعمیر کر کے علامہ کے تصور کو ایک ادارہ کی صورت میں ڈھال دیا تھا، علامہ اور چوہدری نیاز نے اس ادارے کے لئے رفیق کار فراہم کرنے کی غرض سے شیخ الازہر مصطفیٰ دائمی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبداللہ سندھی، عبداللہ یوسف علی، علامہ محمد اسد جیسے مشاہیر سے رابطہ قائم کیا لیکن جامعہ ازہر سے کوئی عالم نہ آسکا اور اندرون ملک علمائے دین اپنے اپنے مراکز کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر علامہ کی مردم شناس نگاہیں مودودی پر پڑیں جن کا الجمعیۃ کے مدیر اور نامور مصنف کی حیثیت سے اپنا ایک مقام تھا۔102

اقبال نے مولانا کو مشورہ دیا کہ جو دعوت آپ پیش کر رہے ہیں اس کا کسی ریاست سے اٹھنا سود مند نہیں انگریز کسی وقت بھی والیٔ ریاست کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا سکتا ہے اس لیے آپ غلامی در غلامی کے ماحول سے نکل کر انگریزی علاقے میں آجائیں103 چنانچہ مارچ ۱۹۳۸ء کو مولانا علامہ کی درخواست پر شہر کی پر آسائش زندگی ترک کر کے پٹھان کوٹ (جسے دارالاسلام کا نام دیا گیا) کے غیر آباد اور سہولیات سے محروم علاقے میں محض مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی بحالی کی خاطر منتقل ہو گئے۔ اسی مرکز کے بارے میں مولانا نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا:

> ''یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہم کو ایک آزاد ماحول میسر آسکتا ہے۔ جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں اس الگ تھلگ باہمہ و بے ہمہ مقام پر جس تخیل کو ہم عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں کہ اس وقت جیسے کچھ حالات بھی ہندوستان کے ہیں انہی میں کم از کم زمین کا

ایک گوشہ ہم پہنچایا جائے، جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جاسکے''۔104

اگر چہ دونوں دانشوروں کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرسکیں،105 لیکن قدرت نے علامہ کو اس کی تکمیل کا موقع نہ دیا اور ۲۱راپریل ۱۹۳۸ء اکا وصال ہوگیا اور مولانا اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے تنہا رہ گئے۔ علامہ کی وفات پر مولانا نے مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہونے والے ترجمان القرآن میں اپنے قلبی جذبات کا اظہار اا لفاظ میں کیا تھا۔

''مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال ہی کی ذات تھی میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کرسکوں گا اور ان کی رہنمائی میں مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا اسلام اور مسلمانوں کے لئے کروں گا اب ایسا محسوس کررہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا ہو دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی ہے صرف اس خیال سے دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہ اقبال مرگئے تو کیا ہوا خدا تو موجود ہے میں چاہتا تھا کہ ان کے پسماندگان کو خط لکھوں مگر پھر خیال آیا کہ ان کے پسماندگان تو ہم سب ہیں اور ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں''۔106

سید مودودی نے دارالسلام میں اپنے کام کا آغاز کیا ہی تھا کہ ڈھائی تین ماہ کے بعد چوہدری نیاز سے اختلافات کے باعث انہیں یہاں کی سکونت ترک کر کے لاہور منتقل ہونا پڑا۔ یہاں انہوں نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ لاہور کے معروف تعلیمی اداروں نے مولانا کو اپنے افکار کے اظہار کے لئے پلیٹ فارم بھی فراہم کیا۔107

سید مودودی دراصل مسلمانوں کو مقامی سیاسی حالات میں الجھے رہنے کے بجائے ایک اسلامی تحریک کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر مسلمان اسلام کے اصولوں پر اپنی انفرادی زندگی میں عمل کریں اسلامی اصولوں پر ان کی تنظیم ہو اور اسلام کے غلبہ کے لئے انبیاء علیہ السلام کے طریقہ

پر دعوت کا کام کریں تو آپ ہر مشکل کو حل کریں گے۔108

اب مولانا کی فکر ان کی ذات کی حد تک محدود نہ رہی تھی بلکہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی ۱۹۴۱ء میں آپ نے ایک تنظیم جماعت اسلامی کے نام سے قائم کی اور بالاتفاق اس کے سربراہ مقرر ہوئے اور ۱۹۷۲ء تک اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے لیکن خرابی صحت کا باعث دست کش ہو گئے۔ 109

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر دو خود مختار ممالک پاکستان اور ہندوستان کی صورت میں تقسیم ہو گیا تو جماعت بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئی اور مودودی نے پاکستان منتقل ہو کر جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت سنبھالی۔110 مولانا کے پیش نظر سب سے اہم مقصد پاکستان میں اسلامی ریاست و معاشرہ کا قیام تھا جبکہ حکمرانوں کے مقاصد و ترجیحات مولانا کے متضاد اور متصادم تھیں۔ نتیجتاً حکومت کو مولانا کے خلاف کارروائیاں کرنی پڑیں جس کے باعث متعدد بار مولانا کی گرفتاریاں عمل میں آئیں لیکن مولانا نے صبر و استقامت، پختہ عزم و حوصلے کا مظاہرہ کر کے اپنا وقار بلند کیا اور عالمی سطح پر اپنی اہمیت و حیثیت کو تسلیم کرایا۔111

۱۹۵۳ء میں ہونے والی مولانا کی گرفتاری انتہائی سنجیدہ نوعیت کی تھی جس میں انہیں سزائے موت سنائی گئی تھی اس کی وجہ تحریک ختم نبوت اور عوام کا قادیانیوں کو غیر مسلم اور اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ تھا۔ اس نکتہ نظر کو واضح کرنے کے لئے سید مودودی نے ''قادیانی مسئلہ'' نامی کتاب لکھ کر حکومت وقت کو اس مسئلے کی معقولیت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کتاب کو بنیاد بنا کر وہ مارچ ۱۹۵۳ء میں گرفتار کئے گئے اور مئی ۱۹۵۳ء میں انھیں سزائے موت سنائی گئی جو بعد میں عالمی وعوامی دباؤ کے باعث عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ اس دوران وہ اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن میں مصروف رہے۔112

سید مودودی نے کئی جہتوں میں انتہائی فعال زندگی گزاری ہے بحیثیت عالم، مفکر و مصلح، سیرت نگار، نثر نگار، مفسر، مدرس، صحافی، ماہر قانون، ماہر معاشیات، سیاستدان انھوں نے اپنی ذات کو اسلام کی تفہیم و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۴ء تک مولانا نے اسلامی دنیا کے متعدد دورے کیے اور

قاہرہ، دمشق، عمان، مکہ، مدینہ، جدہ، کویت، ارباط، استنبول، لندن، نیویارک، تورنٹو اور کتنے ہی دوسرے بین الاقوامی مراکز میں خطاب کیا۔ انہی سالوں میں آپ نے کوئی دس بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت بھی کی۔ ۶۰۔۱۹۵۹ء میں سعودی عرب، اردن بشمول فلسطین، شام اور مصر کا مطالعاتی دورہ بھی کیا۔ اور فریضۂ حج بھی ادا کیا۔113 دسمبر ۱۹۶۱ء میں سید مودودی ایک بار پھر سرزمین حجاز میں تھے اس دفعہ وہ شاہ سعود کی خاص دعوت پر مدینہ میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی کے لئے اپنی مفصل اسکیم لے کر پہنچے تھے اس وقت ان کی حیثیت شاہی مہمان کی تھی۔114 ۱۹۶۲ء میں اس یونیورسٹی کے قیام سے لے کر آخری دم تک اس کی اکیڈمک کونسل کے رکن رہے۔ آپ رابطۂ عالم اسلامی مکہ کی تاسیسی کمیٹی اور اکادمی برائے تحقیق فقہ اسلامی مدینہ کے رکن بھی تھے۔115

۱۹۷۲ء میں آپ کی معرکۃ الآراء تفسیر تفہیم القرآن کی تکمیل ہوئی جس کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا اس کی قرات اور فہم صرف اردو دان طبقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ سندھی، پنجابی، انگریزی اور ترکی زبانوں میں بھی اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔116 اس لحاظ سے تفہیم القرآن عالمگیر شہرت کی حامل تفسیر ہے گویا آپ کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل تھی جس میں اصلاح معاشرہ کے پیش نظر تصنیف و تالیف، تراجم، تنظیمی سرگرمیاں، درس و تدریس اور سیاسی امور کی دیکھ بھال نے آپ کی صحت کو متاثر کیا یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں آپ جماعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔117 لیکن تصنیف و تالیف اور اراکین جماعت کی تربیت اور رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کی صحت بالکل ہی جواب دے گئی اور آپ علاج کی غرض سے امریکہ چلے گئے ۱۹۷۹ء کئی حوالوں سے مولانا کی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے ۲۸ر فروری ۱۹۷۹ء میں آپ کی اعلیٰ اسلامی خدمات کے باعث سعودی حکومت نے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا،118 جو آپ کے ساتھ پاکستان کے لئے بھی بڑا اعزاز تھا۔ اگست ۱۹۷۹ء میں مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی کا انتقال ہوا جو مولانا کے لیے سانحہ عظیم تھا۔119 ۲۳ر ستمبر کو سید مودودی بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ گئے جو آج تک پر نہ ہوسکا۔

حوالہ جات

1- مولانا کا شجرہ (حوالہ جات کے آخر میں منسلک ہے) بحوالہ گیلانی، اسعد۔ (۱۹۸۶ء)، سیّد مودودی، دعوت وتحریک، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۵۵ سے ۵۸

1A- نعمانی، عاصم۔ (اکتوبر ۱۹۷۲ء) تصوف اور تعمیر سیرت، اشاعت اوّل، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۳۰۔۳۲

2- محمد، یوسف۔ نومبر ۱۹۵۵ء، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔ لاہور: مکتبۂ الحبیب، اچھرہ، ص ۳۱

3- نظامی، خلیق احمد۔ س ن، ''تاریخ مشائخ چشت'' کراچی، مکتبہ عارفین، ص ۱۳۵، ندوۃ المصنفین کی کتاب مطبوعہ مئی ۱۹۵۳ء سے استفادہ شدہ

4- ایضاً

5- داراشکوہ، شہزادہ۔ مئی ۱۹۸۶ء، سفینۃ الاولیا، طبع ہفتم، ترجمہ، محمد علی لطفی، کراچی: نفیس اکیڈمی ص ۱۲۴

6- نظامی، خلیق احمد۔ تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۷

7- ایضاً

8- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں۔ ص ۳۱

9- محمد، ذکریا، مولانا۔ س ن، تاریخ مشائخ چشت، ترتیب، محمد شاہد سہارنپوری، کراچی: مجلسِ نشریات اسلام، ص ۱۵۳

10- سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۴، محولہ بالا

11- جامی، نور الدین عبدالرحمٰن۔ س ن، نفحات الانس بار دوم، ترجمہ، حافظ سید احمد علی، لاہور: اللہ والے کی قومی دکان، کتب بازار کشمیری، ص ۳۵۵

12- مولانا محمد ذکریا، تاریخِ مشائخ چشت، ص ۱۵۴

13- ایضاً

14- ایضاً

15- سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۵

16- نفحات الانس، ص ۳۵۵

حواشی۔ ابوالحسن ندوی نے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' جلد ۳، ص ۲۳ میں وضاحت کی ہے کہ محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا، اگر خواجہ ابو محمد کا سن وفات درست ہے تو اس سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالباً مولانا جامی کی مراد حملہ ہندوستان سے ہے۔ سومنات سے پہلے ہندوستان پر محمود کے آٹھ حملے ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی حملے میں (غالباً پہلے حملے میں) ابو محمد ساتھ ہوں گے۔

17- خالد، سلیم منصور، (س ن) وثائق مودودی، لاہور: ادارہ معارف اسلامی منصورہ۔ ص ۹۷

18- مولانا محمد ذکریا۔ تاریخِ مشائخ چشت، ص ۱۵۷

19- وثائق مودودی، ص ۹۷، محولہ بالا

20- سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۵

21- نفحات الانس، ص ۳۵۶

22- امیر خورد، سیّد مبارک علوی۔ (اپریل ۱۹۸۶ء)، سیر الاولیاء، طبع دوم، ترجمہ، اعجاز الحق قدوسی، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ۱۲۰۔۱۲۱

23- سفینۃ الاولیاء۔ ص ۱۲۵

24- چشتی شیخ عبدالرحمٰن۔ (۱۹۸۲ء)، مراۃ الاسرار، ترجمہ، کپتان واحد بخش سیال، لاہور: صوفی فاؤنڈیشن، ص ۴۵۸، جلد اوّل

25- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۸۸ء)، سلاجقہ، اشاعت سوم، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ص ۳۵

26- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۲

27- مولانا محمد ذکریا، ''تاریخِ مشائخ چشت'' ص ۱۵۹

28- مراۃ الاسرار، ص ۴۹۳

29- نفحات الانس، ص ۳۵۷۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۵

30- مولانا محمد ذکریا، تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۹

31- وثائق مودودی، ص ۹۷

32- مراۃ الاسرار ص ۴۹۲

33- نفحات الانس، ص ۳۵۸۔ ۳۶۰

34- مراۃ الاسرار، ص ۳۹۴۔ ۳۹۵

35- نفحات الانس، ص ۳۶۰

36- مولانا محمد ذکریا، تاریخِ مشائخ چشت، ص ۱۵۹

37- سیر الاولیاء، ص ۱۲۳

38- نفحات الانس، ص ۳۶۰

39- مراۃ الاسرار۔ ص ۴۹۹

40- سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۳

41- مولانا محمد ذکریا، تاریخِ مشائخ چشت، ص ۱۶۰

42- سفینۃ الاولیاء، ص ۱۲۷

حواشی۔ خواجہ ہرونی کا مزار مکہ معظمہ میں ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا آبائی وطن سیستان ہے، حسینی سادات سے تعلق ہے۔ ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے سردار ہیں۔ شیخ عثمان ہرونی فرماتے ہیں کہ

ہمارے معین الدین خدا کے محبوب ہیں۔ مجھے اپنے ان جیسے مرید پر فخر ہے۔ (حوالہ ایضاً، ص ۱۲۸

43- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۲

44- عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۵۴ء)، تذکرہ اولیائے کرام، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۳۳

45- کوثر، انعام الحق، (۱۹۸۶ء) ''تذکرہ صوفیائے بلوچستان'' اشاعت دوم، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ۲۱

46- ایضاً، ص ۳۷

47- ایضاً، ص ۲۷

48- ''وثائق مودودی'' ص ۹۷

49- مودودی، ابوالاعلیٰ، (فروری ۱۹۹۷ء)، ''تجدید احیائے دین''، اشاعت ۲۹، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۱۵۰

50- ایضاً

51- ایضاً

52- ایضاً

53- ایضاً، ص ۸۵

54- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (دسمبر ۱۹۹۹ء)، تصوف کیا ہے، اشاعت اوّل، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۷

55- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۳

56- عبد، عبدالرحمٰن، چوہدری۔ (۱۹۸۸ء) ''مفکرِ اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودی''، اشاعت سوم، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۴۷

حواشی۔ مولانا مودودی اپنے ننھیال کے بارے میں اپنے ایک خط میں جو انہوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد (معتمد مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی) کو تحریر کیا لکھتے ہیں۔ ''میں صرف غالب کے کلام کا

ہی مداح نہیں ہوں بلکہ ان سے میرا ایک ذاتی تعلق بھی ہے۔ میرے نانا مرزا قربان علی بیگ سالک مرحوم ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان کا مکان بھی دہلی میں میری ننھیال کے مکان سے متصل تھا۔ اس طرح میں نے آنکھیں ہی ایک ایسے خاندان میں کھولی ہیں جو ان کے کلام ہی سے نہیں ان کی ذات سے بھی قریبی تعلق رکھتا تھا، بحوالہ، مکاتب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، مرتب عاصم نعمانی ۱۹۷۰ء، طبع اوّل، لاہور: ایوان ادب، جلد اوّل خط نمبر ۱۵۹۔ ص ۲۳۱

-57 سلیم، سیّد محمد، پروفیسر۔ (اکتوبر ۱۹۹۴ء) ''مولانا مودودی کی تحریر کی خصوصیات'' ماہنامہ افکارِ معلم، جلد ۶، شمارہ ۱۰، لاہور: ایک پارک بہاول شیر روڈ، ص ۱۸

-58 ''مفکر اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودی'' ص ۴۷

-59 ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں'' ۳۴

-60 خرم، بدر۔ (ستمبر ۱۹۸۸ء) ''مولانا مودودی کی سیاسی زندگی''، کراچی: صبا پبلیکیشنز، ص ۹۴

-61 ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں''، ص ۵۳

-62 یہ انٹرویو سیّد الطاف حسین قریشی نے ۱۹۵۳ء میں مولانا کی موت کی سزا اور رہائی کے بعد لیا تھا۔ بحوالہ مولانا مودودی کی سیاسی زندگی، ص ۹۵

-63 ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں''، ص ۳۵۔۳۶

-64 آفاقی، علی سفیان۔ (۱۹۵۸ء)، ابوالاعلیٰ مودودی، اشاعت دوم، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ص ۶۱

-65 مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۳۷

-66 آفاقی، ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۶۱

-67 ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں'' ص ۳۸

-67-A ابومحمد، سیّد احمد کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ مولانا مودودی اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں ''میرے بڑے بھائی ابومحمد صاحب مئی ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے، ۱۹۳۸ء کے وسط میں ان کا انتقال

ہوا جب میں دارالاسلام میں تھا، ابوالقاسم جوان سے چھوٹے تھے نومبر ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ میرے حقیقی بھائی ابوالخیر دسمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔

وثائق مودودی، ص ۹۷

68- ایضاً

69- آفاقی، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۴۸۔۴۹

70- گیلانی، سیّد اسعد۔ (۱۹۸۶ء) سیّد مودودی، دعوت و تحریک ۱۹۸۶ء، اشاعت دوم، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۲۶۔۲۷

71- ''مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی''۔ص ۵۱

72- ایضاً

73- ایضاً، ص ۵۴

74- آفاقی۔''سیّد ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۶۳

75- سفیر اختر صاحب نے اپنی کتاب ''ادب اور ادیب سیّد مودودی کی نظر میں''، میں تصحیح کی ہے کہ سیّد مودودی نے مولوی کا امتحان ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) میں دیا۔ نتیجے کا اعلان ۹ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ کو ہوا تھا۔

76- ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں''، ص ۴۱۔۴۲

77- ''مولانا مودودی کی سیاسی زندگی''، ص ۹۶

78- ایضاً، ص ۹۷

79- ''سیّد مودودی، دعوت و تحریک''، ص ۲۷

80- ''مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں''، ص ۴۳

81- آفاقی، ''سیّد ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۶۴

-82 مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۴۴

-83 ''مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۶۵

-84 ''سیّد مودودی، دعوت وتحریک'' ص ۱۷۱۔۱۷۲

-85 مولانا محمد علی جوہر کی خواہش تھی کہ مودودی، ان کے اخبار ''ہمدرد'' سے وابستگی اختیار کریں، لیکن آپ نے الجمیعۃ کو ترجیح دی، (بحوالہ مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۴۶

-86 سلیم، سیّد محمد، پروفیسر۔ (نومبر ۱۹۹۶ء) ''مولانا مودودی کا مذاہب عالم کا مطالعہ''، ماہنامہ افکارِ معلم، جلد نمبر ۸، شمارہ ۱۱، لاہور: ۱۸۷ ذیلدار پارک، ص ۲۰

-87 مولانا مودودی کی تعلیمی اسناد کی نقول باب کے آخر میں منسلک ہیں۔

-88 مولانا مودودی کا مذاہب عالم کا مطالعہ، ص ۲۰

-89 ''مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی''، ص ۷۱

-90 مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۷۴ء) الجہاد فی الاسلام، اشاعت ششم، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۷

-91 ایضاً، ص ۱۸

-92 سیّد مودودی کی سیاسی زندگی، ص ۹۸

-93 عراقی، عبدالرشید، مولانا۔ (مئی ۲۰۰۴ء) ''مردِ مومن۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی'' ماہنامہ ترجمان القرآن، اشاعتِ خاص۔۲، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۴۶

-94 ایضاً

-95 ''مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی''۔ ص ۷۲

-96 ایضاً

-97 مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص ۴۹

-98 مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۱۲۳

99- ایضاً،ص ۹۳

100- ایضاً،ص ۱۲۱

101- غلام محمد، چوہدری۔ (اکتوبر ۱۹۹۱ء) ''تاریخ جماعت اسلامی تاسیسی پسمنظر'' تذکرہ، مرتبین جمیل احمد رانا، سلیم منصور، خالد، اکتوبر ۱۹۹۸ء لاہور: ادارہ معارف اسلامی، جلد دوم، ص ۴۸۰

102- فاروقی، ابوراشد۔ (جولائی ۱۹۷۷ء)، اقبال اور مودودی، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، ص ۱۷۔ ۱۸

103- مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۱۲۵

104- ایضاً، ۱۳۶

105- اقبال اور مودودی، ص ۶۲

106- خالد، سلیم منصور۔ ''وثائق مودودی''، سن اشاعت ندارد، لاہور: ادارۂ معارف اسلامی ص ۹۶

107- مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی، ۱۴۹

108- ایضاً، ص ۱۴۷

109- ایضاً، ۱۶۸

110- خورشید احمد، پروفیسر۔ انصاری، ظفر اسحاق، ڈاکٹر۔ احیائے اسلام اور مولانا مودودی۔ تذکرہ، جلد ۲، ص ۲۱

111- ایضاً

112- مفکرِ اسلام، ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۵۹

حواشی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت کو استحکام دینے اور جہاد کو احکام اسلام سے خارج کرنے کے لیے مسلمانوں میں ایک مذہبی گروہ پیدا کیا۔ جس نے انگریزوں کے سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لیے قادیان (پنجاب) میں ایک نئی وحی اتاری اور اسلام کے مرکزی عقیدہ ختمِ نبوت کو بُری طرح مجروح کیا۔ بات اس سے بہت آگے کی نکلی، مرزا غلام احمد قادیانی کی یہ تحریک صرف ہندوستان

کے لیے نہیں پوری دنیائے اسلام کے خلاف ایک زبردست دجالی کارروائی ہے۔ (بحوالہ، احتساب قادیانیت جلد۴، مصنفین۔ انور شاہ کاشمیری، شبیر احمد عثمانی، اشرف علی تھانوی، سیّد بدر عالم میرٹھی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء، طبع اوّل، ملتان عالمی مجلسِ ختم نبوت۔ ص۴)

113- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۲۰۰، یہ دورے خالص علمی تحقیقی اور تاریخی مقاماتِ ارض القرآن کے مشاہدات سے متعلق تھے۔ مولانا مودودی اپنی مشہور تفسیر، تفہیم القرآن کے لیے ارض القرآن کے مختلف مقامات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے، بحوالہ ایضاً، ص ۲۰۲

114- مفکرِ اسلام، ص ۲۹۳

115- احیائے اسلام اور مولانا مودودی۔ ص ۲۳

116- ایضاً، ص ۴۳

117- سیّد مودودی، دعوت وتحریک، ص ۴۸۶

118- Sarwat Saulat (Nov 1979) Maulana Maududi, Intenational Islamic Publisher. Karachi. P.114

119- نعیم، صدیقی۔ (۱۹۹۸ء)، المودودی، اشاعت پنجم، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ص ۳۸۳

شجرۂ نسب:

میرا خاندانی شجرۂ نسب درج ذیل ہے:۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی ———— (۱۳۲۱ھ – ۲۸ شوال ۱۳۹۹ھ)

ابن

مولوی سید احمد حسن رح ———— (۱۲۷۳ھ – ۱۳۳۹ھ)

ابن

سید حسن رح ———— (۱۲۲۰ھ – ۱۳۲۱ھ)

ابن

سید وارث علی رح ———— (۱۱۷۲ھ – ۱۲۵۴ھ)

ابن

سید شاہ عبدالمعز رح ———— (۱۱۳۲ھ – ۱۱۹۹ھ)

ابن

حافظ سید شاہ عبدالوالی رح ———— (۱۰۶۲ھ – ۱۱۵۷ھ)

ابن

سید شاہ عبدالباقی رح ———— (۱۰۲۶ھ-۱۱۱۰ھ)

ابن

محدث سید شاہ عبدالہادی رح ———— (۹۹۲ھ-۱۰۸۲ھ)

ابن

سید شاہ عبدالشکور رح ———— (۹۶۰ھ-۱۰۴۰ھ)

ابن

سید شاہ عبدالغنی رح ———— (۹۲۹ھ-۹۸۶ھ)

ابن

سید شاہ عبدالصمد رح ———— (۸۹۴ھ-۹۸۲ھ)

ابن

سید شاہ عبدالحی رح ———— (۸۶۲ھ-۹۴۷ھ)

ابن

سید شاہ عبدالعلی رح ———— (۸۲۶ھ-۹۴۷ھ)

ابن

سید شاہ ابوالاعلیٰ جعفر رح ———— (۷۸۲ھ-۹۱۶ھ)

ابن

سید محمد شاہ خواجگی رح ———— (۷۴۲ھ-۸۲۴ھ)

ابن

سید نظام الدین علی رح ———— (۷۰۸ھ-۸۰۸ھ)

ابن

سید قطب الدین ابو احمد رح ———— (۶۸۷ھ-۷۵۴ھ)

ابن

سید تقی الدین محمد رح ———— (۶۲۶ھ-۷۳۵ھ)

ابن

سید اوحد الدین احمد رح ———— (۶۴۵ھ - ۷۱۲ھ)

ابن

سید ضیاء الدین محمد رح ———— (۶۲۷ھ - ۶۹۹ھ)

ابن

سید قطب الدین محمد رح ———— (۶۰۲ھ - ۶۸۰ھ)

ابن

سید نظام الدین احمد رح ———— (۵۸۴ھ - ۶۲۴ھ)

ابن

سید رکن الدین محمد رح ———— (۵۴۵ھ - ۶۳۵ھ)

ابن

سید نجم الدین ابو احمد رح ———— (۴۹۲ھ - ۵۷۷ھ)

ابن

سید المشائخ قطب الدین مودود چشتی رح ———— (۴۳۰ھ - ۵۲۷ھ)

ابن

سید ابو یوسف یعقوب چشتی رح ———— (۳۷۵ھ - ۴۵۹ھ)

ابن

سید ابو الحسن محمد رح ———— (۳۳۱ھ - ۴۰۶ھ)

ابن

سید ابو النصر سمعان رح ———— (- ۳۹۸ھ)

ابن

سید ابو جعفر ابراہیم رح ———— (- ۳۶۰ھ)

ابن

سیدابوعبداللہ محمد رح ———— (۲۹۵ھ - ۳۵۲ھ)

ابن ۲۱

سیدابومحمد الحسین رح ———— (۲۷۰ھ - ۳۲۴ھ)

ابن

سیدابوابراہیم عبداللہ علی اکبر رح ———— (۲۳۸ھ - ۲۹۲ھ)

ابن

سیدابوالحسن علی النقی رضی اللہ عنہ ———— (۲۲۴ھ - ۲۵۴ھ)

ابن

سیدابوجعفر محمد التقی رضی اللہ عنہ ———— (۱۹۵ھ - ۲۲۰ھ)

ابن

سیدابوالحسن علی رضا رضی اللہ عنہ ———— (۱۵۳ھ - ۲۰۳ھ)

ابن

سیدابوالحسن موسیٰ الکاظم رضی اللہ عنہ ———— (۱۲۸ھ - ۱۸۳ھ)

ابن

سیدالامام الزکی ابوعبداللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ ۔(۸۰ھ - ۱۴۸ھ)

ابن

سید سادۃ الاعلام ابوجعفر محمد الباقر رضی اللہ عنہ ———— (۵۷ھ - ۱۱۴ھ)

ابن

سیدالامام الہمام علی زین العابدین رضی اللہ عنہ ———— (۳۸ھ - ۹۴ھ)

ابن

سیدالشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ ———— (۴ھ - ۶۱ھ)

ابن

امام المتقین حضرت علی کرم اللہ وجہہ ———— (۰ھ - ۴۰ھ)

دولت آصفیہ دکن صانہا اللہ عن الشرور والفتن

امتحانات علوم و السنۂ مشرقیہ

بابتہ سنہ ۱۳۳۵ھ مطابق سنہ ۱۳۲۶ف

تصدیق کیجاتی ہے کہ ابوالاعلیٰ بن سید احمد حسن صاحب طالب علم مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد امتحانات علوم والسنۂ مشرقیہ دولتِ آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کے امتحان مولوی مین بمقام بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد دکن بدرجہ دوم کامیاب ہوا اور اُسکا نمبر بلحاظ سلسلۂ کامیابان (۶) ہے

مہتمم امتحانات دولت آصفیہ
و ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

مہتمم امتحانات دولت آصفیہ

حیدرآباد دکن مورخہ ماہ ۱۳

بسم الله الرحمن الرحيم

سُبحان الملك الحی الذی لاینام ولایموت سبوح قدوس ربنا ورب الملئكة والروح، عالم الغيب والشهادة، وهو اللطيف الخبير، والصلوة والسلام على حبيبه الاعظم وخليله الاكرم، سيد ولد آدم، وصفوة الصفوة من جميع العالم محمد المصطفى وعلى آله المجتبى

وبعدُ فان العلوم على تشعب فنونها وتكثر شجونها ارفع المطالب وانفع المآرب، وقد منّ الله تعالى من عباده على من اعتنى لطلبها واخذها وفاز بحصولها واتقانها، وكان منهم من حوى الفضائل الانسية ورقى المعارج السنية فقرأ جملة الكتب الانتهائية من العلوم العقلية والنقلية والادبيه، بغاية من التحقيق ونهاية من التدقيق، فبرع فيما قرأ علیّ، وهو الفاضل الذكی والمتوقد الالمعی المولوی السيد ابوالاعلى المودودی، وبعد البلوغ مرتبة التكميل، طلب منی اجازة عامة لعلوم العقلية والبلاغة، والادبيه وسائر العلوم الاصلية والفرعيه، فاسعفته بمطلوبه ومرغوبه وارجو منه ان لاينسانی من صالح دعواته فی جميع اوقاته واوصيه و ایای بتقوى الله فی السر والعلن، ومتابعة الكتاب والسنن، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وصحبه اجمعين

حرره المجيز الحقير الراجی الی الله محمد شريف الله عفی عنه الله المدرس فی مدرسة دارالعلوم فتحپوری دهلی. فقط

٢٢ جمادی الثانی سنة ١٣٤٤ه

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله المتأزر بإزار العظمة والعلاء، المرتدي برداء المجد والعزة والكبرياء، اللهم لا نحصي عليك الثناء، انت كما اثنيت على نفسك بلا امتراء، فانت اللهم من درك العقول والظنون والاوهام وراء الوراء، ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء، سبحانك ما اعظم شانك، و احكم برهانك، مننت علينا بارسال الرسل، وكرمتنا بانزال الكتب من السماء، وهديتنا الملة الحنفية السمحة السهلة البيضاء، اللتي ليلها ونهارها سواء، وعلمتنا من العلوم النبوية والحكم المصطفوية ما لم نعلم فعلونا به مدارج السماء۔

اللهم فصل وسلم، وزد وتفضل، وبارك وانعم، على سيدنا سيد الرسل وخير خلقك عبدك محمد، داعي الخلق والهادي الى الحق، الماحي سبل الضلال والفسق، تنور العالم بنور هدايته وضيائه، وتزينت السماء والارض بزينته وبهائه وعلى آله واصحابه۔

اما بعد فان اخانا في الدين السيد ابا الاعلى المودودي قد قرأ على الحديث والفقه والادب، واني قرأت مبادي الكتب في الخانقاه الامدادية ثم بعد ذلك دخلت في المدرسة المسماة بمظاهر علوم الواقعة ببلدة سهارنفور، وقرأت بقية الكتب في هذه المدرسة وحصلت السند فلما طلب هذا الشيخ مني السند واستجازني على الشروط المعتبرة عند علماء هذه الفنون، اعطيت هذه الصحيفة سندا وهو بحمد الله شاب صالح ذكي بارع اهل للدارس والافادة، فاوصيه بتقوى الله في السر والعلانية وان لاينساني في دعواته في خلواته وجلواته، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

حررہ اشفاق الرحمٰن عفی عنہ کاندھلوی مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله وكفى، والسلام على نبيه المصطفى وآله المجتبى، ما دامت الارض والسموت العلى۔

اما بعد فان اخانا في الدين السيد ابا الاعلى المودودي قد قرأ علي الجامع للامام الهمام ابو عيسى محمد بن عيسى بن سورة الترمذي، ثم الموطا للامام الهمام مالك ابن انس الاصبحي برواية يحيى بن يحيى الليثي المصمودي، واخذت كلا الكتابين قراءة وسماعا عن الشيخ خليل احمد حين كان مدرسا في مدرسة سهارنفور، انه قال حدثني الشيخ محمد مظهر النانوتوي، انه قال حدثني مولانا مملوك علي، انه قال حدثني الشاه محمد اسحاق الدهلوي، قال الشيخ المكرم حصل لي الاجازة والقراءة والسماعة من الشيخ عبد العزيز وحصل له الاجازة والقراءة والسماعة عن الشيخ ولي الله الدهلوي، قال الشيخ ولي الله اخبرنا به الشيخ ابو الطاهر المدني، عن ابيه الشيخ ابراهيم الكردي، عن الشيخ المزاحي، عن الشهاب احمد السبكي، عن الشيخ النجم الغيطي، عن الزين ذكريا، عن العز عبد الرحيم، عن الشيخ عمر المراغي، عن الفخر بن البخاري، عن عمر بن طبرزد البغدادي، قال اخبرنا الشيخ ابو الفتح عبد الملك بن ابي القاسم عبد الله بن ابي سهل الهروي الكروخي، قال انا القاضي الزاهد ابو عامر محمود بن القاسم بن محمد الازدي، قال الكروخي واخبرنا الشيخ ابو نصر عبد العزيز بن محمد بن علي بن ابراهيم الترياقي والشيخ ابو بكر احمد بن عبد الصمد بن ابي الفضل بن ابي حامد الغورجي. قالوا انا ابو محمد عبد الجبار بن محمد بن عبد الله بن ابي الجراح الجراحي المروزي، انا الشيخ الثقة ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب بن فضيل المحبوبي المروزي، [illegible] محمد بن عيسى [illegible] التسه [illegible] لفنا

[illegible] وقال الشيخ ولي الله [illegible] الموطا الشيخ وفد الله المكي المالكي قراءة مني عليه من اوله الى اخره، نحو سماعه لجميعه على الشيخ حسن بن علي العجيمي والشيخ عبد الله بن سالم البصري المكي، قالا اخبرنا الشيخ عيسى المغربي، لقراته على الشيخ سلطان بن احمد المزاحي، لقراته على الشيخ احمد بن خليل، لقراته على النجم الغيطي، بسماعه على الشرف عبد الحق بن محمد السنباطي، بسماعه على البدر الحسن بن محمد بن ايوب الحسني النسابه، بسماعه على عمه ابي محمد الحسن بن ايوب النسابه، بسماعه على ابي عبد الله محمد بن جابر الوادي آشي عن ابي محمد عبد الله بن محمد بن محمد هارون القرطبي، عن محمد بن عبد الرحمن بن عبد الحق الخزرجي القرطبي، عن ابي عبد الله محمد بن فرج مولى ابن طلاع، عن ابي الوليد يونس بن عبد الله بن مغيث الصغار عن ابي عيسى يحيى بن عبد الله قال اخبرنا عم والدي عبيد الله بن يحيى، قال اخبرنا والدي يحيى بن يحيى الليثي المصمودي عن امام دار الهجرة مالك ابن انس الا ابوابا ثلاثة من آخر الاعتكاف فعن زياد بن عبد الرحمن عن الامام مالك ابن انس رحمه الله.

فلما طلب هذا الشيخ مني السند واستجازني على الشروط المعتبرة عند علماء هذا الفن اعطيته هذه الصحيفة سندا، وهو بحمد الله شاب صالح ذكي بارع اهل للدرس والافادة فاوصيه بتقوى الله في السر والعلانية وان لا ينساني في دعواته في خلواته وجلواته وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

حرره

اشفاق الرحمن [illegible] كاندهلوي

المدرس في [illegible] الفتحبوري

دهلی

باب سوم

مبادیات تاریخ نویسی

فصلِ اوّل:۔

تاریخ کی تعریف

تہذیب انسانی کی عظمت و جلال کا اظہار تاریخ کا مرہون منت ہے۔ ہر گزرتا لمحہ ماضی یا تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ تصور تاریخ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ تصور زمان و مکان۔ اور تاریخِ تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تخلیق کائنات اور تخلیق آدم۔ تمدن انسانی کے آغاز سے عصر حاضر تک تاریخ مختلف روپ تبدیل کرتی رہی، دیو مالائی قصے کہانیوں سے شروع ہو کر آج تاریخ ایسا مقام حاصل کر چکی ہے کہ اسے تمام علوم انسانی کی روح رواں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اجتماع انسانی کے کسی بھی شعبہ میں آج جو واقعہ پیش آتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح کل یا تاریخ سے مربوط ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ''تاریخ سب کچھ ہے اور سب کچھ تاریخ ہے'' تو بے جا نہ ہوگا۔1

تاریخ کی لغوی تعریف:

علمائے تاریخ نے لفظ تاریخ کی تحقیق کر کے تاریخ کے معنی و مفہوم کو واضح کیا ہے۔ مختلف لغات میں تاریخ کی تعریف کم و بیش ایک ہی کی گئی ہے۔

1۔ تاج العروس، شرح قاموس میں لکھا ہے کہ تاخیر کے مقلوب ہونے سے تاریخ بنا ہے اور تاخیر کے معنی ہیں اولین وقت کو آخرین وقت کے ساتھ نسبت دینے کے اور ہر چیز کی وقت کی تاریخ اس کی انتہا اور اس کا وہ وقت ہے جس پر وقوع اس کا ختم ہوتا ہے۔2

2۔ لسان العرب کے مطابق، تاریخ، وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔3

3۔ السخاوی، تاریخ کی لغوی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لغت میں تاریخ کے معنی ہیں ''وقت کی

نشاندہی''ارخت الکتاب وورختہ سے مراد ہے کہ میں نے کتاب کا وقت درج کردیا۔4

4۔ مصباح اللغات میں بھی تاریخ کی یہی تعریف اور وضاحت کی گئی ہے۔5

5۔ ارخ التاریخ والتواریخ (بمعنی جمع) تعریف الوقت نقول (ارخ) الکتاب بیوم کذاد (ورختہ) بمعنی واحد۔6

6۔ ارخ وآرخ ابراخاTo put the date to write the history

تاریخ، جمع التواریخDate of a fact, of a letter, history, chronoloty7

7۔ History۔ تاریخ، علم التاریخ، سیرۃ، قصہ، Ancient، التاریخ القدیم، تاریخ الدنیا حتی سقوط روما، ٤٧٦، ٣٧٦، قبل میلادی

Medieval، التاریخ التوسط، تاریخ العالم فی المدۃ التی نقع بین سقوط روما والقرن السادس عشر

Modren۔ التاریخ الحدیث، تاریخ الصام من اوائل قرس سادس عشر فصاعداً

Historiogrephy۔ علم تدوین تاریخ۔8

8۔ تاریخ۔ (١) کسی چیز کے ظہور کا وقت ظاہر کرنا۔ (٢) کسی امر عظیم کے وقت کا تعین کرنا۔ (٣) شمسی یا قمری مہینے کا ایک دن۔ (٤) گزشتہ واقعات اور سیر کی تاریخ (٥) اس فن کا نام جس میں واقعات گزشتہ سے بحث کی جاتی ہے۔ واقعات یا حالات کا تذکرہ۔ بادشاہوں اور نامور افراد کے تحریری حالات۔9 اردو لغت10 اور فیروز اللغات11 میں بھی تاریخ کی یہی تعریف ہے۔

9- History-i. All the Events that happened in the past.

ii. the past events concerned in the development of a particulation place, subject etc.

iii. The study of past events as a subject at school and university.

iv. A written and spoken account of past events

v. A record of something heepening frequently in the past life of a person family or place.12

10۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق تاریخ سے عام طور پر مراد ہے قوموں کے عام وقائع کا بیان، حولیات یعنی وقائع کا بیان بہ ترتیب سالیانہ، شرح وقائع بترتیب تاریخی، عصر، حساب، تعین، وقت، تاریخ کا نہایت ضروری مادہ زمان میں آیا ہے۔ تاریخ کا لفظ اسی صورت میں مفید ہوسکتا ہے جب اسے مادہ زمان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ لفظ تاریخ مادہ ورخ سے مشتق ہے جو سامی زبانوں میں مشترک ہے۔ مثلاً عبرانی زبان کے لفظ یارے ح = چاند اور یرح = مہینہ میں یہی مادہ موجود ہے۔ اس مشابہت سے قیاس کریں تو تاریخ کے معنی ہوں گے ''مہینے کا تعین کرنا'' چنانچہ ایک طرف تو تاریخ کے معنی ہوئے کسی واقعہ کا زمانہ معین کرنا اور روداد وقائع اور دوسری طرف وقائع کے وقتوں کے اعصار Era اور ترتیب زمانی کی تعین (یعنی تقویم اور عہد دونوں)۔ البیرونی کی کتاب الآثار باقیہ میں بیان کردہ روایت کے مطابق لفظ تاریخ فارسی کے ماہ روز کا معرب ہے۔ الخوارزمی نے بھی اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں اس روایت کو بیان کیا ہے۔ لیکن وہ صریحاً اس کو رد بھی کرتا ہے۔13

السخاوی نے بھی ابو نصر اسماعیل حماد الجوہری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ تاریخ کے معنی ہیں وقت بتانا۔ تاریخ اور توریخ دونوں ایک ہیں۔ ارخت بھی کہتے ہیں اور ورخت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ارخ (ہمزہ پر زبر اور زیر دونوں جائز ہیں) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وحشی گائے کے چھوٹے مادہ بچے، اس لیے تاریخ بھی اسی طرح تازہ بہ تازہ ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے کہ بچے۔ مذکورہ بالا وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ تاریخ عربی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ خالص عربی نہیں بلکہ معرب ہے اور فارسی لفظ ماہ روز سے بنا ہے۔ ماہ یعنی چاند اور روز یعنی دن جس میں رات اور دن دونوں شامل ہیں۔14

اگر فارسی لغت کے اعتبار سے تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ تاریخ عربی ہے کیونکہ اگر ہم ماہ روز کے معنی دیکھیں تو فارسی میں ماہ کے ایک معنی چاند کے ہیں اور دوسرے معنی مہینہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے ماہ روز کا مطلب ہے مہینے کا ایک دن اور اگر لفظ تاریخ کے لحاظ سے جائزہ لیں تو فارسی لغت میں اسے نہ صرف عربی قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے فارسی میں استعمال بھی کیا گیا ہے۔ جیسے تاریخ اسکندری۔ سکندری دور

تاریخ گذاشتن۔ خط یا کتاب لکھنے کی تاریخ درج کرنا۔

تاریخ تازی۔ تاریخ عرب

تاریخ نوروزی۔ بادشاہوں کے جشن نوروز میں جو سال کی تاریخ بدلی جاتی ہے۔

تاریخی۔ منسوب بہ تاریخ، مشہور ومعروف15

فرہنگ جدید فارسی میں بھی تاریخ کو عربی لفظ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق تاریخ کے معنی ضبط حوادث یا تعین زمان وقوع۔ شناختن یا شناساندن، وقت وزمان وسال وماہ کے ہیں۔16

تاریخ کی اصطلاحی تعریف:

اصطلاح میں تاریخ کے معنی ہیں وقت بتا کر سارے احوال کو متعین کرنا، مثلاً راویوں اور اماموں کی ولادت، وفات، صحت، عقل وبدن، رحلت و حج، حفظ و یادداشت، سچائی پر اعتماد (توثیق) اور عدم اعتماد (تجریح) الغرض اسی قسم کی وہ تمام باتیں جو ابتدائی، درمیانی اور مابعد کے زمانے میں ان کے حالات کی جستجو سے برآمد ہوتی ہیں۔ الغرض یہ وہ فن ہے جس میں سارے زمانے کے واقعات سے بحث کر کے ان کی تحدید اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اسی میں ساری دنیا کے واقعات سے بحث ہوتی ہے۔17

اصطلاحی اعتبار سے تاریخ کی تعریف عظیم مورخ ابن خلدون نے یہ کی ہے کہ:

''تاریخ ایک بلند مرتبہ شعبہ علم اور کثیر الفوائد خوش کن نتائج فن ہے۔

کیونکہ وہ ہم کو سابق امتوں کے اخلاقی حالات، انبیاء کی سیرتوں اور سلاطین کی حکومتوں اور ان کی سیاستوں سے روشناس کراتا ہے۔ تاکہ جو شخص دینی و دنیاوی معاملات میں ان میں سے پیروی کرنا چاہے تو اس کا دامن فائدے سے خالی نہ رہے"۔

ابن خلدون مزید کہتا ہے کہ تاریخ درحقیقت ایک خبر ہے جو اس اجتماع انسانی کا پتہ دیتی ہے جس کو ہم آبادی عالم سے تعبیر کرتے ہیں۔ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر رہنے والے انسانوں کی اجتماعی زندگی جن حالات و حادثات سے گزری ہے اس کی سرگزشت کا نام تاریخ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں تاریخ حیات انسانی کو منظم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔18

لغات میں اس اصطلاح کو اس طرح واضح کیا گیا ہے وہ علم جس میں گزشتہ واقعات اور سیر سے بحث کی جاتی ہے، بادشاہوں، نامور آدمیوں، قوموں اور فرقوں کے حالات اور حادثات کا تحریری تذکرہ، حروف ابجد کے اعداد کے لحاظ سے کوئی بات یا واقعہ، کسی حرف، نظم یا نثر کے کسی جملے میں اس طرح بیان کرنا کہ اس واقعہ کا سنہ نکل آئے۔ اس قسم کے حرف، جملے یا شعر کو مادہ تاریخ کہتے ہیں۔19

مولانا سید مودودیؒ تاریخ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"تاریخ دراصل انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کل نوع انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے، تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے، اور اپنے مستقل کو آزمودہ بھلائیوں سے درست اور آزمودہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ اس دفتر میں مختلف نمائندہ شخصیتوں، اداروں، قوموں اور جماعتوں کے کارنامے ایک مربوط اور مسلسل طرز عمل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

جنھیں دیکھ کر ہم ان کی نفسیات کو سمجھ سکتے ہیں تاکہ آئندہ ان کے ساتھ ہم اجنبی کی طرح نہیں بلکہ واقف کاروں کی طرح معاملہ کرسکیں۔ یہ دفتر اجتماعی زندگی کے لیے مدارج کے اعتبار سے بہت زیادہ مگر نوعیت کے لحاظ سے وہی اہمیت رکھتا ہے جو فرد واحد کی زندگی میں اس کے حافظے کو حاصل ہے۔ اگر فرد واحد کا حافظہ اس سے سلب کرلیا جائے تو وہ پے در پے غلطیاں کرے گا۔ اگر کسی شخص کی گزشتہ زندگی کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہ ہو تو ہم اس کے متعلق صحیح رائے نہ قائم کرسکیں گے اور نہ اس کے متعلق اپنے طرز عمل کا صحیح فیصلہ کرسکیں گے۔ بالکل یہی صورت جماعتی زندگی کی بھی ہے اگر ہم نوع انسانی کے، اور خود اپنے ان قوموں اور اداروں کے جن سے ہمیں سابقہ پیش آتا ہے پچھلے ریکارڈ سے واقف نہ ہوں تو ہماری اجتماعی زندگی غلط کاریوں اور غلط اندیشوں کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس دفتر پارینہ کے اوراق کا کبھی کبھی نہیں بلکہ بار بار جائزہ لیتے رہیں''۔[20]

کشاف اصطلاحات تاریخ میں تاریخ کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے''تاریخ انسانی زندگی کے گزشتہ واقعات، تحریکات اور ان کے اسباب اور نتائج کے تحریری سرمایہ کا نام ہے۔ یہ انسان کے معاشرتی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور مذہبی تصورات کی داستان ہے۔ یہ روایات کہن اور نقش پارینہ کا خزینہ ہوتی ہیں۔ یہ ندی کے اس صاف وشفاف پانی کی مانند ہے جس میں اقوام اپنا چہرہ صحیح طور پر دیکھ سکتی ہیں۔[21]

Toynbee کے نزدیک تاریخ انسانی زندگی کے معلوم شدہ کارہائے نمایاں کا ریکارڈ ہے۔ لفظ تاریخ جس کو انگریزی زبان میں History کہتے ہیں یونانی زبان کے لفظ Historia سے ماخوذ

ہے۔22

یوں تو تاریخ کائنات کے ہر شئے سے جڑی ہوئی ہے لیکن بنیادی طور پر تاریخ کا موضوع انسان ہے۔لہٰذا تاریخ کو تمام اقوال و اعمال انسانی کا علم بھی کہا جاسکتا ہے۔23 جب کہ Carlyle کے نزدیک تاریخ دنیا کے عظیم انسانوں کی سرگزشت حیات ہے۔24 لمحے میں ظہور پذیر ہونے والا واقعہ دوسرے لمحے میں تاریخ بن جاتا ہے۔اس بات کو Kent نے نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔وہ کہتا ہے تاریخ کو ہم اتنا ہی صرف کرتے ہیں جتنا کہ تازہ ہوا کو۔25 Oswald Spengler کہتا ہے:''تاریخ روح کو حقیقت کا لبادہ اوڑھانے کا نام ہے''۔اسے سمجھنا آسان ہے۔تاریخ سازی اور تاریخی تصورات ایک ہی قوت سے نمو پاتے ہیں۔کلاسیکی تاریخ لامتناہی ہے۔26

کارل مارکس نے تاریخ کی مادی تفسیر کی ہے اس کا کہنا ہے کہ تاریخ محض ماضی کی داستان ہی نہیں بلکہ یہ اقتصادی نظام اور پیدائش دولت میں تبدیلیوں کی داستان ہے۔اس کے خیال میں انسان اقتصادی حیوان ہے۔27

ہنری اسٹیل کومیجر کہتا ہے''تاریخ کے متعلق جو بات سب سے پہلے کہنی چاہیے یہ ہے، کہ لفظ تاریخ غیر مبہم اور غیر واضح ہے، اسکے مفہوم دو ہیں، جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔اس کا پہلا مطلب ہے زمانہ ماضی اور جو کچھ اس میں گزرا ہے۔اس کا دوسرا مطلب ہے زمانہ ماضی کا ریکارڈ، یعنی وہ سب کچھ جو انسانوں نے زمانہ ماضی کے متعلق کہا اور لکھا۔28

تاریخ کی اہمیت:

تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر علم تاریخ کے ماہرین اسے سائنس قرار دیتے ہیں۔ہنری اسٹیل کومیجر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ تاریخ ان معنی میں سائنس نہیں ہے، جن معنی میں علم کیمیا یا حیاتیات سائنس ہیں۔تاریخی مواد سائنٹفک تجربات کے لیے پیش نہیں کیا جاسکتا۔اس کے تجربات دھرائے نہیں

جاسکتے یہ اپنے مواد کو نظم و ضبط میں نہیں رکھ سکتا، ان کوتاہیوں کے پیش نظر یہی کہا جائے گا کہ تاریخ سائنس کے لفظ کی افادی حیثیت کے اعتبار سے سائنس نہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ تاریخ میں سائنس کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے یا استعمال کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یعنی یہاں بھی ان تمام چیزوں کی آزمائش کی جاتی ہے جن کی آزمائش کی جاسکتی ہے اور جو چیز کھری ثابت ہو اسے قائم رکھا جاتا ہے''۔29

ایس ایم جعفر کہتے ہیں کہ ''تاریخ کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے اور کہی جاتی ہے کہ یہ تمام فنی اور سائنسی علوم میں سب سے قدیم ترین علم ہے۔ زبانی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ تقریر اور تحریری تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تحریر۔30

ابن خلدون اپنی تاریخی تصنیف کے مقدمے میں تاریخ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ تاریخ ظاہر میں تو زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن باطن میں وہ نام ہے نظر و تحقیق کا، مخلوقات اور اس کے اصول کی باریک تعلیل کا، اس گہرے علم کا جس کا تعلق واقعات کی کیفیات اور ان کے اسباب سے ہے۔ اس حیثیت سے اس کے رگ و ریشے فن حکمت سے وابستہ ہیں اور تاریخ اس کی مستحق ہے کہ اس کا شمار علوم حکمیہ میں کیا جائے۔31

ضیاء الدین برنی تاریخ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے'' تاریخ میں گزشتہ لوگوں (سلف) کی نیکیوں اور برائیوں ان کے عدل اور ظلم، استحقاق و غیر استحقاق، خوبیوں اور کمزوریوں، عبادات اور گناہوں اور ان کے اوصاف اور رزائل کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ بعد کے زمانے میں پڑھنے والے اس سے عبرت حاصل کریں، اور حکمرانی و جہانبانی کی خوبیوں اور نقصانات سے واقف ہو کر نیک کاموں کا اتباع اور بدکرداری سے پرہیز کرسکیں۔32

مولانا اسلم جیراجپوری تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر لکھتے ہیں'' اہل زمانہ کے واقعات اور حالات بیان کرنے کو تاریخ کہتے ہیں۔ اس عام تاریخ میں ہر شخص کے حالات اور ہر قسم کے واقعات داخل ہیں، اور اصلیت یہ ہے کہ فن تاریخ کی جو غرض ہے یعنی عبرت اور تجربہ وہ ہر شخص کی زندگی کے سوانح سے کچھ نہ کچھ

حاصل کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ عہد سابق میں بادشاہوں کی لڑائیوں کی داستانیں اور انہی کے واقعات کے افسانے لوگ بیان کرتے تھے، اس وجہ سے تاریخ کا زیادہ تر تعلق سلاطین اور امور سلطنت کے ساتھ ہو گیا۔ پھر امرا، علماء، حکما، اور دوسرے طبقات کے بڑے لوگوں نے جس قدر اپنی ہستی کی اہمیت دنیا پر ظاہر کی، اسی قدر تاریخ میں ان کو بھی حصہ ملتا گیا، اور اب تو اشخاص اور افراد سے گزر کر علوم وفنون بلکہ دنیا کی ہر چیز کی جداگانہ تاریخ لکھی جاتی ہے، اور اس فن کے رقبے کی وسعت تمام موجودات عالم پر حاوی ہو گئی ہے''۔[33]

تاریخ کی افادیت:

جس طرح فن شاعری انسانی جذبات واحساسات اور تصورات کو ظاہر و آشکارا کرتا ہے اسی طرح علم تاریخ بھی جامعہ انسانی کے انفرادی واجتماعی اعمال وافعال اور کردار کا آئینہ دار اور دنیا کے قدیم ترین اور مفید ترین علوم میں شمار میں ہوتا ہے۔ اگر تاریخ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں گزشتہ نسلوں کے بیش بہا تجربات آئندہ نسلوں تک نہ پہنچاتی تو تمدن انسانی کا کارواں کبھی رواں دواں نہ ہو پاتا، اور ہنوز زمانہ قبل از تاریخ کی تاریک اور کھٹن منزل پر ہی ٹھہرا ہوا ہوتا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے توسط سے مختلف اقوام وافراد ماضی کے دریچے سے، اپنے کردہ ناکردہ اعمال وافعال پر تنقیدی نظر ڈال کر اپنے حال ومستقبل کو اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق ڈھال سکتے ہیں، اور ماضی کی تاریکیوں کو حال کے اجالوں میں بدل کر یا ماضی کی روشنی سے حال کو روشن تر بنا کر حال کی تابناکیوں سے اپنے مستقبل کو تابناک تر کرتے ہیں۔[34]

اسی بات کو مولانا اسلم جیراجپوری نے اسی طرح واضح کیا ہے کہ ''انسانی زندگی میں اس قدر شاہراہیں پیش آتی ہیں کہ جب تک تجربے کی مشعل اس کی رہنمائی نہ کرے وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے گزشتہ ناموروں کے واقعات وحالات یاد رکھے جاتے ہیں کہ ان سے تجربہ حاصل کر کے ہم اپنی زندگی میں کام لیں۔ انہوں نے جو غلطیاں کیں ان سے بچیں تاکہ وہ برے نتیجے ہم کو بھگتنے نہ پڑیں جو

انھوں نے بھلتے اور جو عمدہ کام کیے اور ان سے فائدہ اٹھائے، ہم بھی ان اعمال سے سبق حاصل کریں''۔35

''حقیقت یہ ہے کہ دنیا جو آدمی جس قدر ناموری پیدا کرنا چاہتا ہے تاریخ اسی قدر اس کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ اس کو لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے حالات پڑھے جو دنیا میں بڑے بڑے کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی کوشش، ہمت اور جرأت کو دیکھے اور ان کی مصیبتوں کو جو انھیں اپنے مقاصد کی تکمیل میں برداشت کرنی پڑیں پیش نظر رکھ کر خود اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں پر نہ گھبرائے اور صبر وثبات کے ساتھ کوشش میں لگا رہے اس لیے رب اللعالمین نبی اکرم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے''اور ہم تم کو رسولوں کی وہ تمام چیزیں سناتے ہیں جو تمہارے دل کو مضبوط کریں''۔36

مروج الذہب میں تاریخ کے فوائد کے ضمن میں مسعودی لکھتے ہیں''تاریخ ایک ایسا علم ہے جس سے عالم و جاہل دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان واقعات سے عاقل اور احمق دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کتاب (مروج الذہب والمعاون الجواہر) میں ہم نے بادشاہوں، ان کے ذوقِ تعمیرات، ان کی مہمات کا فرق، ان کے معاصر علماء وحکماء کے حالات اور ازمنہ گزشتہ پر ان کے اثرات پر مکمل تحقیق کے بعد روشنی ڈالی ہے، اور اس میں گمان وظن سے قطعاً کام نہیں لیا بلکہ آدابِ تاریخ نویسی پر پوری طرح عمل کیا ہے۔37

ابن اثیر نے تاریخ کے فوائد تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ مختصراً سب سے اہم فائدے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تاریخ کی بدولت انسان کو پکے پکائے تجربات مل جاتے ہیں اور واقعات اور اس کے عواقب ونتائج اس کے علم میں آجاتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کی عقل بہت بڑھ جاتی ہے لہٰذا جب وہ کسی نئے معاملے سے دوچار ہوتا ہے، تو چونکہ وہ یا اس کی نظیر پہلے گزر چکی ہوتی ہے (جس کا علم وہ حاصل کر چکا ہے) اس لیے وہ حالات سے بحسن وخوبی نمٹنے کا اہل ہو جاتا ہے۔38

علم تاریخ کے ضروری، مفید اور دلچسپ ہونے سے کسی کو انکار نہ تھا۔ ایک تو دینی علوم بالخصوص حدیث اور اسماء الرجال میں تاریخ کی مدد ناگزیر تھی دوسرے بادشاہوں، حاکموں، مدبروں کے لیے تاریخ

کی سبق آموزی کام کی، ویسے ہی عام مجلسوں میں تاریخی معلومات سے ایک انسان کی تہذیب و شائستگی کو چار چاند لگ جاتے تھے، چنانچہ بغیر اس کے کہ نصاب تعلیم میں اس کا کوئی خاص اہتمام ہو، تاریخ کا علم ترقی کرتا گیا اور اس کا رواج بڑھتا گیا۔'39

السخاوی کہتے ہیں تاریخ کا فائدہ یہ ہے کہ سب باتوں کا صحیح صحیح علم حاصل ہو جائے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دو خبریں جن میں تعارض ہو اور دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو تو ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے کے علم کا ایک ذریعہ تاریخ ہے۔40 حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں جب راویوں نے جھوٹ سے کام لیا ہم نے ان کے مقابلے میں تاریخ کو لا کھڑا کیا۔41 علم تاریخ کے ذریعے ان غلطیوں کا بھی پتہ لگ جاتا ہے جو متفقین (ہم نام اشخاص) کے سلسلے میں واقع ہوتی ہیں۔ بسا اوقات تاریخ کے ذریعے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خطوط وغیرہ میں کیا جعل کیا گیا ہے۔42

بدایونی کہتا ہے:

''علم تاریخ بذاتہٖ ایک علم شریف اور فن لطیف ہے اس لیے کہ اہل خبر کا سرمایہ، عبرت اور اہل عقل کا آئینہ تجربات ہے، اصحاب قصص و سیر نے حضرت آدم سے لے کر زمانۂ حال تک اس فن میں بڑی معتبر اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اور اس کی حقیقت کا ثبوت دلائل و براہین سے بہم پہنچایا ہے اس لیے یہ خیال کبھی دل میں نہ لانا چاہیے کہ ضعیف العقیدہ اور شکی طبیعت رکھنے والوں نے اس علم کے مطالعہ کے متعلق جو خیال آرائی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس سے مسلمان شریعت محمدی کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور بدعت کے مکدر چشموں کے کنارے اترتے ہیں، اس لیے کہ جس گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ہوسکتا ہے اسے فطری طور پر دین سے کوئی لگاؤ نہ ہو،

ہمارے مخاطب وہ اصحاب ہیں جو سلامتی [illegible]، جودت ذہن اور دیدہ انصاف کے حامل ہیں نہ کہ وہ جماعتیں جو شرع شریف کی پابند نہیں اور اصل و فرع کی منکر ہیں، ہمارے نزدیک ایسے لوگ مخاطب کے قابل نہیں کہ ان کا شمار اہل اعتبار اور اولی الابصار کے زمرہ میں نہیں ہوتا، بھلا ایسے علم کا کوئی شخص کیسے منکر ہوسکتا ہے جس کی فضیلت کا یہ حال ہو کہ اسے سبع مثانی (سورہ فاتحہ) کی ساتویں آیت کا درجہ حاصل ہو، اور سبع مثانی کی اہمیت ظاہر ہے کہ اسے ایمان اور یقین کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، علمائے حدیث وتفسیر کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر ہمارے اپنے زمانے تک کے علمائے کرام شامل ہیں، ان سب نے اس دل پذیر علم کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا اور اقوام مشرق ومغرب جو اگرچہ مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی ہیں وہ بھی ان کے قول وعمل کو مستند سمجھتی ہیں''۔43

ضیاء الدین برنی نے اپنی تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' میں تاریخ کی افادیت تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے ''تاریخ سے اصحاب بصیرت اسی طرح عبرت حاصل کرسکتے ہیں جیسے کتب سماوی سے، اس لیے کہ تاریخوں میں بھی انبیاء اور بعض سلاطین کے واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ تاریخ کو بھی برنی ''سرمایۂ اعتبار اولوالابصار'' کہتا ہے۔44

برنی کی نظر میں، تاریخ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کا حدیث سے بھی بہت قریبی تعلق ہے۔ محدث کے لیے مورخ ہونا بہت ضروری ہے۔ حدیث کی تدوین وتنقید کے لیے تاریخ وتذکرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں محدثین نے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا اور کئی لاکھ راویوں کے حالات جمع کرلیے، حدیث کی جرح وتعدیل کے سلسلے میں انھوں نے تاریخی شواہد اور استناد کا معیاد بہت بلند کردیا۔ علم حدیث اور متعلقہ

متون کا مطالعہ کے ساتھ ساتھ تاریخ کے مطالعہ کا بھی رواج بڑھتا گیا اور چونکہ حدیث میں فن شہادت و اسناد کا بلند معیار قائم ہو چکا تھا، تاریخ میں بھی ان لوگوں نے بڑی حد تک اسی اصول کا اتباع کیا۔[45] یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور کی تاریخوں، مثلاً طبری کی مشہور تاریخ میں رواۃ کے سلسلے ہر روایت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔فن تاریخ اور حدیث کے تعلق پر زور دینے سے برنی کا مطلب تاریخ کے مرتبے کو بلند کر کے دکھلانا ہے۔

برنی مزید کہتا ہے کہ اگر تاریخ کا فن ایجاد نہ ہوتا تو انسان کے بڑے بڑے کارناموں اور ان کے انجام دینے والوں کا پیشہ ونشان تک باقی نہ رہتا، ہر دور کے لوگ گزشتہ زمانے کے مشاہیر کے حالات سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس طرح ایک دور کے کارنامے آئندہ دور کے کارناموں کی بنیاد اور پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور تہذیب وتمدن کی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔[46]

ایس ایم جعفر نے بھی مذہب کی روشنی میں تاریخ کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے ''تاریخ اور مذہب میں نہایت قریبی تعلق ہے دونوں ایک دوسرے کے قریبی عزیز، ممدو معاون اور لازم ملزوم ہیں، دونوں کا مطمع نظر اور بنیاد سچائی ہے۔ اگر ان دونوں کی صحیح طور پر پیروی کی جائے تو یہ دونوں انسانیت کے ممدو معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مذہب تاریخ کی راہ دکھاتا ہے اور تاریخ مذہب کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔سچائی، انصاف اور ایمانداری کا نام مذہب ہے اور یہی تاریخ کی بنیاد ہیں۔[47]

سبقِ دوم:۔

تاریخ نویسی کے فنی اصول

زمانہ گذشتہ جسے ہم ماضی کہتے ہیں ہماری زندگی میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ ماضی وہ چیز ہے جس سے انسان کا ذہنی و جسمانی رابطہ تا حیات جڑا رہتا ہے۔ تخلیق انسانی کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کا بھی آغاز ہوا۔ اور انسانی معاشرے کی تشکیل و ترقی کے ساتھ ساتھ تاریخ نے بھی ایک علم کا درجہ حاصل کرلیا۔ علم تاریخ تمام کمزوریوں کے باوجود علوم کی ایک انتہائی ضروری اور لازمی صنف ہے۔ اگر آج دنیا سے تاریخ ختم ہو جائے، ہمارے تمام تجربات ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں اور ہماری ماضی کی یاد داشتیں ذہن سے کھو جائیں تو ہم خود کو اچانک کھوکھلا اور بے جان پائیں گے اور ہماری زندگی، ہماری تہذیب و تمدن خلا میں معلق ہو کر رہ جائیں گی اس لئے معاشروں کی ترتیب و تنظیم کے لیے تاریخ کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر تاریخی تجربات کے ہم کوئی نیا دستور، قانون یا روایات تشکیل نہیں دے سکتے۔ تاریخ کو زندہ رکھنے میں اور اس کو ایک علمی مقام تک پہنچانے میں مورخ یا تاریخ نویس اہم کردار ادا کرتا ہے اور ماضی کے تجربات کے تجزیے سے مستقبل کی راہیں روشن کرتا ہے۔

تاریخ کی بنیاد چونکہ تحقیق پر ہوتی ہے اس بناء پر ہم تاریخ کو ایک علم کہہ سکتے ہیں لیکن جب اس علم کا تحقیقی مواد سپرد قلم کیا جاتا ہے تو وہ ایک فن بن جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی تاریخ تحقیق اور فن تحریر کے امتزاج کا نام ہے۔ ہر زمانہ کی تاریخ اور اس کا معیار اس ثقافتی دور کے ذہنی مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔48

بلاشبہ تاریخ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ یہ محض بادشاہوں کے عروج و زوال کی داستان نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کی سرگزشت بھی ہے۔ جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص دور میں کسی قوم کا طرز فکر کیا تھا، نیز معاشرت کے طور طریقے، رسم و رواج، مذہب و اعتقاد وغیرہ کا کیا انداز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن کا حق صرف وہ قومیں ادا کرسکتی ہیں جو واقعات و حقائق کی تلاش کے علاوہ ان کے اسباب و علل

بھی سمجھا جا رہی ہوں اور نہیں یہ احساس ہو کہ تاریخ کسی چند بااقتدار ہستیوں کے ذکر تک محدود نہیں ہوتی بلکہ تہذیب انسانی اور ہیئت اجتماعی کی مسلسل سرگزشت ہوتی ہے۔ جس کی تکمیل میں مختلف افراد اور جماعتیں حصہ لیتی ہیں یہی وہ منزل ہے جہاں حماسہ سرائی اور تاریخ کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔49

درحقیقت تاریخ، تہذیب وتمدن کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسانیت کے خدوخال اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بڑی وضاحت سے اجاگر ہوتے ہیں۔ انسانی تہذیب نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جو ارتقائی سفر طے کیا اور جن وادیوں اور منزلوں سے یہ کاروان رنگ و بوگزرا ہے ان کی روئیداد جب الفاظ کا پیکر اختیار کرتی ہے تو ''تاریخ'' بن جاتی ہے۔ لیکن تاریخ ماضی کے واقعات کو صرف دہرا دینے ہی کا نام نہیں بلکہ ماضی کی بازیافت کا فن ہے، اس لئے ضروری ہے کہ واقعات کے اسباب و نتائج کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اجتماعی زندگی کی ان قدروں کا جائزہ لیا جائے جو اقوام وملل کے عروج وزوال سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ مورخ کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے پیشرو مورخین کے بیانات، انداز دیگر سے پیش کردے، بلکہ اسے سیاسی معاشی اور جغرافیائی حالات کے فکری تجزیے سے اسباب وواقعات اور ان کے اثرات کی ایسی تصور پیش کرنی پڑتی ہے جو ماضی کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔50

لارڈ میکالے (Lord Macaulay) بھی اسی بات کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ ''تاریخ بیان کا ایک فن ہے۔ اس سے انسانی تاثرات کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے، تصور کے سامنے تصویریں آتی ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ مختلف واقعات کو ہنرمندانہ طریق پر انتخاب کیا جائے اور انہیں مناسب ترتیب سے پھیلا دیا جائے اور اپنے دماغ سے کچھ اختراع نہ کی جائے''۔51

تاریخ نگاری کے مختلف پہلوؤں کی تشریح ابن خلدون نے تفصیل کے ساتھ اپنے بصیرت افروز مقدمے میں کی ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ:

''مورخ کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی واقعہ کو مستند ثابت کرنے کے

لئے متعدد ماخذوں سے استفادہ کرے اور مختلف علوم سے واقفیت حاصل کی جائے، مورخ فکر صحیح اور گہری نظر بھی رکھتا ہو تا کہ اس کے ذریعے وہ حق و صداقت کی راہ پاسکے اور لغزشوں اور اغلاط سے اپنا دامن بچا سکے، کیونکہ اخبار میں اگر محض نقل پر نظر قاصر رکھی جائے اور اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت، تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور نہ غائب وغیرہ موجود کو حاضر موجود پر قیاس کیا جائے تو غلطی، لغزش قدم اور سچائی کے راستے سے ہٹ جانے کے خطرے سے نجات نہیں مل سکتی''۔52

چنانچہ اکثر و بیشتر مورخین و مفسرین اور ناقلین، نقل حکایت و وقائع میں غلطیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ محض اس لئے کہ انھوں نے صرف نقل پر بھروسہ کیا خواہ وہ قابل رد ہو یا قابل قبول، ان کو نہ اصول پر کسا، نہ ان کی مشابہت پر قیاس کیا، نہ معیار حکمت اور طبائع کائنات کی واقفیت پر ان کو پرکھا اور جانچا اور نہ اخبار پر گہری نظر ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ حق سے بہک گئے اور وہم و غلطی کے جنگل میں بھٹکتے پھرے، خصوصاً جبکہ حکایات میں مالوں اور فوجوں کے شمار اور گنتی کی نوبت آئی، کیونکہ حکایت میں جھوٹ اور غلط بیانی کی بڑی گنجائش ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کو اصولوں پر جانچیں اور قواعد پر پرکھیں۔53

مسعودی کہتا ہے کہ'' تاریخ کوئی جامد اور ساکت شئے نہیں ہے بلکہ قومیں سیاسی تبدیلیوں سے بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے مورخ کا یہ بھی منصب ہے کہ وہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ کسی حکومت کی تبدیلی سے قوم میں کیا کیا تغیرات اور تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔54

السخاوی ن اپنی کتاب میں تاریخ نویسی کے لئے چند اصول مرتب کیے ہیں۔ ان کے مطابق تاریخ کا کام کرنے والے کے لئے عدالت شرط ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صحت کا پورا پورا اہتمام جس سے پختگی اور کمال پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مکمل غور وفکر سے کام لے۔ خاص طور پر ان باتوں میں جو

انبیاء کے جاہل سیرت نگار لکھا کرتے ہیں۔55

الغرض عدالت، قوت حفظ، مقبول اور مردود جو باتیں سننے میں آئیں ان میں تمیز کرنا بلند مرتبے والے اور پست مرتبے والے کو پہچاننا، دنیاوی عداوت کا نہ ہونا اور ایسی جنبہ داری کا بھی نہ ہونا جو تعصب کو پہنچ جائے یعنی وہی جسے بعض لوگوں نے یوں کہا ہے کہ ذاتی اغراض وخواہشات سے بچنا۔56

ایک اور اصول کی وضاحت کرتے ہوئے سخاوی کہتے ہیں ضروری ہے کہ مورخ سب لوگوں کی قدر جانتا ہو تا کہ کسی کم مرتبہ شخص کو اونچا نہ اٹھائے اور بلند مرتبے والے کو نیچے نہ گرائے، اسی طرح رسول اللہ کے اس قول پر عمل پیرا ہو کر لوگوں کو ان کے صحیح مرتبہ میں رکھا کرو۔ یعنی برائی اور بھلائی کے لحاظ سے مورخ کو، جب تک وہ بالکل مجبور نہ ہو جائے، ان امور کا تذکرہ بھی نہ کرنا چاہئے جو آبرو اور اقتدار والوں کو ارباب حکومت کے ہاتھوں پیش آتے ہیں۔57

اس کے ساتھ ایک اور شرط فہم بھی ہے کہ علوم اور بالخصوص فروغ اور اصول کے مراتب سے ناواقف نہ ہو اور الفاظ اور ان کے محل وقوع کو اچھی طرح جانتا ہو، مبادا کسی کے سوانح لکھتے وقت اس کے قلم سے ناشایان شان لفظ درج ہو جائے اگر ایسا ہوا تو لوگ پیچھے پڑ جائیں گے۔ برا بھلا کہیں گے اور ایسی سزا دیں گے جو باعث رسوائی ہوگی۔58

ایک شرط یہ بھی ہے کہ مورخ تقویٰ اور پرہیز گاری کا ساتھ نہ چھوڑے، تو ہم اور ادلتے بدلتے قرینوں پر مدار نہ رکھے اور ڈرتا رہے کہ نبی کے اس اصول کا مصداق نہ بنے گمان سے بچو اس لئے کہ گمان سب سے زیادہ بے بنیاد بات ہے۔59

ضروری ہے کہ مورخ عالم ہو انصاف پسند ہو جس کے سوانح لکھ رہا ہے اس کے حالات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اس اور خود مورخ کے مابین ایسی دوستی نہ ہو جو مورخ کے لئے تعصب کا سبب بنے اور نہ ایسی عداوت ہو جو مورخ کے لئے اس کی شان گھٹانے کا موجب ہو۔60

مورخ کے لئے شرط ہے کہ وہ سچا ہو۔ جب کوئی بات نقل کرے تو معنی نہیں بلکہ الفاظ پر مدار رکھے

نیز یہ کہ جس سے نقل کرے اس کے نام کی تصریح کرے جس کے سوانح لکھے اس کے حالات سے بہ لحاظ علم کے دین کے اور تمام دوسری صفات سے اچھی طرح واقف ہو۔61

یہ بھی شرط ہے کہ مورخ عبارت اچھی لکھتا ہو الفاظ کے مفہوم سے بخوبی واقف ہو، اور اس کا تخیل ایسا اچھا ہو کہ جب کسی کے سوانح لکھے تو اس کے تمام حالات پر نظر رکھے اور اس انداز سے بیان کرے کہ کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ اپنے ذاتی میلانات سے مجبور ہو کر ایسا نہ کرے جس سے محبت ہو اس کی مداح کو طول دے اور دوسروں کے حق میں کوتاہی کرے۔62

نیز وہ فرماتے ہیں فی الحقیقت ذاتی میلانات کا غلبہ بڑا زور دار ہوتا ہے اس سے وہی بچ سکتا ہے جسے اللہ بچائے البتہ کبھی کبھی ذاتی میلان سے پاک نہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے ذاتی میلان ہی نہیں سمجھتا بلکہ اپنی جہالت اور بدعت کا سبب اس کو حق سمجھتا ہے۔63

ہر شخص ضیاء الدین برنی بھی تاریخ نگاری کے لئے مورخ کو چند خصوصیات کا پابند کرتا ہے اس کے نزدیک ہر شخص مورخ نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:

ا) مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ راست باز اور راست نگار ہو۔ یہ شرط اس لئے ضروری ہے کہ بغیر شہادت پیش کئے بھی جو بات وہ کہتا ہے اس پر لوگ اعتبار کر لیتے ہیں۔64

برنی کی نظر میں مورخ کا دیندار ہونا بھی ضروری ہے اس سے اس کے کردار میں وہ خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جو ایک دیانتدار اور مستند مورخ کے لئے لازمی ہیں۔ برنی کہتا ہے کہ مورخ کے لئے اس کی دینداری کی وجہ سے لازم اور واجب ہو جاتا ہے کہ اگر وہ کسی حکمران یا کسی بڑے آدمی کے عدل و احسان اور اس کی خوبیوں اور کمالات کی تعریف کرتا ہے تو اس کی کمزوریوں اور عیبوں کو بھی ظاہر کرے اور تاریخ نگاری میں مصاحبت اور خوشامد کا انداز اختیار نہ کرے۔65

برنی کے نزدیک اگر کوئی شخص اپنے عہد اور اپنے ہم عصروں کے حالات و واقعات لکھتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں تاریخ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ واقعات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت

پسندی پر زور دیتے ہوئے بری آگے لکھتا ہے کہ اگر تاریخ لکھتے وقت مورخ کو کسی کی ذات سے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے تو اس کو بھول جانا چاہیے یعنی ذاتی مفاد اور نقصان کو پیش نظر رکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر واقعات کو غلط رنگ نہ دینا چاہئے اس کو ہم حقیقت پسندی کہتے ہیں جو صحیح تاریخ نگاری کی لازمی شرط ہے۔66

کومیجر بھی اپنی کتاب مطالعہ تاریخ میں تاریخ نگاروں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

''مورخ کا اصل کام یہ ہے کہ کسی نسل یا کسی دور کے مختلف معاشروں کی دلچسپیوں اور افکار کو جانے سمجھے اور ان کی توضیحات کرے اور تاریخ کے پورے ڈھانچے میں ان مظاہروں کا سراغ لگائے۔ افکار ہمیشہ آفاقی و عالمی ہوتے ہیں۔ مورخ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ قوموں اور زبانوں کی حد بندیوں سے بالا ہو کر ان چیزوں کا جائزہ لے بلکہ ممکن ہو تو وقت کی حدود سے بھی اوپر نکل آئے۔ ثقافتی مورخ کے لئے لازم ہے کہ بہت سے دوسرے ملکوں کی تاریخ سے آگاہ ہو آرٹ، ادب، فلسفہ اور سائنس جانتا ہو اور ان سب کو ایک سلسلے میں امتزاج کی اس کے اندر خاص صلاحیت ہو۔67

بصورت الفاظ دیگر مورخ کا معیار صحت بہت بلند ہونا چاہیے اور اسے ان عناصر کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو حوادث کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، تاریخ چونکہ عمرانیات ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے واقعات کے اسباب و نتائج کا تجزیہ کرتے وقت عمرانیات کی دوسری شاخوں کا مطالعہ، تاریخ نگاری کو نہ صرف دلچسپ بناتا ہے بلکہ اسے آفاقی رنگ بخشتا ہے کسی ملک یا قوم کی تاریخ کو دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کی تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کسی ملک یا قوم کی تاریخ اچانک شروع نہیں ہوتی، تاریخی واقعات میں باہمی ربط ہوتا ہے اس ربط کو اجاگر کرتے رہنا مورخ کے فرائض میں داخل ہے۔68

مترجم تاریخِ فرشتہ عبدالحیٔ خواجہ بھی اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں تاریخ کا دیگر معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام معاشرتی علوم اور علوم تاریخ سے ان کے تعلق پر گہری نظر رکھتا ہو۔69

مستند مسلمان تاریخ نگاروں نے تاریخ نویسی کے جو اصول وضوابط مقرر کئے اور مورخین کو جس طرح

ثقاہت اور دیانت کی شرائط میں جکڑا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں دنیا کی کسی قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ کرنے کے لئے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی روایات کو جمع کرنے اور ہر قسم کے مشاہیر واکابر کے حالات کو ضبط تحریر میں لانے اور آئندہ نسلوں کے لئے باقی رکھنے میں اہل اسلام کی سی احتیاط اور محبت کا ثبوت نہیں دیا۔ مسلمانوں نے جو تاریخی سرمایہ جمع کیا ہے وہ کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے وقیع اور قابل قدر ہے اگر ایک طرف وہ اپنی ضخامت اور وسعت کی وجہ سے حیرت انگیز ہے تو دوسری طرف لوازمے اور مواد کی خوبی اور سچائی کے اعتبار سے متروں ہے۔70

مسلمانوں میں تاریخ کو باقاعدہ اور باضابطہ مرتب کرنے کا شعور رسول اللہ کی تعلیمات اور قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوا قرآن پاک میں تاریخی قصص کا اچھا خاصہ مواد موجود ہے خود حضور اقدس کی سیرت اور آپ کی جنگی مہارت کے بارے میں بھی قرآن میں بہت کچھ ہے۔ پھر قرآن ہی کا حکم ہے کہ لوگوں کو اچھائی کی طرف لاؤ اور برائی کی طرف جانے سے روکو، یہ اور اسی طرح کی دوسری قرآنی تعلیمات سے مسلمانوں پر فرض ہوگیا کہ وہ اتباع رسول کے لیے رسول اکرمؐ کی سیرت و کردار سے پوری طرح نہ صرف خود واقف ہوں بلکہ دوسروں کو واقف کرانے کا بھی اہتمام کریں۔ اس فرض سے عہدہ برا ہونے کے لئے جمع وتدوین وتعلیم حدیث کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مسلمانوں نے احادیث نبوی کی حفاظت، ترتیب، تدوین اور روایات جس احتیاط اور عزم ہمت سے کام لیا اس کی نظیر دنیا کی کوی قوم پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اصول حدیث ار اسماء الرجال وغیرہ مستقل علوم محض حدیث نبوی کی حفاظت اور ترتیب و تدوین کے لئے مسلمانوں نے جیسی محنت اور مشقت سے کام لیا اور جو محکم اصول وضع کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔71

شبلی تاریخ نگاری کے لئے دو باتوں کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کیے جائیں۔ یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔72 قدیم تاریخوں میں یہ

دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن معاشرت کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا۔ فرمانروائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک ہی محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی حال ہے۔

واقعات میں سلسلہ اسباب پر توجہ نہ کرنے کا بڑا سبب یہ ہوا کہ فن تاریخ ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو فلسفہ اور عقلیات سے اشنا نہ تھے اس لئے فلسفہ تاریخ کے اصول و نتائج پر ان کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔73 اس کے علاوہ یہ بحث بھی اہم ہے کہ جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی صحت پر کہاں تک اعتبار ہو سکتا ہے۔74 واقعات کے جانچنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں روایت اور درایت۔ روایت سے مراد یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کے ذریعے بیان کیا جائے جو خود اس واقعہ میں موجود تھا اور اس سے لے کر اخیر راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے۔ اسی کے ساتھ تمام راویوں کی نسبت تحقیق کیا جائے کہ وہ صحیح الروایۃ و ضابطہ تھے یا نہیں۔75

درایت سے مراد یہ ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے، اس امر پر مسلمان بلا شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انھوں نے جس قدر اعتنا کیا کسی قوم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اس کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ توجہ اور اہتمام اگرچہ اصل میں احادیث نبوی کے لئے شروع ہوا تھا لیکن فن تاریخ بھی اس فیض سے محروم نہ رہا۔ طبری، فتو البلدان، طبقات ابن سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسند مذکور ہیں۔76

شبلی مزید لکھتے ہیں کہ واقعات کی تحقیق و تنقید کے لئے درایت کے اصول سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے، درایت کا فن اب ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ اور اس کے اصول و قاعدے نہایت خوبی سے منضبط ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جو اصول ہمارے کام میں آ سکتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

ا۔ واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق۔

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو ایسی نسبت سے نبوت کی شہادت قوی ہے کہ نہیں۔

۴۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے قیاس ورائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

۵۔ راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے۔ یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

٦۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کیے۔

شبلی کہتے ہیں ان اصولوں کی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور ان کے ذریعے سے بہت سے مخفی راز معلوم ہو سکتے ہیں۔77

شبلی بھی تاریخ نگار کو چند حدود کا پابند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مورخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اسباب وعلل کے سلسلے پیدا کرنے کے لئے اکثر جگہ قیاس سے کام لینا پڑتا ہے اس لئے مورخ کو اجتہاد اور قیاس سے چارہ نہیں، لیکن یہ اس کا لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کے واقعہ میں اس قدر مخلوط کردے کہ کوئی شخص دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کرسکے۔78

فصلِ سوم:۔

تاریخ نویسی کی اقسام اور نوعیت

تاریخ کی اتنی قسمیں ہیں جتنے مورخ ہیں اور ہر مورخ اپنے انداز کی تاریخ لکھتا ہے۔ تاریخ کے فلسفی Carl Beeker نے کہا ہے کہ ''یہاں بے شمار مورخ ہیں چونکہ ہر آدمی خود اپنا مورخ ہے۔79 انتظام اللہ شہابی کے خیال میں تاریخ کی دو قسمیں ہیں۔ تاریخ عام اور تاریخ خاص، تاریخ عام میں تمام دنیا کے انسانوں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ اور تاریخ خاص میں کسی خاص قوم یا کسی خاص گروہ یا کسی خاص سلطنت کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔80

السخاوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ میں نے مستند مورخ حافظ ابوعبداللہ الذہبی کی اپنے ہاتھ کی لکھی تحریر دیکھی ہے جس کا متن یہ ہے ''میری جامع بڑی تاریخ ''التاریخ الکبیر المحیط ہے جس میں میں نے اپنا پورا زور صرف نہیں کیا ورنہ وہ چھ سو جلدوں میں پھیل جاتی۔81 ذہبی کہتے ہیں کہ یہ چالیس (قسم کی) تاریخیں ہیں۔ اگر ان سب کو ایک کتاب میں جمع کیا جائے تو وہ بڑی طویل اور پورا بارشتر بن جائے گی ان کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کی بابت یہ ہے کہ عالموں نے ان میں سے بیشتر اقسام پر مستقل کتابیں لکھی ہیں''۔ پھر حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ'' علامہ ذہبی نے جن امور کو مجمل بیان کیا ہے ان میں سے اکثر کی تفصیلات کا میں نے سراغ لگایا اور ان انواع تاریخ سے متعلق تصانیف کو میں نے (اپنی اس کتاب میں) بیان کردیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کا احاطہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں، مزید برآں یہ کہ بہتوں کا تاریخ میں کوئی نام ونشان نہیں ملتا، لیکن ان کی بابت کچھ نہ کچھ معلومات ان تصانیف سے مل سکتی ہیں جو اس علم میں یا اس وصف وغیرہ میں ہیں اور ہاں ان لوگوں کی تاریخ تو وہ چھوڑ ہی گئے جو شدید آزمائشوں سے دوچار ہوتے ہیں۔82

معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے جہاں تاریخ نویسی کے نشو و ارتقاء پر اپنے اثرات

مرتب ہوئے وہیں اس کی حلف میں بھی وجود میں آئیں83 ہیے:

اساطیری تاریخ:۔ یہ تاریخ کا ابتدائی درجہ ہے جو حد درجہ سبق آموز اور دلفریب ہے۔ انسان ابھی نیم وحشی دور میں اور قبائلی تمدن سے آگے نہ بڑھا تھا کہ اسے اپنے آباؤ اجداد اور ناموروں کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا خیال آیا۔ یہ قبیلوں کے وہ سردار ہوں گے جو جسمانی طاقت اور ذہنی شعور کے اعتبار سے لوگوں میں ممتاز تھے اور انھوں نے سماج کے نظم اور قوت لایموت فراہم کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہوگا۔ ہرنوع بعد کے آنے والوں نے ان کی یاد کو محفوظ کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھا بلکہ انہیں دیوتاؤں کا درجہ دیا اس کی بہترین صورت رزمیہ گیت اور منظوم کہانیاں ہوسکتی ہیں تا کہ زبان زد عام ہو جائیں اور لوگوں کو یاد رہیں۔اساطیری تاریخ کی یہ شکل ابتدائی انسانی سماج میں سینکڑوں ہزاروں برس تک جاری رہی۔84

دنیا کے ہر ملک کی تاریخ خواہ وہ یونان ہو یا مصر، چین ہو یا جاپان، ایران ہو یا ہندوستان۔ اساطیر یا دیومالا سے شروع ہوتی ہے۔ حقیقی تاریخ اور اساطیر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تاریخ میں کردار حقیقی اور زمان ومکان مشخص ہوتے ہیں جبکہ اساطیر میں کردار مافوق الفطرت، مسخ شدہ یا محض تخیل کی پیداوار اور زمان ومکان غیر متعین اور نامشخص ہوتے ہیں۔85 کومیجر تاریخ کے اساطیری کردار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے تاریخ ایک داستان سرائی ہے یہ تاریخ کے ابتدائی کردار تھا اور اب تک یہی سب سے زیادہ متاز کردار رہا ہے۔ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے جب یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان رزم و بیکار کا ذکر کیا تھا تو اس نے بھی ایک داستان سنائی تھی جسے بڑے جوش وخروش سے بیان کیا تھا۔86

آثار قدیمہ:۔ آثار قدیمہ کی دریافت نے تاریخی معلومات کے ذخیرے میں نمایاں اضافہ کردیا ہے۔ ماہر اثریات کا بیلچہ ماضی کی حدوں کو صدیوں پیچھے دھکیل رہا ہے آثار قدیمہ کی دریافت نے مصر کی پرانی تاریخ کو ہمارے سامنے بکھیر دیا ہے یہ آثار مصر میں پروہتوں، بادشاہوں، کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کی

رسم الخط:۔ دنیا کے بعض علاقوں میں ایک خاص قسم کا رسم الخط ایجاد ہوا جس کی ابتدائی شکل وہ ہے اور Ideograms ہیں جو مصر اور پھر بابل میں ملتے ہیں۔ دراصل یہ دور وہ ہے جس میں معاش و پیداوار کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ طبقات کی تقسیم ہو چکی تھی اور اب قبائلی ناموروں کی سیادت کی جگہ سول حکومت اور اس کے ہم رکاب مذہب کے ادارے وجود میں آ گئے تھے۔ جن میں عنان اقتدار بادشاہ اور اس کے امیروں کے ہاتھ میں تھی، پرانے قبائلی شیوخ اور ناموروں کی طرح امیروں اور بادشاہوں کا دارومدار قیادت کی خوبیوں اور بہادری پر نہ تھا۔ یہ حق میراث اور قاعدے قانون پر زور دیتے تھے اور مذہبی اور سول حکومت کے کرتا دھرتا ان کے حکم احکام کو معین تحریر میں لاتے تھے، اور قومی روایتوں کو حقیقی زندگی سے جدا کر کے انہیں مذہب کا جامہ پہناتے تھے، گویا اب عوام کے افکار کو نظم و ترتیب دینے کے لئے ایک مخصوص گروہ گنے چنے افراد کا پیدا ہو گیا جو خواندہ اور نئے رسم الخط سے آشنا تھا اور عوام کی حیثیت محکوموں اور غلاموں کی سی ہو گئی تھی۔91

بیانیہ تاریخ:۔ فنیقی لوگوں میں وسیع پیمانے پر بحری تجارت کے ساتھ ساتھ باضابطہ رسم الخط کا رواج پڑا۔ اس کی وجہ سے بیانیہ تاریخ کا نیا باب کھلا۔ بیانیہ تاریخ فنیقیوں سے شروع ہو کر فلسطین، یونان، اور بابل کے زیر اثر شام میں رائج ہوئی اور یہودیوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کتاب الایام لکھی جو ایک مرکزی تصور کے ماتحت مرتب تاریخ لکھنے کی پہلی مثال ہے گو اس میں سنہ و سال کی ترتیب مفقود ہے۔92

سوانح حیات:۔ تاریخ کی ایک قسم سوانح حیات افراد ہے۔ تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہمارے پاس سوانح افراد کی شکل میں ہی آیا ہے۔ عہد نامہ عتیق یعنی بائبل کی مقبول عام کہانیاں سوانح افراد ہی ہیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی کہانیاں، حضرت داؤدؑ اور حضرت ایوبؑ وغیرہ۔ پلوٹارک نے یقیناً تاریخ زیادہ سے زیادہ سوانح افراد ہی کی شکل میں لکھی ہے اور اس کے یونانی مشاہیر کی کہانیاں، ہمارے علم کی حد

تک ایسی ہیں، جنھوں نے ابتدائی دور کے عیسائی پادریوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔93 Thomas Carlyle نے سوانح افراد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے ''دنیا کی تاریخ دراصل ان افراد کی تاریخ ہے جنھوں نے دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا۔ یعنی تاریخ کی تہہ میں وہ جلیل القدر افراد ہیں جو کارفرما ہے۔ وہی انسانوں کے قائد تھے، وہی عظیم القدر تھے انہی نے ہمارے لئے اعلیٰ درجے کے نمونے مہیا کیے اور حقیقت میں وہی ان سب باتوں کو انجام دینے والے تھے جو عام لوگ انجام دینا اور حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں ہمیں معلوم ہوگا کہ چند بڑے افراد ہر دور کو محفوظ رکھنے کے لئے ناگزیر تھے۔ انہی کی بجلی تھی جس کے بغیر ایندھن میں آگ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔94

مشہور افراد کی سوانح حیات کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو لکھتے وقت اسناد کو استعمال کیا گیا۔ اس شخص کو جس کی سوانح لکھی گئی اس کے حالات زندگی، اس کی تصانیف اشعار اور اس سے متعلق اہم واقعات کو لکھا گیا۔ سوانح حیات کے ادب نے تاریخ نویسی میں اہم کردار ادا کیا۔95

ثقافتی تاریخ:۔ تاریخ کی ایک قسم ثقافتی تاریخ نگاری ہے ثقافتی تاریخ کی تعریف آسان نہیں یہ قوم کے قلب ذہن اور کردار کی تاریخ ہوتی ہے۔ اس میں وہ اہم افکار بیان کئے جاتے ہیں جو کسی معاشرے یا دور میں غلبہ حاصل کر گئے یا وہ ادارے جنھیں ہم انسانوں کے مذہب اور کردار سے وابستہ کرتے ہیں96 کسی بھی عہد کی ثقافتی تاریخ سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس عہد کی تعمیرات، مصوری، موسیقی، رقص اور ادب کا بھی مطالعہ کیا جائے خصوصیت کے ساتھ کسی بھی عہد کا فن تعمیر اس عہد کی بھرپر نمائندگی کرتا ہے۔ یہ وہ فن ہے جس میں پورے معاشرے کی تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ تاریخی عمارتوں کا مطالعہ ایک وجدان پیدا کرتا ہے۔ جس کے بغیر کسی بھی عہد کی روح کو نہیں سمجھا جاسکتا ان عمارتوں کے طرز تعمیر ان کی آرائش، ان کا پھیلاؤ ان کی تنگی، ان کی بلندی اور پستی، غرض ان عمارتوں کے ہر پہلو میں اس عہد کی روح اور اس عہد کا ذہن رچا بسا اور آباد ہوتا ہے۔97

معاشرتی تاریخ ہے۔ تاریخ کا تعلق معاشرے کی ساخت اور اس کے عمل و کردار سے ہوتا ہے۔ لہذا معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں تاریخ نویسی کو بھی اپنے اثرات سے متاثر کرتی ہیں۔ اس کی مثال عرب معاشرے سے لی جاسکتی ہے۔ جس میں قبل از اسلام کوئی مرکزیت نہ تھی بلکہ قبائلی نظام کے تحت ہر قبیلہ اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار تھا ان کے ہاں اجتماعی طور پر منظم حکومت اور اس کو چلانے کے لئے ادارے اور باقاعدہ اصول وضوابط نہ تھے۔ علمی و ادبی سرگرمیاں نہ ہونے کے باعث ان کا کوئی علمی ورثہ نہ تھا۔ ان کا ادب صرف شاعری اور قصیدہ گوئی تک محدود تھا ان کے ہاں اہم واقعات ان کے درمیان ہونے والی جنگیں یا قدرتی آفات ہوتے تھے، جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے تھے۔ لہذا ان کے ہاں تاریخ تحریر کی شکل میں نہیں بلکہ افراد کے سینوں میں محفوظ ہوتی تھی ان کے درمیان اہم اور مشترکہ معاشرتی سرمایہ ان کے رسم ورواج اور روایات ہوتے تھے جو ایام کہلاتے تھے لہذا عرب قبائل کی معاشرتی تاریخ کی بنیاد ہی ایام تھے۔98

اسلام سے قبل عربوں کی انواع میں سے ایک اہم نوع علم الانساب تھی جس کے ذریعہ ہر قبیلہ اپنے اجداد کے ناموں کو یاد رکھا تھا۔ نسب کی اہمیت کی وجہ سے ہر قبیلہ میں راوی اور نساب ہوا کرتے تھے جو خاندانی شجروں کو یاد رکھتے تھے اور قبیلہ کے اہم واقعات کو یادداشت میں محفوظ کر لیتے تھے۔ بعد از اسلام جب مسلمانوں میں باقاعدہ تاریخ نویسی کا اہتمام ہوا تو البلازری نے ''الانساب'' تصنیف کی جو نسب کے دائرے کی اہم تصنیف ہے۔99

اسلامی تاریخ نویسی دوسری اہم نوع طبقات ہے۔ قدیم عربوں میں ماضی کی معلومات بیان کرنے کے لئے خبر کا لفظ استعمال ہوتا تھا اس کو بیان کرنے والا اخباری یا راوی کہلاتا تھا۔ جب وقت کے ساتھ ساتھ اہم واقعات بڑھتے چلے گئے اور ان واقعات کو خبر کے ذریعہ بیان کرنا ممکن نہ رہا تو وقت کے تقاضوں کے تحت وقائع نگاری کے ذریعے واقعات کو بیان کرنے کا طریقہ شروع ہوا۔ خبر اور واقعہ نگاری میں جو فرق تھا وہ یہ کہ خبر میں تمام واقعات کو ملا کر ایک جگہ بیان کیا جاتا تھا جبکہ وقائع نگاری میں ان واقعات کو تاریخ

اور سنہ کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ لہذا جب واقعات زیادہ ہونے لگے تو تاریخ میں ان واقعات کو سال کے بجائے مہینہ اور دن کے حساب سے لکھا جانے لگا۔ اس کے بعد تاریخ کو دس سال ''دس سال'' کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا گیا اور اس کا نام ''طبقہ'' رکھ دیا۔100

تاریخ کی اصطلاح میں طبقہ سے مراد ایک درجے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حالات زندگی کو نسلوں کے واقعاتی تسلسل کے ساتھ قلمبند کر دینا ہے مسلمان مورخین نے ایک طبقہ کی مدت کہیں دس سال کہیں بیس سال اور کہیں چالیس سال متعین کی ہے۔101 اگرچہ محمد بن عمر الواقدی نے سب سے پہلے ''طبقات'' کی سب سے پہلی کتاب تحریر کی تھی مگر آج اس کا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے۔ مگر اس کے کاتب محمد بن سعد کی کتاب الطبقات الکبریٰ میں واقدی کی کتاب نقل کر دی گئی ہے۔ ابن سعد کے ''طبقات'' کو حسن ترتیب اور ثقاہت کے لحاظ سے نہایت مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔102

تاریخ نویسی کی اقسام و نوعیت کا یہ انتہائی مختصر جائزہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اپنی تاریخ نہ رکھتا ہو، اگر صرف لفظ کائنات ہی کی وضاحت اور اس کی تاریخ بیان کی جائے تو اس کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہ ہوگا کیونکہ کائنات صرف ہماری زمین تک محدود نہیں بلکہ اس میں تمام سیارے ستارے اور زمین و آسمان شامل ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے موضوع کو صرف زمین تک محدود کر دیں تو اس کی بھی مکمل تاریخ کسی ایک شخص یا عہد کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس زمین پر بسنے والے ہر ذی روح خواہ وہ انسان ہو یا چرند، پرند، آبی و بری حیوانی و اشجار ہر ایک اپنی ایک علیحدہ تاریخ رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان نے جب اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ان تخلیقات الٰہی کو جاننے اور پرکھنے کی کوشش کی تو مختلف علوم وجود میں آتے چلے گئے، اس کے ساتھ تاریخ بھی ایک علم کی حیثیت اختیار کر گئی ہر گذرتا لمحہ تاریخ کا حصہ بنتا چلا گیا لہٰذا آنے والی نسلوں کے لئے اپنا ماضی جاننے کا جو ذریعہ باقی رہا وہ علم تاریخ ہے۔

یہ علم تاریخ ہی ہے جس کے توسط سے انسان نہ صرف اپنی اصل سے آگاہ ہوا بلکہ اپنے اردگرد بسنے والی دیگر قوموں کی تاریخ، ان کے کارناموں اور ان کے عروج سے آگاہ ہوا۔ قدرتی آفات کے تحت آنے

والی تبدیلیوں اور خود انسان کی اپنی غلطیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے زوال سے انسان تاریخ کے ذریعے ہی آگاہ ہوتا ہے۔ گویا تاریخ خود آگاہی کا دوسرا نام ہے جیسے جیسے تاریخ کا علم وسیع ہوا اس کی قسموں میں بھی اضافہ ہوا اب اگر ہم تاریخ کی اقسام کا جائزہ لینا چاہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اس مختصر موضوع کو احاطہ تحریر میں لانا از حد مشکل ہے۔ کیونکہ عالمی، قومی، علاقائی، جغرافیائی، تہذیبی، لسانی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی اور نسلی کسی بھی لحاظ سے مکمل جائزہ ایک مشکل امر ہے۔

فصلِ چہارم:۔

تاریخِ تاریخ نویسی

تخلیق کائنات کے بعد اس زمین پر جب انسانی زندگی کا آغاز ہوا اور انسان نے معاشرتی سطح پر قبیلہ، برادری، قوم اور ریاست کی مشکل میں اپنے آپ کو متحد و مجتمع کیا تو ایک تہذیب اور ثقافت نے جنم لیا۔ زبان ولسان کے قواعد وضوابط تشکیل پائے۔ (الٰہی مذاہب کے علاوہ) فکر انسانی نے نئے نئے مذاہب اور عقائد متعارف کرائے اور نت نئے علوم کی بنیاد ڈالی اور انسانی معاشرت ترقی کی منازل طے کرنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ عروج، زوال میں بدلنے لگا اور قومیں فنا ہونے لگیں۔ ایک قوم اور تہذیب کے کھنڈر پر دوسری قوم اور تہذیب نشونما پانے لگی، جو اپنے علم وثقافت، زبان و بیان اور ادب میں گزری ہوئی قوم کی وارث تھی۔ سبط حسن اس کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قومیں فنا ہو جاتی ہیں مگر نئی نسلوں کے طرز معاشرت پر صنعت وحرفت پر، سوچ کے انداز پر اور ادب وفن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں لیکن ان کے الفاظ اور محاورے، علامات اور استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر ان کا جز بن جاتے ہیں۔

پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے لیکن نئے مذہب کی ہر آ[illegible] ین میں عمامہ و دستار کے ہر پیچ میں پرانے بت پوشیدہ رہتے ہیں۔ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے نقش و نگار سے نئی تہذیب کے ایوان جگمگاتے رہتے ہیں''۔103

تاریخ نویسی کا یونانی دور:

پانچ ہزار برس قبل ایک متمدن تہذیب دجلہ و فرات کی وادی میں ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے مشرق میں پھیل گئی۔ بنی نوع انسان کی دراصل یہ پہلی منظم تہذیب تھی اس تہذیب کا سکہ ڈھائی ہزار برس تک بحیرہ روم سے بحیرہ عرب تک چلتا رہا تب فارس کے آتشکدوں میں مویدین زرتشت کے زمزمے بلند ہوئے اور ہخامنشی فرمانرواؤں نے بابل و نینوا کے ملبوں پر ایرانی تہذیب کی عمارتیں کھڑی کیں، دجلہ و فرات کا تہذیبی دھارا ایرانی تہذیب میں مل گیا اور دوآبے کا مذہب باقی رہا، لیکن وہاں کے باشندوں نے بنی نوع انسان کو پہلی بار علوم و فنون سے روشناس کر کے دنیا پر جو احسان کیا ہے ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ دنیا کے سب سے پرانے گاؤں اسی دوآبے میں ملے ہیں، کاشت کاری نے سب سے پہلے وہیں رواج پایا تھا۔ کمہار کا چاک سب سے پہلے وہیں بنایا گیا تھا۔ سب سے قدیم شہروں کے آثار وہیں برآمد ہوئے۔ شہری ریاستیں پہلے پہل اسی وادی میں قائم ہوئی تھیں۔ اور قانون کا سب سے پہلا ضابطہ اسی سرزمین پر مرتب ہوا تھا۔ مگر دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کا سب سے عظیم کارنامہ فن تحریر کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے مدرسے بھی وہیں سے دستیاب ہوئے ہیں اور پرانی داستانیں ہی اسی خطے میں تصنیف کی گئیں ہیں۔104

گویا تاریخ نویسی کی ابتداء اسی خطے سے ہوئی، ہیروڈوٹس جو بابائے تاریخ کہلاتا ہے اسی خطے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہوسکتا ہے اسی خطے کے علاوہ، ایران، ہند، مصر اور چین جیسے قدیم تاریخی گہواروں میں بھی

تاریخی کتب لکھی گئی ہوں لیکن یونان کے ہیروڈوٹس (پانچ صدی ق م) کے علاوہ کسی کی قدیم تاریخ کا سراغ نہیں ملتا۔105 ڈاکٹر کے ایم اشرف لکھتے ہیں:

''ہیروڈوٹس کو بجا طور پر بابائے تاریخ کا لقب دیا گیا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے ادھر ادھر کے منتشر ٹکڑے ملتے ہیں۔ کوئی باضابطہ تاریخ نہیں ملتی۔ ہیروڈوٹس بھی اپنے پیشرووں کی طرح جدا جدا کہانیاں اپنی کتاب میں جمع کر دیتا ہے لیکن تاریخ کی اصلاح استعمال نہیں کرتا، تاریخ کی اصطلاح پہلی بار افلاطون نے طبعیات کے سلسلے میں استعمال کی تھیں۔ مگر ہیروڈوٹس کے ہاں واقعات مربوط ہیں۔ اس لیے ہم انھیں مجموعی طور پر تاریخ کہہ سکتے ہیں''۔106

ہیروڈوٹس کے بعد دوسرا نامور تاریخ نویس چوتھی صدی ق م میں Thucydides ہے جو تاریخ کے ہمہ گیر قوانین اور اس سے متعلق تاریخی عمل پر زور دیتا ہے۔ ایک اور نام Polybius کا ہے جو دوسری صدی قبل مسیح میں گزرا ہے جو واقعات کو حقیقی اسباب کے تحت بیان کرنے کا حامی تھا۔ یہ اس اصول کے خلاف تھا کہ تاریخ نویسی میں دیوتاؤں اور ان کی اولاد کو کوئی جگہ دی جائے۔ بقول اس کے مورخ کا کام صرف اس سوال کا جواب دینا ہے کہ واقعات کیوں، کیسے اور کن وجوہ کی بناء پر رونما ہوئے بالفاظ دیگر واقعات کے اسباب، اثرات اور نتائج دریافت کرنا۔ فنی اعتبار سے وہ زبانی اور تحریری دونوں قسم کے اسناد کے لیے نقد و بحث پر زور دیتا ہے اور افسانوں اور کہانیوں کے لیے بھی اس کا قائل ہے کہ انھیں عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ یونانیوں کے وارث رومیوں نے تاریخ نویسی میں انہی کا تتبع کیا۔ البتہ رومی عہد میں ترتیب سن وسال کا رواج پڑ گیا۔ اس فن تاریخ کو بڑی مدد ملی۔107

تاریخ نویسی کا ایرانی دور:

ایران میں قدیم طرز کی تاریخ نویسی کا ازمنۂ قدیم سے ہی رواج چلا آرہا تھا۔ جیسا کہ ہنخامنشی دور (۵۵۰۔۳۳۰ ق م) اور ساسانی دور کے ان کتبوں سے ظاہر ہے جن پر ان شاہی خاندانوں کے بادشاہوں کے عہد کے اہم واقعات کندہ کیے گئے ہیں۔108 ان کتبوں کے علاوہ ان کتابوں میں چونکہ حقیقت وافسانے کی آمیزش ہے اور تاریخ پر اساطیری یا دیومالائی رنگ چڑھا ہوا ہے اس لیے ان کو خالصۂ تاریخی تصانیف نہیں کیا جاسکتا۔109 کتبوں کے علاوہ عباسی خلافت میں ساسانی اثرات کے تحت ایرانی افسانوں پر مشتمل بہت سی کتب کے پہلوی زبان سے عربی میں ترجمے ہوئے۔ متعدد ترجمہ شدہ کتابوں میں سے چند ہزار افسانہ، نمرود شاہ بابل، شہریز از نوشروان، بہرام و نرسی، خداینامک، رستم و اسفندیار ہیں۔110 جہاں تک کسی معینہ سنہ اور تاریخ کا تعلق ہے ایران میں اس کا رواج نہ تھا بلکہ ہر نئے بادشاہ کے عہد حکومت سے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوتا تھا، جب کہ شاہان ایران کا سلسلہ یزجرد ثالث پر آخر ختم ہوگیا تھا۔111

دیگر اسلامی ممالک کی طرح ایران میں بھی صحیح معنوں میں تاریخ نویسی کا آغاز ظہور اسلام کے بعد ہی ہوا۔ ابتداء میں جب تک ایران مرکز اسلامیہ سے وابستہ رہا یہاں کی علمی وادبی اور تہذیبی زبان عربی قرار پائی لیکن جب مرکز اسلامیہ کی کمزوری کے باعث خودمختار اور نیم خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں تو ایرانی علاقوں پر قائم ہونے والی حکومتوں نے فارسی زبان کی سرپرستی اور احیاء کیا، ان حکومتوں میں صفاری سامانی، غزنوی اور سلجوقی شامل ہیں۔112 سلجوقی اگرچہ ترک تھے لیکن چونکہ وہ عربی زبان سے نابلد تھے دوسرے ان کا اقتدار وسط ایشیاء اور ایرانی مقبوضات پر قائم ہوا تھا لہذا انھوں نے بھی فارسی زبان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی سرپرستی میں بھی تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ غزنوی اور سلجوقی دور میں لکھی جانے والے تاریخ میں زین الاخبار یا تاریخ گردیزی، تاریخ آل سبکتگین یا تاریخ بیہقی، مجمل التواریخ و القصص، سلجوق نامہ، راحۃ الصدور وآیۃ السرور، تاریخ یمینی اہم ہیں۔113

تاریخ نویسی کا عربی دور:

رومیوں اور ایرانیوں کے ہمسایہ عربوں کے ہاں تحریر و تعلیم کا رواج نہ تھا۔ وہ اپنی خداداد قوت حافظہ پر انحصار کرتے تھے۔ ان کے ہاں تاریخ کا زبانی سرمایہ جو ملوک روم وعجم کے قصوں، اساسیری داستانوں عربوں کی خوبیوں وخصوصیات پر مبنی شاعری اور انساب پر مشتمل تھا۔ شجرۂ نسب کو عربوں میں خاص الخاص اہمیت حاصل تھی جو قبائل کے شرف و امتیاز کا سبب تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں پالے جانے والے جانور بھی نسب ونسل کی بنیاد پر اہمیت حاصل کرتے تھے۔114 دائرہ معارف اسلامیہ میں عربوں کی تاریخی روایات کے بارے میں لکھا ہے:

> ''توقع تو یہ تھی کہ یمن میں جو ایک قدیم تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے اور جس کی یادگاریں اب تک یعنی (Mineen) صبائی اور حمیری کتبوں کی صورت میں محفوظ چلی آتی ہیں، کسی نہ کسی قسم کی تحریری تاریخی روایت دستیاب ہوگی، لیکن جو کچھ اس سلسلے میں ہم تک پہنچا ہے اس پر صرف زبانی روایت کے نقوش موجود ہیں یعنی چند پرانے بادشاہوں کے نام، زمانہ بعید کی مبہم اور مبالغہ آمیز داستانیں اور اسلام سے قبل کی آخری صدی کے واقعات کی مقابلۃً صحیح لیکن دھندلی سی یاد۔115 پہلی صدی ہجری میں ان زبانی روایات کو تخیل کے زور سے بڑھا چڑھا کر داستانوں کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا اور یہی داستانیں قدیم تاریخ عرب سمجھی جاتی تھیں۔116

ظہور اسلام سے قبل عربوں کا تاریخ سے شغف اور ان کی پسند کا اظہار ان کے ''ایام'' سے ہوتا تھا۔ ایام میں دو یا دو سے زائد قبیلوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کے واقعات کی تفاصیل بیان کی جاتی تھیں۔ اور قبیلہ کے سورماؤں کے شجاعانہ کارناموں کا ذکر ہوتا تھا۔ اپنے قبائل اور قبائل کے دلیر اور سرکردہ افراد کے

قابل فخر حالات کا بیان عربوں کے ذوق و مذاق کا حصہ تھا۔ قبول اسلام کے بعد بھی عربوں کا یہ ذوق برقرار رہا اور اس نے رسول اللہ اور ان کے نامور صحابہ کے کارناموں کا ریکارڈ رکھنے کی صورت اختیار کر لی۔117 مسلمانوں میں فن تاریخ کا آغاز علم حدیث کی ترتیب و تدوین سے ہوا۔ اور اسی طرز و انداز میں انھوں نے اپنے خلفاء، امراء، حکماء اور سلاطین کے حالات قلمبند کیے۔118

برناڈ لوئیس (Bernad Louis)، گب (Gibb) اور روزنتھال (Rosenthal) جیسے علمائے تاریخ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اسلامی تاریخ نویسی کا عظیم الشان قصر قرآن و حدیث کی بنیادوں پر استوار ہے اور یہ یونان، روم اور ایران کی تاریخ نویسی کی قدیم روایات سے یکسر بے نیاز اور اسلامی معاشرے کے احتیاجات و مقتضیات کا فطری نتیجہ ہے۔119

تاریخ نویسی کا اسلامی دور:

مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا آغاز سیرت و مغازی سے ہوتا ہے جس کا آغاز قرن اولیٰ میں ہی ہوگیا تھا، اور جس کا سلسلہ عہد حاضر تک اسی جوش و جذبے کے ساتھ جاری ہے۔ سیرت نگاری کے منفرد و اچھوتی خوبی یہ ہے، کہ حیات رسول کا ہر جہت سے جائزہ لینے کے باوجود کوئی مصنف و مؤلف اپنی تصنیف یا تالیف کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ صدر اسلام میں صحابہ کرام اور تابعین نے پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کی مقدس زندگیوں اور جنگوں کے حالات قلمبند کر کے نہ صرف تاریخ نویسی کی ابتداء کی بلکہ اس میدان میں وسعت پیدا کر دی۔ ان حضرات میں سے عقیل ابن طالب (متوفی ۵۰ھ)، زیاد بن ابی سفیان (متوفی ۵۰ھ) صحابہ میں ہوتا ہے۔ عقیل انساب کے ماہر تھے اور باقاعدہ مسجد نبوی میں اس موضوع پر لیکچر دیتے تھے۔120

محمد بن اسحٰق کا کہنا ہے کہ پہلا شخص جس نے مثالب کے موضوع سے متعلق کتاب لکھی، زیاد بن ابیہ ہے۔ جب خود اس کو اور اس کے نسب کو ہدف طعن ٹھہرایا گیا تو اس نے یہ کتاب تصنیف کی اور اپنے بیٹے کو

دے کر کہا کہ تم عربوں کے طعن و تشنیع کو ختم کرنے کے لیے اس کا سہارا لو، اس سے عرب تمہیں ہدف طعن قرار دینے سے رک جائیں گے۔121 عبید بن شریہ جرہمی طبقہ تابعین میں شامل ہیں۔آپ نے رسول اکرم کا زمانہ پایا لیکن آپؐ سے کچھ سماع نہیں کیا۔آپ یمن سے تعلق رکھتے تھے، عہد بنو امیہ میں حضرت معاویہؓ کے حکم پر آپ نے کتاب الملوک واخبار الماضیین تحریر کی، جس میں گزشتہ اقوام اور ملوک عرب و عجم کے اخبار و احوال، اختلاف السنہ کے وجوہ اور لوگوں کے مختلف شہروں میں بکھر جانے کے علل و اسباب تحریر کیے تھے۔ عبید کی دوسری تصنیف کتاب الامثال ہے۔122 عوانہ بن حکم نے ''کتاب التاریخ اور سیرت معاویہ'' کے موضوع پر دو تالیفات مرتب کیں۔ ابن ندیم کے مطابق عوانہ علمائے کوفہ میں سے ہے، واقعات و اخبار کا راوی اور شعر و نسب کا عالم ہے۔ نابینا تھا اور فصیح تھا۔123

عروہ بن زبیر، جو حضرت ابو بکرؓ کے نواسے اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔انھوں نے علم سیرت اور مغازی کے بارے میں ایک مجموعہ مرتب کیا جو تحریری تھا، اور وہ اپنے طلباء کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔اس مجموعے میں بعض خلفاء نے بھی دلچسپی لی، اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجموعہ ان کے لیے بھی مرتب کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا یہ مجموعہ ایک سے زائد بار مرتب کیا۔انھوں نے خود اپنے دست مبارک سے جو نسخہ لکھا تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں کو جو چیزیں املا کرائی تھیں وہ محفوظ ہیں۔ ان کے شاگردوں کا لکھا ہوا مجموعہ مشہور مورخین اسلام طبری، ابن سعد اور واقدی تک پہنچا، ان سب مورخین نے اس سے پورا پورا استفادہ کیا اور اس کے مندرجات کو اپنی کتابوں میں سمویا۔آج سے کوئی پندرہ سال پہلے ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ان ساری کتابوں سے عروہ بن زبیر کو کتاب کے سارے حوالوں کو جمع کر کے ''مغازی عروہ بن زبیر'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر دی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح عروہ بن زبیر کی معلومات کا سارا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ان کے ذخیرہ معلومات کا خاصہ حصہ دریافت ہو کر یکجا ہو گیا ہے۔124

تابعین میں مزید تین نام ایسے ہیں جنھوں نے سیرت اور مغازی کے بارے میں صحابہ کرام سے

آنے والی معلومات کے ذخائر کو مرتب اور منظم کرنے میں بہت نمایاں دلچسپی لی اور قابل ذکر کام کیا ان میں سے ایک وھب بن منبہ (متوفی ۱۲۸) ہیں۔ یہ اور ان بھائی ہمام بن منبہ دونوں حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ ہمام بن منبہ نے احادیث مرتب کیں، وہب بن منبہ نے سیرت اور مغازی کی روایات جمع کیں۔ ان کی اس کتاب کا نسخہ جو ان کی وفات کے سو سال بعد ۲۲۸ھ میں لکھا گیا تھا، جرمنی کے ایک کتب خانے میں موجود بتایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہجرت کے واقعات اہتمام سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے تابعی جنھوں نے تدوین سیرت میں نمایاں کام کیا شرحبیل بن سعد تھے۔ آخری تابعی محمد بن شہاب زہری تھے جو امام مالک سمیت بہت سے دوسرے محدثین کے استاد ہیں۔125 الزہری کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مختلف مآخذ سے حدیثیں جمع کر کے انھیں ایک مسلسل بیان کی صورت میں مرتب کیا۔126 ان کے علاوہ ابان بن عثمان (متوفی ۱۰۵ھ) نے بھی تاریخ پر کتاب تحریر کی اور عامر بن شراحیل شعبی (متوفی ۱۱۰ھ) نے بھی تاریخ پر کتابیں تحریر کیں۔127

ہجری کی دوسری صدی کا زمانہ علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے اسلامی تاریخ کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے علمی وتہذیبی منظر نامے میں جن شخصیات نے پائیدار نقوش ثبت کیے، ان میں ایک نمایاں نام محمد بن اسحٰق بن سیار (متوفی ۱۵۰ھ) کا ہے، جس کی مشہور کتاب ''سیرۃ رسول'' اپنے پیشروں اور معاصرین کی تصنیفات کے مقابلے میں ایک وسیع تر تصور کا نتیجہ تھی، کیونکہ اس میں نہ صرف آنحضرتؐ کی سیرت قلمبند کی گئی تھی بلکہ اس میں تاریخ نبوت لکھنے کا اہتمام ہوا۔128 ابن ندیم کی الفہرست سے پتہ چلتا ہے کہ ابن اسحٰق نے اس فن میں تین کتابیں لکھی تھیں۔ کتاب السیر والمغازی، کتاب السیرۃ والمبتدا اور کتاب الخلفاء پہلی دو تصانیف سیرت رسولؐ کے موضوع پر تھیں اور تیسری خلفائے اسلام کے حالات کے بیان میں تھیں۔ مرور ایام سے یہ کتابیں ناپید ہوگئیں۔129 لیکن کتاب السیر والمغازی، ابن ہشام (متوفی ۲۱۳ھ) کی کتاب السیرۃ النبویہ میں کم و بیش محفوظ ہے۔ ابن اسحٰق کی کتاب کو عموماً مستند اور ثقہ ماخذ تسلیم کیا گیا ہے مگر عرب قبل الاسلام اور بعثت نبوی کے بعد بعض واقعات کے ضمن میں جو اشعار مروی ہیں، ان میں سے بیشتر پایۂ اعتبار

سے ساقط ہیں۔130

سیرت نگاری کے موضوع پر قدیم ترین تالیفات میں سے جو زمانہ برد ہونے سے محفوظ رہیں، ان میں سے ایک علامہ ابو محمد عبدالملک بن ہشام (م ۲۱۸ھ) کی شہرہ آفاق کتاب ''سیرۃ الرسول'' ہے۔ محققین و مورخین نے اسی تالیف کے سبب ابن ہشام کے سر پر شہرت عام اور بقائے دوام کا سہرا باندھا ہے اور ہر دور کے سیرت نگاروں اور مسلمان مورخوں نے اس لافانی تالیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ دراصل ابن ہشام نے اپنے استاد محمد بن اسحٰق کی مبسوط تالیف کتاب المغازی کی مناسب تہذیب و اصلاح کر کے ایک نئی کتاب ''سیرت الرسول'' کے نام سے ترتیب دی ہے۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی روایات میں کہیں کہیں مناسب اضافے فرمائے، جہاں کہیں انھوں نے اضافے کیے اس کی تصریح کی، جہاں ابن اسحٰق سے اختلاف کیا وہاں اپنے موقف کی تائید میں ٹھوس دلائل دیئے، جو روایتیں آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے قریبی مناسبت نہ رکھتی تھیں انھیں اپنی تالیف سے خارج کر دیا۔ مشکل مقامات اور مبہم اصطلاحات کی تشریح و وضاحت کی اور غیر ضروری عربی اشعار حذف کر دیئے۔131

ابن ہشام نے اپنی کتاب کی تمہید میں حضرت آدم سے لے کر رسول اکرم تک جملہ انبیاء کے حالات کا تذکرہ کر کے اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا ہے کہ نبوت کا سلسلہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کوئی نئی تحریک نہ تھی جو وقتی حالات کی پیداوار ہو بلکہ یہ اللہ کا ازلی پیغام ہے جسے مختلف تاریخی ادوار میں انبیاء نے عالم انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیش کیا۔132

ابن اسحٰق کے مشہور جانشینوں میں سے محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰۔۲۰۷ھ) نے نہ صرف مغازی نبی کے موضوع پر کتابیں لکھیں بلکہ اس نے بعد کی اسلامی تاریخ کے کئی حوادث پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا اس کے علاوہ عہد ہارونی تک ایک بڑی تاریخ کتاب الکبیر بھی لکھی۔133 واقدی کی صحت کے بارے میں شبلی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، محمد بن اسحٰق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں۔ شہرت عام میں اگرچہ واقدی بھی ان سے کم نہیں لیکن واقدی کے لغو بیانی مسلمہ عام ہے،

اس لیے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے۔134 واقدی کو محدثین اعلانیہ کذاب کہتے ہیں۔135

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت وملوکیت میں لکھتے ہیں۔ ابن سعد کے استاد واقدی کو حدیث میں ضعیف کہا گیا ہے۔ مگر سیر ومغازی کے معاملہ میں تمام اہل حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔136 ابن ندیم نے الفہرست میں واقدی کی بیس اکیس کتابوں کے نام گنائے ہیں جو بیشتر تاریخی واقعات، بالخصوص غزوات اور فتوحات کے بارے میں ہیں۔ اس کی تصانیف میں سے صرف اس کی کتاب المغازی ہی اپنی اصل حالت میں ہے۔137

واقدی کے مواد کا بڑا حصہ اس کے اپنے کاتب محمد ابن سعد (۱۶۸۔۲۳۰) نے آنحضرتؐ، آپ کے صحابہ، اور تابعین کی سیرت نگاری میں استعمال کیا ہے۔ اس کی کتاب طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔138 ابن سعد کی ثقاہت پر تمام محدثین ومفسرین نے اعتماد کیا ہے بلکہ علمائے حدیث بھی ثقہ، ثبت، صدوق اور حجت مانتے ہیں۔139 ابن ندیم کے مطابق یہ ثقہ اور پارسا شخص تھا۔ اخبار صحابہ وتابعین کا عالم تھا۔140 شبلی لکھتے ہیں ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابل سند ہیں۔141 ان کی کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں اس لیے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کی جاسکتی ہیں۔142

تیسری صدی ہجری میں صنف تاریخ نگاری میں وسعت کے ساتھ ساتھ ہمیں متعدد اہم نام ابوالحسن علی مدائنی (متوفی ۲۱۵ھ) مولف فتوح العراق، احمد بن یحییٰ البلازری (۲۷۹ھ)، مولف فتوح البلدان،143 ابوحنیفہ دینوری مولف اخبار الطول، احمد بن ابی یعقوب عرف ابن واضح (۲۸۴ھ) مولف تاریخ یعقوبی جیسے عظیم مورخ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے غیر عربی ماخذ خصوصاً پہلوی ماخذ سے استفادہ کر کے عربی یا اسلامی تاریخ نویسی کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔144 خصوصاً ابوحنیفہ دینوری اور احمد بن ابی یعقوب کی تاریخ نویسی میں یکسانیت کے باوجود دو مختلف رجحانات نظر آتے ہیں۔ مثلاً دینوری نے اپنی کتاب ''الاخبار الطوال'' میں ایرانی نقطہ نگاہ کی ترجمانی کی، شاہان ایران کی تخت نشینی کے تسلسل پر واقعات کی بنیاد رکھی حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی حیات

طیبہ کا ذکر بھی کسریٰ نوشیرواں کے حالات حکومت کے ضمن میں کیا۔ اسی طرح ابن یعقوب نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ یعقوبی'' میں تاریخ اسلام سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا کر دیا جو اہل تشیع کے نقطۂ نگاہ سے اہم تھیں۔145 یوں اس کی کتاب ایک مخصوص طبقے کی مرویات کا مستند ترین مجموعہ ہے۔146

اس عہد کا تیسرا مورخ محمد بن جریر طبری (۲۲۴۔۳۱۰) ہے۔ جس کی شہرہ آفاق تصنیف ''تاریخ الرسل والملوک'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاریخ علامہ طبری نے اپنی آخری عمر میں لکھنا شروع کی۔ جو ۳۰۲ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ علم وفن کے اعتبار سے بغداد کا بہترین زمانہ خود مورخ کا زمانہ ہے۔ عباسی خلیفہ واثق باللہ کے دور سے لے کر مقتدر باللہ تک کا دور علامہ طبری کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔

یہ مقام صرف طبری ہی کو حاصل ہے کہ وہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ تفصیل مہیا کرتا ہے۔ یہی وہ تاریخ ہے جو زمانہ قدیم سے لے کر عصر حاضر تک تاریخ اسلام کا ایک اہم ماخذ رہی ہے۔ اس لیے تمام مورخین نے اسی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لیے اس کتاب کو تاریخ اسلام کی امہات الکتب کا درجہ دیا جاتا ہے۔147 لیکن یہ کتاب جس صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔ بظاہر اس عظیم الشان تصنیف کا خلاصہ ہے جو اصل میں لکھی گئی تھی۔ البتہ جہاں تفسیر میں مصنف کی تنقید صریحی ہے۔ تاریخ میں وہ تنقید ضمنی ہے۔148

طبری ہی کے عہد کے نامور مورخ مسعودی کی تالیفات سے مسلم تاریخ نویسی کی چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔ مسعودی (متوفی ۳۴۵ھ) وہ پہلا مورخ ہے، جس نے اپنی کتاب میں مسلم معاشرے کے ساتھ ساتھ ہندی، چینی، یونانی اور رومی معاشروں کی تاریخ پر بھی قلم اٹھایا، اس طرح مسعودی کی کوششوں سے تاریخ کا دائرہ بیان واقعات اور نقطہ نظر دونوں اعتبار سے وسیع ہوا۔ مسعودی، مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ جغرافیہ دان بھی تھا، اس نے تمدنوں اور تہذیبوں پر آب و ہوا اور جغرافیائی کوائف کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔149

مسعودی اپنے تبحر علمی اور وسیع تاریخی معلومات کی بناء پر مشہور ترین عالمی مورخین میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مشہور فرانسیسی مورخ فان کریم کا اسے ''عرب کا ہیروڈوٹس'' لقب دینا اور ایک دوسرے مشہور مورخ

فازیلیف کا اس کی نادر و نایاب تصنیفات پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے فان کریم کی تصدیق کرنا اس کے لاثانی علمی کارناموں کا اعتراف ہے۔150 Hitti نے بھی اپنی تصنیف ''تاریخ عرب'' میں مسعودی کو عرب کا ہیروڈوٹس لکھا ہے، مسعودی کی تاریخی تصانیف، مروج الذہب والمعادن الجواہر، اور تنبیہ والا شراف ہیں۔151 چوتھی صدی ہجری میں مسعودی کے علاوہ دوسرا اہم مورخ ابن مسکویہ (۳۳۰۔۴۲۱ھ) ہے۔ یہ مشہور حکیم اور فلاسفر تھا۔ اس کو فنِ تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔ تاریخ پر اس کی کتاب تجارب الامم ہے۔152

پانچویں صدی ہجری میں جن شخصیات نے علم تاریخ پر قلم اٹھایا، وہ اپنے دور کے نامور محدث اور جید علماء تھے۔ مثلاً خطیب بغدادی (۳۹۲ھ۔۴۶۳ھ) اور ابن عساکر (۴۹۹ھ۔۵۷۱ھ)۔ ان دونوں مورخوں نے مشہور شہروں (دارالسلطنتوں) کی تاریخ لکھی جو اس زمانے میں ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ خطیب بغدادی کی ''تاریخِ بغداد'' چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکثر تصانیف تلف ہو چکی ہیں۔ اسی اسلوب پر ابن عساکر نے ''تاریخِ دمشق'' مرتب کی جو غالباً عربی ادبیات میں اپنی قسم کی نہایت جامع کتاب ہے۔153

چھٹی صدی ہجری کے نامور مورخوں میں ابوالفرج ابن جوزی (۵۸۲ھ۔۶۸۴ھ) کی ''میراث الزمان فی تاریخ الایام'' ایک عالمی تاریخ ہے۔ جبکہ عزالدین ابن اثیر (۵۵۵ھ۔۶۳۰ھ) کی ''اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ'' اور ''الکامل فی التاریخ'' تاریخ کے موضوع پر اہم کتابیں ہیں۔ الکامل فی التاریخ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں علم تاریخ کی اہم شاخ تذکرہ نویسی میں شیخ شہاب الدین یاقوت حموی (۵۷۴ھ۔۶۲۶ھ) اور قاضی ابن خلکان (۶۰۸ھ۔۶۸۱ھ) تذکرہ نویسی کی حقیقت سے قابل ذکر ہیں۔154

ابو الفداء (۶۷۲ھ۔۷۳۲ھ)، علامہ ذہبی (۶۷۳ھ۔۷۴۸ھ) اور ابن کثیر آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر مورخ ہیں۔ خصوصاً علامہ ابن کثیر (۷۰۱ھ۔۷۷۴ھ) نے فن روایت کو فن تاریخ نویسی کی بنیاد بنایا، اور تاریخی روایات کی تہذیب و تنقیح کا حق ادا کر دیا اور ایسی متعدد معروف لیکن ضعیف

روایات کو مسترد کر دیا، جو مسلمانوں کے سرمایۂ تاریخ میں جمع ہو کر ذہنوں کو پراگندہ کر رہی تھیں۔ ان کی تصنیف ''البدایہ والنہایہ فی التاریخ'' ایک عالمی تاریخ ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔155 ان کے علاوہ ایک اور اہم نام شرف الدین ابو محمد دمیاطی کا ہے۔ آپ فقہ، حدیث اور لغت کے ماہر تھے، فقہائے شافعیہ کے اکابرین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کی تصنیف ''المختصر فی سیرۃ سید البشر'' کے حوالے اکثر کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ پٹنہ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔156 ان کے علاوہ آٹھویں صدی امام المورخین ابن خلدون (۷۳۲ھ۔ ۸۰۸ھ) کی صدی ہے جس نے عمرانیات، اجتماعیات، اقتصادیات، اور سیاست کے متنوع عنوانات پر خیال افروز بحثیں کر کے تاریخ کے موضوع کو بے پایاں وسعت دی۔

نویں صدی ہجری میں شام و مصر نے جلیل القدر مورخین پیدا کیے، ان میں علامہ مقریزی اور حافظ سخاوی (۸۳۱ھ۔ ۹۰۲ھ) نمایاں ہیں۔ حافظ سخاوی نے علم تاریخ کے فوائد اور اس کی خوبیوں پر ایک کتاب ''الاعلان بالتوبیخ'' کے نام سے لکھی۔ اس میں سینکڑوں ایسی کتابوں کا ذکر ہے جو قصص الانبیاء، سیرۃ النبوی، تاریخ صحابہ، خلفاء و سلاطین وزراء، محدثین، مورخین، اطباء و ادباء اور شعراء کے حالات میں لکھی گئی تھیں۔157 ان کتابوں کے محض عنوان ہی پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ نویسی کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس میں مسلمانوں نے مستقل تصانیف یادگار نہ چھوڑی ہوں۔ دسویں صدی ہجری کا نمایاں نام جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ۔ ۹۱۱ھ) ہیں۔ تاریخ پر سیوطی کی معروف کتاب تاریخ الخلفاء ہے۔158

اسلامی و عالمی تاریخ نویسی میں مسلمانوں نے اتنا بھرپور کردار ادا کیا ہے کہ انتہائی اختصار کے باوجود تمام کا جائزہ لینا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ مورخین کے صرف نام ہی تحریر کر دیئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ لہٰذا مقالے کے ایک ذیلی عنوان کی ضرورت کے پیش نظر اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے علمائے تاریخ اسلامی اندلس، دولت عثمانیہ، صفویہ، فاطمی، ایوبی اور مما لک کے ناموں اور کارناموں سے صرفِ نظر کیا ہے۔

فصلِ پنجم :۔

برصغیر میں تاریخ نگاری کی مختصر تاریخ

برصغیر پاک و ہند جو اپنی قدیم تاریخ سے ہندوستان یا ہند کے نام سے معروف ہے، دریائے سندھ کے ساحل پر جنم لینے والی تہذیب کا وارث ہے۔ اپنی ہم عصر تہذیبوں میں تہذیبی تمدنی، اور علمی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتا ہے، اس کی تاریخ کے مطالعہ سے جو حیرت انگیز بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس سرزمین کے باسیوں نے فلسفہ، مذہب، فلکیات اور ریاضیات کے نشو و ارتقاء پر تو بھرپور توجہ دی اور ان کی سرپرستی کی لیکن تاریخ نگاری کی جانب کبھی توجہ مبذول نہیں کی۔ عہد قدیم کے ہندو اور اس میں رہنے والے ہندوؤں کے متعلق جو مختصر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کا ذریعہ پرانے کتبے، پتر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ رامائن اور مہابھارت کو ہندو اتہاس (یعنی تاریخ) کہتے ہیں۔ لیکن تصانیف کا مطالعہ کرنے والا فی الفور اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ داستان گوئی، شاعری اور ندرت تخیل کے اعتبار سے ان کتابوں کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو انھیں تاریخ یا بیان واقعات سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ بعض ہندو نقادوں اور مورخوں تک کو یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ رام، کرشن اور ان کے متعدد کردار حقیقت میں کبھی موجود اور زندہ بھی تھے۔159

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق کسی قدر معلومات یونانیوں کی بعض کتابوں اور سفرناموں سے دستیاب ہوتی ہیں، جن کو بعض یورپی مورخین نے اپنی تصنیفات میں استعمال کیا ہے۔ لیکن یونانی اور فارسی تاریخوں کے درمیان جو کئی سو سال کا زمانہ حائل ہے اس کے متعلق جتنی معلومات ہندوستان کی نسبت عرب مورخین خصوصاً سلیمان تاجر، ابو زید حسن سیرافی، ابو ذلف مسعر بن مہلھل، بزرگ بن شہریار، مسعودی، ابو اسحٰق اصطخری، ابن حوقل، بشار مقدسی، ابن بطوطہ، البلاذری، ابو الفداء، یاقوت حموی، محمد علی کوفی اور البیرونی سے حاصل ہوتی ہیں وہ کہیں اور دستیاب نہیں۔160 مختلف ادوار میں ہندوستان آنے والے مورخین کی کتب، ہندوستان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات پر مشتمل ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر یہ عرب مورخین نہ

ہوتے تو ہندوستان کی آج سے ہزار سال پہلے کی تاریخ بھی پردہ ظلمت میں پوشیدہ رہتی جس طرح اس کی قدیم تاریخ اندھیرے میں ہے۔161

عہد سلاطین میں فارسی تاریخ نویسی کا آغاز:

قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ و تاریخ نویسی کی جو خدمت عرب و عجم کے مسلمانوں نے انجام دی، دنیا کی کسی دوسری قوم کو اس کی توفیق حاصل نہ ہو سکی، دوسرے یہ کہ عباسیوں کے دور انحطاط میں جب اسلامی علوم و فنون کا مرکز بتدریج بغداد سے ایران میں منتقل ہو گیا تو اسلامی تاریخ نویسی کی وہ مشعل جو عربوں نے روشن کی تھی، ایرانیوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی مسلمانان برصغیر کے ہاتھ میں آئی۔ جنھوں نے فارسی زبان میں بے شمار تاریخیں لکھ کر اس کو اور زیادہ فروزاں کیا۔

اسلامی عہد (۶۰۲-۱۲۷۴ھ) میں برعظیم فارسی تاریخ نویسی کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔162 یہاں تک کہ عربی کتب تاریخ جو گوشۂ گمنامی میں تھیں جب فارسی زبان میں منتقل ہوئیں تو سرمایہ تاریخ میں اضافہ کا سبب بنیں۔ اس کی مثال ہمیں ''تاریخ سندھ المعروف منہاج الدین والملک'' میں نظر آتی ہے، جو بھکر کے قاضی مولانا کمال الدین کے اسلاف کی مرتب کردہ تھی اور عربی زبان میں تھی۔ لیکن جب اسے محمد علی بن حامد کوفی نے فارسی زبان کے سانچے میں ڈھال دیا تو یہ تاریخ میں ''فتح نامہ'' اور ''چچ نامہ'' کے نام سے معروف ہوئی۔163 فاضل مترجم محمد علی بن حامد کوفی نے کتاب ''منہاج الدین والملک'' کے ترجمے کا بیڑہ جن علمی محرکات کے زیر اثر اٹھایا اس کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

> ''چونکہ یہ کتاب عربی زبان کے حجاب، اور حجازی اسلوب کے نقاب میں چھپی ہوئی تھی اس لیے خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی تاہم جب میں اس گراں مایہ تصنیف سے متعارف ہوا تو دیکھا کہ یہ کتاب حکمت کے جواہروں سے آراستہ اور نصیحت کے موتیوں سے پیراستہ تھی۔

چنانچہ میں نے اس تصنیف کو عربی سے فارسی زبان میں منتقل کر

دیا''۔164

صباح الدین عبدالرحمٰن، چچ نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''چچ نامہ سندھ کی ایک مستند تاریخ ہے بعد کے مورخوں مثلاً نظام الدین بخشی، مولف طبقات اکبری، صاحب تاریخ فرشتہ، میر معصوم (مولف تاریخ سندھ) اور میر علی قانع ٹھٹھوی (صاحب تحفۃ اکرام) نے چچ نامہ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس تاریخ سے اس زمانے کے سندھ کے مذہبی، عمرانی اور معاشرتی حالات سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں''۔165 ڈاکٹر مبارک علی کی رائے میں ''سندھ کی تاریخ کے بارے میں پہلی کتاب چچ نامہ یا فتح نامہ ہے جسے علی کوفی نے حاکم سندھ ناصر الدین قباچہ (۱۲۰۶ء۔ ۱۲۲۸ء) کے زمانے میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ چونکہ اس کے عربی مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی اس کتاب کا کوئی اور دوسرا نسخہ دستیاب ہوا، اس لیے نہیں کہا جاسکتا یہ کس حد تک حقیقی تصنیف ہے اور کس حد تک اس میں مترجم نے ترامیم کی ہیں۔ اس کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ ناقابل یقین قصص ہیں جن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ اس نے چچ نامہ کو بحیثیت تاریخ کے ماخذ کے بڑا کمزور کر دیا ہے''۔166

البیرونی:

البیرونی (۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹ء) مشہور دانشور اور قاموسی عالم، جو فلسفہ، ریاضی، نجوم، جغرافیہ، طب، منطق، دینیات اور مذہب کا ماہر تھا۔ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا اور یہاں کی معاشرت، زبان، ہندوؤں کے فلسفے، ان کے سماجی حالات نیز مذہبی حالات کے بارے میں جو مشاہدے کیے انہیں کتاب الہند میں قلم بند کیا۔167 اس کی کتاب کوئی باضابطہ تاریخ نہیں ہے۔ یہ ایک گہری عمرانی تحقیق ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نادر جوہر تحقیق، جدید سائنسی رویہ اور ہمدردانہ بصیرت ملتی ہے۔168 اسے پہلا عظیم ترین ماہر ہندوستانیات کہنا جائز ہے۔169

حسن نظامی:

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت اور فارسی تاریخ نویسی ایک ساتھ قیام پذیر ہوئیں۔ ۶۰۲ھ میں سلطان قطب الدین ایبک نے اس سرزمین میں ایک خودمختار سلطنت کی بنیاد رکھی اور اسی سال اس کی خواہش پر صدرالدین محمد حسن نظامی نیشاپوری نے اس کے عہد کی تاریخ تاج الماثر لکھنا شروع کی اور اسی کے نام معنون کی۔ یہ تاریخ بلاشبہ براعظیم کی سب سے پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔170

اس میں جزوی طور سے محمد غوری (۱۱۹۱ء) کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التتمش کی تاریخ دی گئی ہے۔ مصنف نے ہر ہر قدم پر اپنے رنگیں اور طولانی انداز میں تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کے ذریعے، نثر اور نظم میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن یہ ثبوت وہ کہیں نہیں دیتا کہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں وہ شریک رہا یا انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔171

سید صباح الدین عبدالرحمٰن، حسن نظامی کے انداز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس میں شک نہیں کہ حسن نظامی نے یہ کتاب لکھ کر ادب و انشاء میں غیر معمولی مہارت و قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ مگر شاید اس زمانے میں مرصع و مسجع انشا پردازی کے لیے ہندوستان کی فضاء سازگار نہ ہوئی تھی۔ اسی لیے حسن نظامی کا طرز مقبول نہ ہوا تھا۔172

تاج المآثر کے انشاء کے تکلف، تصنع اور آورد کے باوجود اس کے تاریخی واقعات میں سقم نہیں پایا جاتا۔ اس کا مولف ہندوستان کا پہلا مورخ ہے جس کی اصل کتاب محفوظ رہی اور اسی کی بدولت قطب الدین ایبک کی زندگی کے حالات بعد کی نسلوں کو معلوم ہوئے ورنہ ہندوستان کے پہلے مسلمان فرمانروا کے بعض اہم کام پر تاریکی کا پردہ پڑا رہتا۔173

صاحب تذکرہ مورخین، تاج المآثر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''حسن نظامی اسلامی سلطنت کی تاریخ ترتیب دینے والا پہلا مورخ ہے۔ اس کے بعد اور بہت سی کتب تاریخ لکھی گئیں لیکن فضیلت اسی کو حاصل ہے۔174

قاضی سدید الدین عوفی:

لقب سدید اور نام محمد تھا۔175 حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اولاد میں سے ہیں جو پیغمبر صلعم، مشہور صحابہ میں سے تھے۔ اسی نسبت سے یہ عوفی کہلائے۔176 جوامع الحکایات میں لکھتے ہیں:

''آوردہ اند کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ جد مولف کتاب بود۔ روزے بخدمت رسول صلعم آمد، و از توانگری خود بنالید۔177

مولف کے دادا قاضی ابو طاہر یحییٰ بن طاہر، ماوراءالنہر کے مشہور علماء اور ائمہ میں گزرے ہیں جبکہ مولف کے ماموں امام مجدالدین محمد اپنے عہد کے سربرآوردہ طبیب اور بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔178 مولف کا وطن بخارا ہے اور بخارا ہی اس کی تعلیم و تربیت کا گہوارہ ہے۔179 بخارا کا تعلیمی دور ختم ہونے پر مولف نے علمی، تعلیمی اور ادبی مذاق کی نشوونما کی خاطر، نیز کسی معقول ذریعہ معاش کی جستجو میں ماوراءالنہر اور خراسان کے مختلف دیار و امصار کا سفر کیا اور ہر سرزمین کے علماء، ائمہ، فضلا، مشائخ اور خاص کر شعراء کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔180 ان مباحثوں کے دوران میں وعظ و تذکیر کا مشغلہ جاری رہا۔ اس مشغلے کے ذریعے سے امراء و سلاطین کی خدمت میں رسائی حاصل ہوئی اور انعام و اکرام ملتا رہا۔181

مغل یلغار کے باعث جب ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقوں سے مظلوم مسلمانوں نے ہجرت اختیار کی، عوفی بھی سلطان ناصرالدین قباچہ والی سندھ و ملتان کے دربار میں چلا آیا۔182 قباچہ کے عہد میں اس نے اپنی پہلی کتاب ''لباب الالباب'' مکمل کر کے قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین الحسین بن شرف الملک رضی الدین ابی بکر الاشعری کے نام نذر کی اور ناصرالدین قباچہ کے حکم سے اپنی دوسری کتاب ''جوامع الحکایات ولوامع الروایات'' کی تالیف و ترتیب بھی شروع کی۔183 وہ اپنی اسی تالیف میں مشغول تھا کہ سلطان شمس الدین التتمش نے سندھ پر لشکرکشی کی۔ ناصرالدین بھکر کے قلعہ میں قلعہ بند ہو گیا۔184 لیکن قلعہ بھکر فتح ہونے کے بعد قباچہ شکست برداشت نہ کر سکا اور دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔185 قباچہ

کے متوسلین التمش سے جا ملے جن میں عوفی بھی تھا۔ اس نے اپنی کتاب جوامع الحکایات کو التمش کے وزیر نظام الملک محمد بن ابی سعد الجنیدی کے نام معنون کر دیا۔186 صباح الدین نے اپنی تالیف بزم رفتہ کی ''سچی کہانیاں'' کے آغاز میں جوامع الحکایات سے بھی کچھ روایات لی ہیں۔187

عوفی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے صباح الدین لکھتے ہیں ''حکایتوں کی رنگارنگی نوقلمونی، سچائی اور رنگینی کی وجہ سے یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی''۔188

قاضی منہاج الدین سراج الجوزجانی: (۱۱۹۳ء۔۱۲۶۰ء)

منہاج سراج پیدائش اور شادی دونوں کے اعتبار سے طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے، بڑے عالم تھے۔189 آپ کے معاصر علماء میں شیخ عبدالحق دہلوی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں ''منہاج سراج اپنے عہد کے ایسے ہمہ دان عالم تھے کہ حضرت نظام الدین اولیاء جیسے عارف کامل ہر دوشنبہ، ان کے وعظ کی محفل میں شریک ہوا کرتے تھے۔190 ان کا معروف تاریخی شاہکار ''طبقات ناصری'' ہے۔ یہ کتاب پاک و ہند کی تاریخ کا ایک نہایت مشہور مرقع ہے۔ تاج المآثر کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تاریخ ہے، جو بزبان فارسی مرتب ہوئی۔ تاج المآثر کی حیثیت اب تک مخطوطے کی ہے اور وہ طبع نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا عملاً طبقات کو پہلی تاریخ قرار دینا چاہیے اگرچہ چچ نامہ اس سے بیشتر ترتیب پا چکا تھا اور اس کا فارسی ترجمہ بھی طبقات سے پہلے ہو چکا تھا لیکن اس کا موضوع صرف سندھ کی تاریخ ہے۔191

طبقات ناصری جو کہ تیئس طبقات پر مشتمل ہے ہئیت کے اعتبار سے عمومی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ منہاج الدین سراج جوجانی نے ۶۵۸ھ میں خاندان غلامان کے سلطان ناصر الدین محمود کے نام سے معنون کی ہے۔ اسلامی ہند کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اس کے خاندان غزنوی، غوری، اور خاندان غلامان سے متعلق حصے نہایت اہم ہیں۔ یہ تاریخ سلطان ناصر الدین محمود دوم کے پندرہویں سال سلطنت ۶۵۸ھ کے حالات و واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔192 اس کا اسلوب نگارش اپنی ہم عصر تاریخ، جہانگشائے جوینی اور

قریب العصر تواریخ مثلاً تاریخ یمینی اور راحۃ الصدور کے برعکس سادہ وسلیس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا پختہ اور استوار ہے۔ اس اعتبار سے وہ ابو الفضل محمد بیہقی مولف تاریخ آل سبکتگین یا تاریخ مسعودی اور ابو سعید عبدالحئی مؤلف زین الاخبار یا تاریخ گردیزی کا پیروکار ہے۔193

ضیاء الدین برنی جس کی عہد سلاطین پر اہم اور مستند تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں منہاج سراج کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنی تاریخ کو وہاں سے شروع کروں جہاں منہاج نے اپنی تاریخ ختم کی ہے، کیونکہ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔194 ہندوستان کی ابتدائی اسلامی عہد کی تاریخ جس بہترین انداز میں منہاج نے مرتب کی یہ اسی کا کمال تھا یوں برعظیم پاک و ہند کے تاریخی ورثے میں منہاج کا کردار بہت اہم ہے۔195

طبقات ناصری کے مترجم مولانا غلام رسول مہر کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں طبقات ناصری بحیثیت مجموعی تاریخ کی اہم کتاب نہیں، بیشتر طبقے ایسے ہیں جن کا تعلق تاریخ ماضی سے ہے اور ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری کتابوں میں موجود ہیں اور زیادہ مستند ہیں۔ مولانا (منہاج السراج) نے جو کچھ لکھا اس میں اختصار و ایجاز پیش نظر رکھا۔ مختلف حصوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں کسی بھی طبقے کے متعلق اتنی واقفیت نہ تھی جو ایک صاحب فن مورخ کو ہونی چاہیے، پھر ان کا اسلوب بیان نہ علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے نہ بیان کی سادگی، سلاست اور روانی اس میں موجود ہے۔ بعض حصے اچھے ہیں اور بعض میں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ علاوہ برین مولانا کو عجائب پسندی سے بہ طور خاص دل بستگی ہے جو واقعہ عجیب ہونے کے اعتبار سے محض افسانہ نظر آئے۔ مولانا اسے بھی یوں بیان کرتے ہیں گویا وہ مستند تاریخی واقعہ ہو۔ طبقات میں ایسے کئی افسانے درج ہیں۔ بہ این ہمہ طبقات ناصری کے بعض حصے بہت بیش بہا ہیں۔ مولانا نے خراسان، غور اور ہندوستان کے متعلق بعض ایسی معلومات فراہم کر دی ہیں جو میرے محدود علم کے مطابق کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں انہی پر طبقات ناصری کی حقیقی اہمیت قائم ہے۔196

اس کے برعکس صباح الدین عبدالرحمٰن طبقات ناصری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''دہلی کے

مملوک سلاطین پر دو ہی معاصر تاریخی تصانیف ہیں ایک تاج المآثر اور دوسری طبقات ناصری۔ تاج المآثر اپنی مسجع اور مقفع عبارت کی وجہ سے زیادہ مقبول عام نہ ہو سکی، اس کے برعکس طبقات ناصری کچھ ایسی سادہ سلیس اور عام فہم عبارت میں لکھی ہوئی ہے کہ پڑھنے والوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ مولف نے تمام واقعات کو حاشیہ آرائی اور رنگ آمیزی کے بغیر سیدھے سادھے طریقے پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے صحیح اور مستند سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے مملوک سلاطین کے عہد کے لیے یہ تاریخ بہت ہی قیمتی و مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے اور ہر دور کے مورخ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔197

امیر خسرو: (۱۲۲۵-۱۲۵۳)

طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد التتمش کے دور میں منصب امارت پر فائز تھے۔ جب کہ والدہ بلبن کے عہد کے اعلیٰ عہدیدار کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے والدین کے بل بوتے پر دہلی کے درباری حلقوں میں بڑا نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ انھوں نے خود دہلی کے چھ سلاطین کے تحت ملازمت کی۔ سلاطین، امراء، فوجی افسران اور صوفی نظام الدین اولیاء سے نزدیکی تعلقات کے باعث انھیں اپنے زمانے کے درست سیاسی تعلقات اور سماجی حالات کا علم حاصل کرنے کا ایک نادر موقع ملا تھا۔198 امیر خسرو بیک وقت بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ گوئی، مثنوی پر یکساں عبور حاصل کیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے موسیقار تھے، جنھوں نے ہندوستانی موسیقی کی ترقی میں ایک تعمیری کردار ادا کیا۔ وہ ایک تجربہ کار سیاسی، تدبر و سیاست سے باخبر ایک درباری اور صوفی منش انسان تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک بلند پایہ مورخ بھی تھے۔199

امیر خسرو کی تاریخ نگاری کا مظہر ان کی پانچ تاریخی مثنویاں ہیں۔ ان میں قران سعدین، مفتاح الفتوح، عشقیہ یا دولرانی خضر خان، نہ سپہر اور تغلق نامہ شعری مثنویاں ہیں جب کہ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی نثری مثنوی ہے۔ قران سعدین کے لفظی معنی دو ستاروں کا ملاپ ہیں۔ یہ سب سے پہلی طویل تاریخی

مثنوی ہے۔ اس کا مرکزی خیال باپ بیٹے یعنی معز الدین کیقباد اور بغرا خان حاکم بنگال کی اودھ کے علاقے میں دریائے سرجو کے کنارے پر تاریخی ملاقات ہے۔ یہ مثنوی اٹھارہ غزلوں اور تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔200

مفتاح الفتوح، امیر خسرو کی دوسری تاریخی مثنوی ہے۔ یہ ۱۲۹۱ء میں لکھی گئی تھی۔ اس میں تاریخی واقعات کو نہایت صحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عشقیہ یا دولرانی خضر خان، امیر خسرو کی ایک اور تاریخی مثنوی ہے۔ خضر خان علاء الدین خلجی کا بڑا لڑکا تھا جو میواڑ کا گورنر رہ چکا تھا۔ اسے گجرات کے راجہ کرن کی لڑکی دولرانی سے عشق ہوگیا تھا، عشق سے شادی ہونے تک کے تمام واقعات مثنوی کی صورت میں قلم بند کرنے کے لیے امیر خسرو کو حکم ملا، لہٰذا خسرو نے یہ مثنوی ۱۳۱۶ء میں مکمل کی۔201 نہ سپہر قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی ۷۱۸ میں تمام ہوئی۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔202 خزائن الفتوح، امیر خسرو کی نثری مثنوی ہے جو عہد علاء الدین کی مختصر مگر نہایت مستند تاریخ ہے۔203 تغلق نامہ، امیر خسرو کی آخری تاریخی مثنوی ہے جس میں انھوں نے تغلق کے تخت نشینی، مبارک شاہ کا قتل اور خسرو خاں کی شکست کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ امیر خسرو کے دواوین نثری تصانیف اور عشقیہ مثنویاں عہد سلاطین کی تاریخی و تہذیبی معلومات کا گنجینہ بے بہا ہیں۔204 یہ مثنویاں ایک چشم دید گواہ کا بیان ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تاریخی مآخذ شمار ہوتی ہیں۔ اسلوب بیان میں صراحت و وضاحت کا پہلو نمایاں ہے۔ شاعرانہ مبالغ اور ایہام و ابہام سے کام نہیں لیا گیا۔205

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص خیال رکھا ہے کہ روز مرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ اس کا بڑا گر یہی ہے۔ امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔206

ڈاکٹر حسین احق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں''امیر خسرو کی تاریخی تصانیف میں واقعات کی جس وہ تفصیلات مل جاتی ہیں جو کہیں اور موجود نہیں، اس کے علاوہ انھوں نے ضروریات شعری کے باوجود تاریخی واقعات کی صحت کا اس قدر التزام کیا ہے کہ اکثر اوقات ان کے بیانات کو مورخوں نے دوسری ہم عصر شہادتوں پر ترجیح دی ہے۔ علمی و ادبی کارناموں کی بدولت امیر خسرو نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ 207

ابن بطوطہ: (۱۳۰۴۔۱۳۷۷)

ابن بطوطہ مراکش کا عرب مسلمان تھا۔ اصل نام محمد عبداللہ تھا۔ یہ پہلا عرب سیاح تھا جس نے ہندوستان کا سفر کیا اور براعظم افریقہ، ایشیا اور یورپ کے کچھ حصوں کو بھی دیکھا۔208 ابن بطوطہ کا مرتب کردہ سفرنامہ محض ایک تقویم البلدان اور ملکوں کا جغرافیہ اور وہاں کے شہروں، پہاڑوں اور دریاؤں کا بیان ہی نہیں بلکہ اس دور کے مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کی ایک مفید، دلچسپ اور عبرت انگیز دستاویز بھی ہے۔ 209

ابن بطوطہ ۱۳۳۳ء میں محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں ہندوستان پہنچا اور اپنے علم وفضل میں کمال کے باعث قضاۃ کے منصب پر فائز ہوا۔ آٹھ برس تک اپنے فرائض ادا کیے جب کہ ہندوستان میں اس کے قیام کی مدت چودہ سال ہے۔ اس دوران ہندوستان سے متعلق اس نے قیمتی معلومات حاصل کیں اور ان کو اپنے سفرنامے میں نقل کیا۔ اگرچہ اس سفرنامے میں دیگر ممالک کے حالات بھی درج ہیں لیکن ایک بڑا حصہ ہندوستان سے متعلق ہے۔ اس نے غیر جانبدارانہ طور پر ہندوستان کے جغرافیائی، سماجی، معاشی، انتظامی، اور تہذیبی حالات بہ چشم خود مشاہدہ کر کے بیان کیا ہے۔ اپنے سفرنامے کی خصوصیات کے باعث ابن بطوطہ کا شمار بھی عہد سلاطین کے تاریخ نگاروں میں ہوتا ہے۔ 210

ضیاء الدین برنی: (۱۲۸۵ء۔۱۳۵۷ء)

ضیاء الدین برنی کی تصنیف تاریخ فیروز شاہی کو تاریخی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ بلبن کے عہد سے جو ۱۲۶۶ء سے شروع ہوتا ہے، سلاطن فیروز شاہی کے ابتدائی دور میں ۱۳۵۸ء تک یعنی بانوے سال کی مدت کے لیے وہ صرف ہم عصر ہی نہیں بلکہ انتہائی مستند اور قابل اعتبار ذریعہ معلومات ہے۔ قرون وسطیٰ نیز دور جدید کے مورخین نے بلا استثنیٰ اس کو درجہ اول کا ماخذ قرار دیا ہے اور اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔211

برنی کی تصنیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی اس نے فلسفہ تاریخ پر کسی حد تک غور وفکر کر کے اس فن کی خوبیوں کو نہ صرف اپنے انداز میں اجاگر کیا ہے بلکہ تاریخ کے فوائد کے پیش نظر مورخ کو بھی چند خصوصیات کا پابند کیا ہے۔212 برنی علم حدیث اور علم تاریخ کو جڑواں سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ روایات کو اکٹھا کرنے والا کوئی عالم اس وقت تک اچھا عالم نہیں بن سکتا، جب تک اسے تاریخ پر پوری دسترس حاصل نہ ہو۔213

یحییٰ احمد سرہندی، برنی کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ''برنی نے یہ تاریخ منہاج سراج کی طبقات ناصری (۶۵۸) کے ٹھیک ایک سو سال بعد، عہدِ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲۔۷۹۰ھ) میں تالیف کی، ایک اعتبار سے یہ طبقات ناصری ہی کا ضمیمہ ہے۔ کیونکہ جہاں پر وہ (عہد ناصر الدین محمود دوم ۶۵۸ھ) پر ختم ہوتی ہے تقریباً وہیں سے (عہد غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ) یہ شروع ہوتی ہے۔ اس تاریخ میں غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی سے لے کر خاندان تغلق تک کے سلطان فیروز شاہ تغلق کے ساتویں سال جلوس تک کے واقعات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ بظاہر یہ صد سالہ تاریخ جو درحقیقت پچانوے سال دور پر مشتمل ہے عہد غلاماں کے اواخر (۶۵۸۔۶۸۹ھ) پورے خلجی عہد (۶۸۹۔۷۲۰ھ) اور تغلق عہد کے (۷۲۰۔۷۵۸ھ) کی نہایت مستند تاریخی کتاب ہے۔ اس کا اسلوب تحریر عام طور پر طبقات ناصری کی طرح سادہ وسلیس اور کہیں کہیں تاج المآثر اور خزائن الفتوح کی طرح پر تکلف اور پر تصنع ہے''۔214

اکبر شاہ خان نجیب آبادی برنی کی تاریخ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ میں اکثر ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھتا ہے اور تاریخی واقعات کو بقید سن و سال بیان کرتا ہے۔ لیکن محمد تغلق کے حالات میں یہ چیز بالکل غائب ہوجاتی ہے۔ وہ محمد تغلق کے چھوٹے سے چھوٹے عیب کا ذکر کیے بغیر نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے عیبوں کو تلاش کرتے وقت، اور اس کی برائیوں کو بیان کرنے میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسحور کن الفاظ اور موثر لہجہ اختیار کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ واقعات اور حوادث کی ترتیب زمانی کو بگاڑ کر اس طرح مرتب کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا خوامخواہ اس سلطان سے متنفر ہو جاتا ہے''۔215

عبدالقدوس ہاشمی محمد تغلق کے خلاف برنی کے اس بغض کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' آخر عمر میں سلطان محمد تغلق نے مصنف کی زمین ضبط کرلی تھیں۔ اسی لیے برنی، محمد شاہ تغلق کی عیب جوئی میں کو دقیقہ اٹھانہیں رکھتا، ساری کتاب میں ہر جگہ محمد شاہ پر تعریف و توصیف کے پردے میں کچھ نہ کچھ چوٹ کر جاتا ہے''۔216 لیکن اکبر شاہ خان، برنی کے بارے میں تنقیدی رائے رکھنے کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ'' برنی بہت معتبر مورخ مانا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نویسی کے معاملے میں اس کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے، بڑی احتیاط، اور کامل تحقیقات کے بعد لکھا ہے، جس کے لیے اس کی تاریخ خود شاہد عدل ہے لیکن محمد تغلق کے متعلق اس کی تاریخ کا جو حصہ ہے وہ تاریخ کے باقی حصص سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔217

حقیقت یہ ہے کہ'' تاریخ نگاری کے بارے میں ضیاء الدین برنی کا ایک خاص مسلک ہے۔ اس کا نظریۂ تاریخ محدود اور ناصحانہ سہی لیکن اسے فنِ تاریخ نویسی کی ذمہ داریوں کا احساس ضرور تھا۔ اس نے تاریخ کو تاریخی فن پارے کا درجہ دے دیا ہے۔218

مس سراج عفیف: (۷۵۱ھ۔ ۸۱۶ھ)

اس تاریخ کو برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور ایک گمنام مصنف کی سیرت فیروز شاہی (فیروز شاہی تغلق کے ابتدائی بیس سالوں پر مشتمل تاریخ ہے) کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ جب کہ شمس سراج کی تاریخ، حیات فیروز شاہی کے مہد سے لے کر لحد تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب عفیف نے حملۂ تیمور (۸۰۱ھ) کے لگ بھگ تالیف کی تھی۔ مصنف کا تاریخی واقعات بیان کرنے کا انداز افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے اور سبک نگارش نہ بہت سادہ ہے اور نہ بہت پر تکلف بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔219

عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (پندرہویں صدی میں لکھی گئی) ایک بڑی تاریخی کتاب کا حصہ تھی جس میں تین تغلق فرمانرواؤں، غیاث الدین بلبن (۱۳۲۰ء۔ ۱۳۲۵ء)، محمد تغلق (۱۳۲۵ء۔ ۱۳۵۱ء) اور فیروز تغلق (۱۳۵۱ء۔ ۱۳۸۸ء) کے مناقب اور تیمور کے ہاتھوں دلی کی تباہی کا ذکر تھا۔ وہ سوانح عمری کی ایک مثال تھی۔ چونکہ مناقب کی اصطلاح سلاطین کے لیے نہیں بلکہ بزرگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اس لیے اس کتاب میں ایک زیریں قسم کی تصوفانہ موج تھی۔ عفیف نے اسناد کی مدد سے لکھا اور قابل اعتماد واقعہ گو اشخاص کی شہادتیں قبول کرلیں، لیکن اس نے نزاعی معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے ثبوت اور شہادتیں دلیل کے طور پر پیش نہیں کیے۔220 پھر بھی انھوں نے فیروز شاہ کے بارے میں واقعات کی تحقیق، ترتیب اور پیش کش میں بڑی قابلیت اور معقولیت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ اس کی تصنیف کا مرکزی کردار فیروز شاہ ہے۔221 عفیف نے اپنی کتاب کا آغاز حمد باری تعالی سے کرنے کے بعد حدیث کے ذریعے سلطان کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔222

اس نے سلطان وقت کو مثالی حکمران بننے کے لیے دس خصوصیات کا حامل بننے پر زور دیا ہے۔ (باعث طوالت ان خصوصیات کو بیان نہیں کیا گیا ہے) وہ کہتا ہے "بندہ ضعیف یعنی شمس سراج عفیف جو تاجداران عالم کی تاریخ کا مورخ ہے اپنی فہم کے دفینۂ گنجینہ اور اپنے وہم کے سفینے سے چند گوہر آبدار پیش کرتا ہے اور ان آبدار گوہروں کو جو مقامات سلاطین و مشائخ ہے مثل و تمثیل کے طور پر شرح کرتا ہے"۔223

یحییٰ بن احمد سرہندی: (م ۸۳۸ھ)

یحییٰ بن احمد سرہندی کی واحد تصنیف تاریخ مبارک شاہی ہے۔ یحییٰ خاندان سادات کا مورخ تھا، جس کے بارے میں تاریخ میں کوئی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ خود یحییٰ نے بھی اپنی تصنیف میں اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ تاہم سرہندی نے چونکہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے کے واقعات اپنی مسموعات اور مشہودات کی بناء پر لکھنے کا دعویٰ کیا ہے اس لیے اس کی تاریخ کو فیروز شاہی عہد کا ایک نہایت مستند معاصر ماخذ سمجھا جاسکتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات (۷۹۰ھ) تک کے حالات تو عفیف کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد اس کے جانشینوں تغلق شاہ، فیروز شاہ تغلق دوم، ابوبکر شاہ تغلق، محمد شاہ تغلق دوم، علاء الدین سکندر تغلق اور محمد تغلق کے حالات تاریخ مبارک شاہی کے علاوہ برعظیم کی کسی اور معاصر تاریخ سے معلوم نہیں ہوسکتے اس لیے یہ تاریخ تغلقوں کے دور انحطاط (۷۹۰۔۸۱۷ھ) کا منفرد معاصر ماخذ ہے۔224

سرہندی نے اپنی تالیف کو خاندان سادات کے مشہور فرمانروا معز الدین ابوالفتح مبارک شاہ بن سید خضر خان (۸۲۴۔۸۳۷ھ) کے نام نامی سے معنون کیا ہے۔ سرہندی نے اپنے اسی شاہکار کے ذریعے فیروز شاہ تغلق اور اس کے جانشینوں کو بالعموم اور خاندان سادات کے ابتدائی سلاطین کو حیات نو بخش کر خود کو بھی زندہ جاوید کر دیا ہے۔ کتاب کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری کے حالات و واقعات سے کیا گیا ہے۔ جب کہ خاتمہ سید محمد شاہ بن فرید خان کے ابتدائی دو سالوں کے جائزے پر ہوا ہے۔ خاندان سادات (۸۱۷۔۸۵۵ھ) جو کہ خاندان تغلق کے زوال اور خاندان لودھی (۸۵۵۔۹۳۲ھ) کے عروج کے درمیانی عرصہ میں برسر اقتدار آیا اس نے اڑتیس سال برعظیم پر حکومت کی۔225

ایس ایم جعفر لکھتے ہیں ''تاریخ مبارک شاہی خاندان سادات کے واحد ہم عصر مورخ یحییٰ ابن احمد سرہندی کی، یہ حد درجہ مستند، اہم اور قابل قدر تصنیف ہے جو اس نے سید مبارک شاہ کے نام سے منسوب کی ہے''۔226

جگدیش نرائن کے مطابق یحییٰ بن احمد سرہندی نے منہاج، برنی اور امیر خسرو جیسے سابقہ مصنفین سے ۱۳۵۱ء تک کے واقعات مستعار لیے ہیں۔ لیکن وہ محض ایک نقل نگار نہ تھا۔ انتخاب حقائق کے بارے میں اس نے اپنے اصول وضع کیے تھے جیسے سلطانوں، امیروں اور سپاہیوں کے کام بہ اعتبار ادوار حکومت اور تاریخ وار ترتیب یعنی تخت نشینی تقررات، جنگیں اور فوجی حرکات، بغاوتیں وغیرہ تحریر کرنا۔ درحقیقت یہ کتاب ایک علاقائی روزنامچہ تھی اور وہ افعال میں روزنامچے قلمبند کرتا تھا۔ تاریخ نویسی کی بابت اس کا طرز نظر گو بے قاعدہ اور بے پرواہ انداز کا تھا پھر بھی وہ تاریخ کی ترجمانی روحانی انداز میں کرتا ہے۔227

عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی

شاہان تیمور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ مغل دور کے ہندوستان میں تاریخ نویسی کا آغاز امیر تیمور (۱۳۳۶ء۔ ۱۴۰۵ء) سے ہوا تھا۔ ملفوظات تیموری یا تزک تیموری، تیمور کی خودنوشت سوانح عمری تھی جو چغتائی زبان میں لکھی گئی تھی جس میں اس کی زندگی کے اکتالیس برس کا ذکر تھا۔228 تیمور نے اپنی خودنوشت میں ہندوستان پر حملے کا محرک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہندوستان پر حملہ کرنے میں میرا مقصد اعظم کافر ہندوؤں کے خلاف مذہبی جنگ لڑنا تھا۔229 تیمور کے وارث فتوحات ملکی میں تو اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچے لیکن علم کی محبت اور تہذیب و ثقافت کی سرپرستی میں اس سے بہت بڑھ گئے۔ تیمور کا بیٹا شاہ رخ خود شاعر اور عالم تھا۔ مرزایان تیمور میں سے جس حکمران نے علم وفن کی سرپرستی کو کمال تک پہنچایا وہ تیمور کے ایک اور بیٹے عمر شیخ کا پڑپوتا سلطان حسین مرزا تھا جو حاکم خراسان تھا۔230 کیونکہ تیمور نے ہندوستان پر اپنی باقاعدہ حکومت قائم نہ کی تھی لہٰذا مغلیہ دور کی تاریخ نویسی میں ان تاریخ نگاروں کا جائزہ لیا جائے گا جنھوں نے سرزمین ہند میں رہتے ہوئے یہاں کی تاریخ کو قلمبند کیا۔ ان میں شاہان مغل بھی تھے اور ان کے دربار سے وابستہ افراد بھی۔ ان کے علاوہ وہ افراد جنھوں نے درباری زندگی سے باہر رہتے ہوئے تاریخ نویسی کی خدمات انجام دیں۔ مغلیہ عہد کی تاریخ نویسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ

شاہان مغل نے علم تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر بقلم خود تاریخ نگاری کی ابتدا کی ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر: (۱۵۶۲ء۔۱۵۳۰ء)

ہندوستان میں مغل حکومت کا بانی اور تیمور و چنگیز خان کا جانشین بابر جو امور جہانگیری اور جہانداری میں طاق اور ایسا کامیاب حکمران جس نے ایسے اصول پر ہندوستان پر حکومت کی بنیاد رکھی، جس پر ایک مضبوط سلطنت قائم ہوئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ بابر سے پہلے ہندوستان پر حملہ آور تاجداروں میں دارا اول، سکندر مقدونی، ڈیمی گروس، اپالوڈوئس، مینانڈر، کاڈنیسی، کشان بادشاہ کنشک، محمود غزنوی اور محمد غوری نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو تاریخ نے عظمت کا تاج پہنایا ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے کوئی بادشاہ بھی ایسا نہیں ہے جس نے ہندوستان میں اپنی عظمت کا چراغ جلانے سے پہلے وہ مصائب اٹھائے ہوں جو ظہیر الدین بابر کو اٹھانے پڑے تھے۔ بابر اپنے پیشرو بادشاہوں سے اس اعتبار سے حد درجے منفرد ہے کہ وہ کسی قسم کے سہارے کے بغیر آپ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا۔231

بابر کی یہ خصوصیت بھی اسے تمام دنیا کے بادشاہوں میں امتیاز بخشتی ہے کہ وہ اونچے درجہ کا تاجدار ہونے کے باوجود ایک بہت اونچا مصنف اور کہنہ مشق شاعر تھا۔ اس کی تزک جو بعض علماء کے خیال میں تمام سابقہ بادشاہوں کی خودنوشت سوانح حیات میں اپنی مثال آپ ہے سادگی تحریر کے اعتبار سے ایک یگانہ روزگار تصنیف ہے اور یہی وہ تصنیف ہے جس کی بناء پر بابر ایک عظیم تاریخ نگار قرار پایا ہے۔ بابر نے یہ خود نوشت ترکی زبان میں تالیف کی ہے۔232

پشپا سوری نے بابر کی تاریخ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''بابر نے کبھی مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا پھر بھی نہ صرف مورخ ماننے کے لیے اس کی تزک خاصہ بڑا ثبوت سمجھی گئی جیسا کہ لین پول کہتا ہے بلکہ بعد کے سارے مورخین خواہ وہ ہم عصر ہوں یا جدید ہوں بابر نامہ سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ جیسے بحیثیت ماخذ وہ ناگزیر ہو۔ بابر کی تزک میں جو کمی نظر آتی ہے ان پر مرزا حیدر دغلت کی تاریخ رشیدی اور

گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔233

بابر کو اپنے شاہانہ ورثے پر فخر تھا، اس کی آرزو تھی کہ وہ تیمور کی طرح فوجی کارنامے انجام دے اور ایک تزک تالیف کرے۔ اگر ایک طرف وہ یہ چاہتا تھا کہ واقعی وہ بادشاہ بنے تو دوسری طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ ہر کام جو وہ انجام دے تحریری شکل میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے تیموری شہزادوں سے عام طور پر یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور قلم دونوں کو یکساں مہارت کے ساتھ استعمال کریں گے اور ان سب کو ایک ہی معیار سے ناپا بھی جاتا تھا۔234

تزک بابری فن تاریخ نویسی کا ایسا شاہکار ہے کہ سوانح عمری ہونے کے باوجود اس میں علم جغرافیہ اور علم ریاضی کو جس خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ وسط ایشیا، ایران، ترکی اور کابل کے مکمل تاریخی و جغرافیائی حالات کا بہترین ماخذ ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں ''بابر ایک ایسا مبصر تھا جس کے قلم نے تلوار سے بھی گہرا نقش جریدہ روزگار پر کھینچ دیا ہے۔ سیزر سے لے کر نپولین تک بہت سے بادشاہ اور کشور کشا اپنے احوال و واقعات تحریر کر گئے ہیں مگر بیان کی یہ خوبی اور دل کشی خودنوشت میں مشکل سے ملے گی جو تزک بابری کی وصف ہے''۔235

تزک بابری کی تاریخی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی و نثری اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بابر کی قوت مشاہدہ اور اس کی قدرت تجزیہ وتخلیل کا ثبوت اس کے ان بیانات اور عبارتوں سے ملتا ہے جس میں اس نے فنی آثار یا کسی جگہ کے جانوروں، پھولوں اور نباتات کے متعلق یا قوموں کی جماعتی نفسیات یا بعض افراد کے کردار کے متعلق اظہار کیا ہے۔ تزک بابری بطور ادبی کتاب کے اس کی زبان سادہ اور پاکیزہ ہے اس کا قدرتی اسلوب بیان، منظر کشی اور دل آویز تحریر ایسی وجوہ ہیں جن کی بناء پر ہم تزک بابری کو نہ صرف چغتائی نثر کا ایک نفیس ترین شاہکار سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔236

تزک بابری کی تاریخی و ادبی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صباح الدین لکھتے ہیں ''یہ کتاب بابر نے اپنی مادری زبان ترکی میں لکھی تھی۔ گو ترکی اس زمانے میں اعلیٰ قسم کی علمی زبان نہیں رہی لیکن بابر نے

اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت سے اس زبان میں بھی ایسا سلیس، لطیف اور شگفتہ طرز بیان اختیار کیا کہ اس کی کتاب ارباب علم وفن کے لیے جاذب توجہ بن گئی اور اس کے ترجمے میں پڑھنے والے کو وہی لذت محسوس ہوتی ہے جو ترکی زبان جاننے والوں کو اصل کتاب میں ملتی ہوگی'' ۔237

ایس ایم اکرام لکھتے ہیں بابر فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی لکھی ہوئی تزک بابری اپنی قسم کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے۔ اس میں لفاظی نہیں خلوص ہے اور سنی سنائی باتیں نہیں، آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے۔ مناظر فطرت، درختوں اور پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی اس کا تفصیلی اظہار ہے اور ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑے پتے کی اور پر مغز باتیں درج ہیں۔ تزک بابری کی تصنیف کے علاوہ بابر خط بابری کا بھی موجد تھا۔

شہزادی گلبدن بیگم: (۱۵۲۳ء۔۱۶۰۳ء)

اور اس طرزِ تحریر میں اس نے کلام پاک کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھجوائے ۔238 ہندوستان میں وسط ایشیائی حکمرانوں کے قیام کے ساتھ ہی تاریخ نگاری کا آغاز ہوگیا تھا۔ عہد سلاطین سے لے کر عہد مغلیہ تک متعدد تاریخی کتب تصنیف و تالیف کی گئیں جن میں دربار کی سرپرستی اور عدم سرپرستی دونوں صورتوں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ عہد مغلیہ کے نمایاں تاریخ نگاروں میں نمایاں نام بابر، ابوالفضل، بدایونی، جہانگیر، عبدالحمید لاہوری اور خوافی خان کے ہیں۔ یہ تمام افراد صنف قوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عہد کو اپنے پیشرو عہد کے مقابلے میں ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ اس میں ایک خاتون شہزادی گلبدن بیگم نے بھی تاریخ نویسی کے میدان میں اپنے آپ کو منوایا۔

شہزادی گلبدن، شہنشاہ بابر کی بیٹی اور شہنشاہ ہمایوں کی بہن تھی۔ جس کی تاریخی تصنیف ''ہمایوں نامہ'' ہے۔ کتاب کی ابتدا میں شہزادی لکھتی ہیں ''اکبر بادشاہ کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا کہ فردوس

مکانی (بابر بادشاہ) اور حضرت جنت آشیانی (ہمایوں بادشاہ) کے بارے میں جھے جو کچھ معلوم ہے اسے تحریر میں لے آؤں۔ حضرت فردوس مکانی جب اس دنیا سے رخصت ہو کر دارالبقا کو سدھارے تو یہ حقیر صرف آٹھ سال کی تھی، اس لیے مجھے اس وقت کی باتیں اچھی طرح یاد نہیں تاہم شاہی فرمان کی تعمیل میں، میرے حافظے کو جو کچھ یاد ہے یا میں نے سنا ہے اسے ضبط تحریر میں لا رہی ہوں۔ اس کتاب کے پہلے جزو میں جو کچھ واقعات اپنے والد بزرگوار کے تحریر کر رہی ہوں، جو وہ خود اپنی سوانح حیات میں درج کر چکے ہیں"۔239

گوگلبدن بیگم کی یہ تصنیف، اس کے باپ بابر کی تزک جتنی اہمیت تو نہیں رکھتی لیکن علمائے تاریخ کے نزدیک اس کی افادیت مسلم ہے۔ یہ کتاب آپ اپنی گواہ ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، ہمایوں نامہ کوئی ادبی کارنامہ نہیں ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے جو کچھ سنا یا دیکھا بڑی سادگی سے قلمبند کیا تا کہ اکبر نامہ کا مصنف اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ ہمایوں نامہ، ہمایوں کی سوانح کے ساتھ اس دور کی سماجی و ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بن گیا۔ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کی تنہا تصنیف نہیں ہے اس کے علاوہ زمانے کے دستور کے مطابق نظمیں بھی لکھتی تھیں۔ میر مہدی شیرازی نے اپنی تصنیف "تذکرۃ الخوانین" میں گلبدن بیگم کے دو مصرعے بھی نقل کیے ہیں۔240

گلبدن بیگم کو فارسی اور ترکی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس نے ہمایوں نامہ میں فارسی زبان کو اس انداز میں استعمال کیا ہے کہ بہت بڑے انشا پرداز بھی یہ کام نہ کر سکے۔ اس کے انداز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں "اگرچہ واقعہ نگاری کا فارسی زبان میں بہترین نمونہ تزک جہانگیری اور واقعات عالمگیری ہیں، ان کی انشا پردازی کی مثال یہ ہے کہ ظہوری اور نعمت خان کا ہزاروں کلام بھی اس انداز کا مقابلہ نہ کر سکا جو ان کتابوں میں اپنایا گیا ہے لیکن ہمایوں نامہ ان سے بھی آگے ہے"۔241

سید صباح الدین عبدالرحمٰن گلبدن بیگم کی تحریر کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "گلبدن بیگم اپنی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کی قابل قدر انشا پرداز اور شاعر ہوئی۔ فارسی زبان میں اس کی ایک مستقل تصنیف ہمایوں نامہ ہے جو اپنے طرز انشاء کے لیے ایک بے مثال کتاب اور بابر و

ہمایوں کے عہد کے تمدنی، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لیے ایک قیمتی ماخذ ہے''۔242

جگدیش نرائن لکھتے ہیں گلبدن بیگم ہمایوں کی فتوحات، شکستوں، دشواریوں اور مصائب و آلام جو بادشاہ کو پیش آئے وہ ان تمام واقعات کی عینی شاہد تھیں۔ جہاں وہ ذاتی مشاہدے پورے نہ کر سکیں وہاں اسے حرم کی دوسری خواتین پر بھروسہ کرنا پڑا جیسے خانزادہ، ماہم بیگم اور حمیدہ بانو بیگم پر جن کی وہ عزت کرتی تھی اور جن کا اعتماد اسے حاصل تھا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر مغلوں کے سماجی اور مذہبی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالتا ہے اور فوجی تفصیلات پر کم۔243

جوہر آفتابچی: (م ۱۵۵۶ء)

جوہر، ہمایوں کا آفتابچی (یا آبدار) تھا۔ اور خلوت و جلوت میں برابر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے ہیبت پور کا محاصل اور پھر سرکار پنجاب و ملتان کا خزانچی بھی مقرر ہوا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۹۵ھ میں ''تذکرۃ الواقعات'' لکھنی شروع کی جس سے ہمایوں کے عہد کے بعض سیاسی حالات سے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس کی عبارت تصنع اور تکلف سے پاک ہے اس لیے یہ ایک اہم تاریخی لٹریچر سمجھا جاتا ہے۔244

جگدیش نرائن جوہر کے بارے میں لکھتے ہیں، جوہر ہمایوں کا آفتابچی ہونے کے باعث پچیس سال سے زیادہ ہمایوں کا خدمت گار رہا لہٰذا وہ ایک ہم عصر مورخ تھا۔ کتاب کا مقصد ہمایوں کی زندگی و ترقی کا ایک حقیقی اور واقعی بیان پیش کرنا ہے۔ ایک معمولی ملازم ہونے کے باعث جوہر کوئی صاحب علم شخص نہ تھا۔ اس کی کتاب علم و فضل سے خالی اور سادہ انداز میں لکھی گئی ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ایسے شخص نے لکھا ہے جو عینی شاہد اور معتبر شخص تھا۔245

ڈاکٹر معین الحق تذکرۃ الواقعات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جوہر نے اپنی تصنیف ہمایوں کی رحلت کے بعد شروع کی۔ لیکن وہ چشم دید واقعات لکھتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

واقعات کے نوٹس محفوظ رکھے ہوں گے۔ ان حالات میں تذکرۃ الواقعات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسے بجا طور پر ہمایوں کی ہم عصر تالیف کہا جاسکتا ہے''۔246

خواندامیر: (م ۱۵۳۵ء)

خواندامیر ہرات میں پیدا ہوا جو اس وقت علوم وفنون کا گہوارہ تھا۔ ابتداء میں یہ سلطان ہرات کے دربار سے منسلک ہوا۔ درباری زندگی میں اس نے فن تاریخ نویسی کا گہرا مطالعہ کیا، مطالعہ نے اس کی علمی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ اس نے اپنی پہلی کتاب مآثر ملوک لکھی۔ اس کی دیگر تصانیف خلاصۃ الاخبار فی بیان احوال الاحبار، مکارم اخلاق، دستور الوزراء، اخبار الاخیار، جواہر الاخبار اور غرائب الاسرار ہیں، جب کہ شاہ اسماعیل صفوی کے وزیر کریم الدین حبیب کی سرپرستی میں اس نے حبیب السیر فی الاخبار افراد البشر تین جلدوں میں لکھی۔247

میر خواند کے لیے جب ہرات کے حالات خراب ہوئے تو وہ قندھار چلا گیا اور وہاں سے بابر کے عہد میں آگرہ آگیا۔ بابر اس کی علمی شہرت سے آگاہ ہو چکا تھا، لہٰذا اسے اپنا ندیم خاص بنایا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے بھی اس سے وہی عقیدت قائم رکھی۔ تاریخ عالم پر اس کو جو قدرت حاصل تھی اس کے باعث ہمایوں نے اسے ''امیر مؤرخ'' کا خطاب دیا۔ خواند امیر نے بھی مختلف قصائد اور مثنویوں کے ذریعے ہمایوں سے محبت کا اظہار کیا، ہمایوں کی فرمائش پر اس نے ''قانون ہمایونی'' لکھی جس میں ہمایوں کی مبدعات اور اختراعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ہمایوں کے عہد کے تمدن اور مضوعات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔ اس کے کچھ حصے ابوالفضل نے اپنے اکبر نامے میں بھی نقل کیے ہیں۔248

مرزا حیدر دغلت: (۱۵۰۰ء۔۱۵۵۱ء)

ابتدائی مغلیہ دور کی ایک اور اہم تصنیف ''تاریخ رشیدی'' ہے جس کا مصنف مرزا حیدر دغلت ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ امیر کاشغر کا بیٹا اور بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔249 اس کے باپ کے قتل کے بعد بابر نے اس کے ساتھ پدرانہ شفقت اور نگرانی کا برتاؤ کیا۔ یہ ہمایوں کا جانثار تھا۔ بہادر اور جری ہونے کے علاوہ مرزا حیدر ادبی صلاحیتوں اور تیز قوت مشاہدہ کا مالک بھی تھا۔ اس نے جو دیکھا اور چھان بین کے بعد جو کچھ سنا اسے تحریر کر دیا۔250 ارسکاٹن کے مطابق ''تاریخ رشیدی'' ایک صاحب ہنر اور صاحب علم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اور بعد کے دو حصے ایک ایسے ہم عصر کے ہیں جو بیان کیے جانے والے واقعات اور افراد سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ مغل خانوں اور امرائے کاشغر کے واسطے یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔251 مصنف، شیر شاہ اور ہمایوں بادشاہ کی لڑائیوں میں موجود تھا اس لیے اس کے چشم دید حالات قابلِ وقعت ہیں۔ اس تاریخ کو اگر توزک بابری کے ساتھ پڑھا جائے گا ملکوں کے حالات کا پورا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔252

سلطنت مغلیہ میں شہنشاہ اکبر کا عہد کئی حوالوں سے روشن اور نمایاں ہے۔ اس عہد میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوئیں۔ انتظامی اعتبار سے بھی اکبر نے ایک بہترین منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ اگر اکبر کے عہد کی مذہبی صورت حال سے صرف نظر کرتے ہوئے اس عہد کی ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ عہد مغلیہ سلطنت کا دور طلائی ہے۔ اس عہد میں تاریخ نویسی پر سب سے زیادہ کام ہوا اور تاریخ نگاروں یا مورخین نے ہر پہلو سے اس دور کا جائزہ لے کر انتہائی تفصیل کے ساتھ اکبر کے پچاس سالہ عہد کی تنقیح کی ہے۔

اکبر بادشاہ خود تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے عہد میں علم تاریخ اور وقائع نگاری میں خاص کام ہوئے۔ عہد اکبری کے مورخین میں مندرجہ ذیل خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

i۔ ابوالفضل علامی: اکبر نامہ، آئین اکبری، انشائے ابوالفضل

ii۔ ملا عبدالقادر بدایونی: منتخب التوارخ

iii۔ محمد عارف قندھاری: تاریخ اکبری

iv۔ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی: اکبر نامہ

v۔ شیخ عبدالحق دہلوی: ذکر ملوک (تاریخ حقی)

vi۔ ملا احمد (صدر مجلس) تاریخ الفی

vii۔ خواجہ نظام الدین احمد بخشی: طبقات اکبر253

ان میں سے دستیاب کتب، منتخب التوارخ، آئین اکبری، اکبر نامہ اور طبقات اکبری اور ان کے مصنفین کا ایک مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

ملا عبدالقادر بدایونی: (م ۱۶۱۵ء)

اکبری عہد کے معروف تاریخ نگار عبدالقادر بدایونی جن کی تصنیف کردہ منتخب التوارخ عہد اکبری کا ابتدائی اور مستند تاریخی ماخذ ہے۔ ملام عبدالقادر ۱۵۴۰ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا۔254 اپنے والد کے بارے میں ملا عبدالقادر منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں ''وہ بحر علم، معدن احسان اور کان فضل تھے''۔255 شیخ ملوک شاہ سنبھل کے صوفی بیچو کے شاگرد تھے۔ خود بدایونی نے پہلے شیخ حاتم سنبھلی سے اور پھر فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ شیخ مبارک سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس زمانے کے نہایت معروف اور دیندار لوگوں کے ماتحت بہت سے علوم کا مطالعہ کرنے کے بعد بدایونی بڑا عالم فاضل شخص بن گیا اور موسیقی، تاریخ اور نجوم کا ماہر ہوگیا۔ اسے بچپن سے تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۵۷۳ء میں یہ اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا اور اسے درباری امام مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ہزار بیگھا زمین کی مدد معاش دی۔256

اکبر نے عبدالقادر بدایونی کی علمی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سنسکرت اور دوسری زبانوں

کے تراجم کرائے جن میں "مہا بھارت" جو اٹھارہ حصوں پر مشتمل کتاب تھی۔ اس کے دو حصوں کا ترجمہ عبدالقادر نے نقیب خان اور ایک نومسلم برہمن کی مدد سے تین چار ماہ کے عرصہ میں کیا۔ اس کے بعد چار سال کی محنت شاقہ کے بعد ''رامائن'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔257

تراجم کتب کے علاوہ عبدالقادر بدایونی کی اہم تصنیف ''منتخب التواریخ'' ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں محمود غزنوی سے لے کر شہنشاہ اکبر کے عہد کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ اپنی کتاب کا سبب تالیف بتاتے ہوئے بدایونی لکھتا ہے ''بنی نوع انسان کے اس دعا گو عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے ۹۹۹ھ کے اوائل میں حضرت خلیفۃ زمان ظل الٰہی اکبر بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی۔ مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم تاریخ سے انسیت رہی ہے اسی لیے اس عرصہ میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں رہا۔ خواہ اپنی رغبت سے تھا یا کسی کے حکم کی تعمیل میں، چنانچہ بارہا میرے دل میں آیا کہ دارالسلطنت دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ لکھا جائے یعنی ابتدائے عالم سے لے کر اس زمان تحریر تک مختصراً لکھا جائے تاکہ ہر بادشاہ کے احوال کی وہ ایک ایسی اجمالی یادداشت ہو جو احباب کے لیے تذکرہ کا کام دے اور ارباب بصیرت کی نظر میں اسے تبصرہ کی حیثیت حاصل ہو''۔258 آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں نے مناسب سمجھا کہ ہندوستان کے صاحب استقلال سلاطین کے حالات قلمبند کروں چنانچہ تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو میں نے پیش نظر رکھا، کچھ مواد ان سے اخذ کیا اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ میری اس تصنیف کو ان دونوں تاریخوں سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو بحر ذخار سے اور حباب کو تیز و تند طوفان سے۔ میں نے اپنی اس تصنیف میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور استعارات سے بھی احتراز کیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کا نام میں نے منتخب التواریخ رکھا جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ بادشاہانِ اسلام کے فرخندہ جام ناموں کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس مولف کی ایک یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔259

بدایونی اپنی کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلے حصے میں اکبر سے قبل سلاطین ہند کی تاریخ ہے دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علماء مشائخ اور اطباء وشعراء کا ذکر ہے۔260

کتاب کے تیسرے حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے معین الحق لکھتے ہیں ''عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے جزو ثالث میں مشائخ عظام کے علاوہ اس دور کے علماء وفضلاء، شعراء، اور حکماء کے حالات قلمبند کیے ہیں جن کے حالات ابوالفضل نے بوجہ تعصب اپنی تصانیف میں یا تو مجملاً شامل کیے یا سرے سے قلم انداز کر دیئے تھے۔261

ملا صاحب بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو خلاف شرع و مذہب سمجھ لیتے تھے، پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اکبر کے مذہبی خیالات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کے باعث ہوئے تھے، ان کو کاذب، ملحد، کافر، ملعون، بے دین، زندیق اور بدبخت کے الفاظ سے یاد کرتے اور ان تمام خیالات کو اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی مذلت بلکہ جان و مال کے لیے نقصان کا سبب قرار دیتے تھے۔262

مولانا محمد حسین آزاد بھی بدایونی کی تحسین کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''منتخب التواریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔263 تاریخ نویسی میں ان کی یہ صاف گوئی جہانگیر کو پسند نہ آئی، کیونکہ اس سے اکبر کی بری تصویر سامنے آئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے زمانے میں اس کی اشاعت بند کر دی تھی۔264

حقیقت یہ ہے کہ بدایونی نے نظریۂ تاریخ کو غیر جانبداری کے ساتھ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ ان تمام افراد کی تعریف کرتا ہے جو قابل تعریف تھے، اور ان تمام واقعات اور حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا جو درست نہ تھے۔265 بدایونی کے طرز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ''بدایونی کی تاریخ آسان فہم ہے اور انداز نگارش سادہ ہے اس میں جو طنزیہ انداز ہے اس سے اصلاح کا مقصد درکار ہے۔266

ہندوستان میں فن تاریخ نگاری میں ارباب علم وفضل کی کمی نہ تھی۔ سلاطین دہلی سے لے کر اکبر کے عہد تک متعدد مورخین نے اپنی تاریخ نویسی کے ذریعے اپنے آپ کو اور اپنے ممدوح کو تاریخ میں امر کر دیا تھا۔ ان تاریخ نگاروں میں ابوالفضل کو انفرادیت اس لیے حاصل ہے کہ اس نے دور وسطیٰ کی تاریخ نگاری کی روایتوں پر اپنا ایک نقش چھوڑا ہے۔ اس کو خاص طور سے ممتاز مورخ کا خطاب دینے کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کی تحریروں پر عقلی عنصر غالب تھا، تاریخ کے بارے میں اس کا نقطہ نظر زیادہ وسیع تھا اس نے اپنے زمانے کی تاریخ کی ترجمانی اس دور کی سیاسی اور انتظامی حقیقتوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔267

اس نے تاریخ نگاری کے ایک نئے طریقے کو اپنایا جس کا اطلاق اس نے اپنی تحریروں پر کیا۔ اس کی نثر کا ادبی اسلوب سب سے جدا اور بڑے اعلیٰ درجے کا تھا۔ بحثیت مورخ اس کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ اکبر نامہ اور آئین اکبری کے ذریعے اکبر کی عظمت کو ایک نمایاں اور ٹھوس شکل دینے میں کامیاب ہوگیا۔268

اکبر نامہ:

ابوالفضل غایت احترام میں اپنی کتاب ''اکبر نامہ'' کو اکبر نامہ نہیں لکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اکبر کا نام لکھنے میں سو احترام کا احتمال پیدا ہوتا تھا اس لیے اپنی کتاب کو کبھی تو اقبال نامہ، کبھی نگارین نامہ اور کبھی شگرف نامہ کے نام سے یاد کرتا ہے، پھر پوری کتاب میں کہیں اکبر کا نام نہیں آیا ہے اس کے لیے طرح طرح کے القاب استعمال کرتا ہے۔ ان القاب کے ڈھونڈنے میں اس کا ذہن خوب کام کرتا ہے۔269 ابوالفضل کے اکبر نامہ کا بیانیہ حصہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے شروع ہو کر اکبر کے تیتالیسویں سال جلوس تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ حضرت آدمؑ سے آغاز کرنا ابوالفضل کے لیے وسطی زمانے کی محض ایک روایت ہی نہیں تھی اس کے برعکس اکبر کے نسب نامے کو دنیا کے سب سے پہلے انسان سے ملانے

سے مصنف کا اس مقصد اپنے مربی کو انسانی ترقی کے نقطۂ عروج پر دکھانا تھا۔ اکبر نامے میں اکبر کے عہد سے پہلی کی تاریخ کے بیانیہ حصے کے اسلوب سے بھی ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ وہ اس حصے سے بڑی جلدی گزر جاتا ہے۔ اگر چہ اکبر کے اولین پیشرو کے احوال کا ذکر نسبتاً مفصل ہے مگر یہاں بھی محسوس ہوتا ہے کہ اکبری عہد کے مقابلے میں تاریخ کے اس حصے کو بھی وہ مسلسل ثانوی حیثیت دیتا ہے۔270

اکبر نامہ دو دفتر یا جلدوں پر مشتمل ہے۔ دفتر اول میں سلسلہ تیموریہ کا مختصر حال ہے۔ بابر کا کچھ زیادہ، ہمایوں کا اس سے زیادہ، پھر اکبر کا ۱۷ برس کا حال، اسے قرن اول قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت سلیس منشیانہ محاورۂ متانت سے دست و گریبان ہے۔ دفتر دوم ۱۸ جلوس یعنی قرن ثانی سے شروع ہوتا ہے اور ۴۶ جلوس پر ختم کیا، اس میں اکبر کے سترہ سالہ سلطنت کا حال ہے۔ اس میں مضامین کا جوش و خروش، لفظوں کی شان و شوکت، عبارت زور شور پر ہے اور بہار کے رنگ اڑتے ہیں۔ اس کا انداز عالم آرائے عباسی اور انشائے طاہر وحید سے ملتا ہے۔271

مختصر یہ کہ اکبر نامہ میں سیاسی واقعات کے بیان کی حدود میں رہتے ہوئے کئی موضوعات پر وسیع معلومات ملتی ہیں، ان کا تعلق اکثر میدان جنگ اور اس میں اختیار کی جانے والی جنگی تدابیر، افواج کے کمانڈروں وغیرہ سے ہے، کہیں کہیں دوسرے ممالک اور علاقوں کے متعلق اطلاعات بھی ملتی ہیں اور کبھی کبھی سیاسی واقعات سے متعلق افراد کا تعارف اور شجرہائے نسب بھی نظر آتے ہیں۔272

سرکاری ماخذ اور شہادت کی ہر جزو کی سچائی کی زوردار تلاش اکبر نامہ کو اپنے وقت کے سیاق و سباق کے حوالے سے ایک اصلی تحقیقی کتاب بنا دیتی ہے۔ یہ کتاب واقعات کے متعلق مصنف کا اپنا تاثراتی بیان نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ اصلی بنیادی کام بڑے منظم طریقے سے اکٹھی کی گئی معلومات پر مبنی ہے۔273

آئین اکبری:

ابوالفضل کی دوسری اہم تاریخی کاوش ''آئین اکبری'' ہے۔ اکبر نامہ اور آئین اکبری ایک ہی

کتاب کے دو جز ہیں۔ اکبر نامہ کے پہلے حصے میں اکبر کے آباؤ اجداد کا ذکر ہمایوں کے ذکر تک ہے۔ دوسرے حصے میں اکبر کے چھیالیسویں سال تک کا نہایت مکمل بیان سال وار ترتیب میں دیا ہوا ہے۔ آئین اکبری کتاب کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ایک بے مثال تالیف ہے۔274 آئین اکبری میں امور سلطنت کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔ اس میں شاہی حرم، شکوہ سلطنت کنگن شاہنشاہی، فراش خانہ، آبدار خانہ، باورچی خانہ، دارالضرب، لشکر گاہ، توپ خانہ، بندوق، ہاتھی، گھوڑے، خچر، اونٹ، اصطبل، منصبداری نظام، کشک، صوبے، حدود صوبے، ان کی تاریخ، وہاں کی آمدنی، پیداوار، میوے، نرخ اجناس، دریا، ندی، نہر، اراضی وغیرہ کے ساتھ معاصر علماء، شعراء ہندوستان کے صوفیائے کرام اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد وغیرہ سے متعلق بیش بہا معلومات ہیں۔ ان تمام خشک چیزوں کے لکھنے میں ابوالفضل کے قلم کی رعنائی اور توانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے بلکہ اکبر نامہ اس کے اطناب کا شاہکار ہے، تو یہ کتاب اس کے ایجاز کا اعجاز ہے۔275

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں ''ابوالفضل ایشیائی انشاء پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا۔ اس نے اکبر نامہ اور آئین اکبری لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اس نے خوش بیانی اور یادہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں۔ اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح و مداح دونوں سے نفرت ہوتی ہے، اور دونوں کی ذات وصفات پر بٹہ لگتا ہے۔ البتہ ابوالفضل بڑا علامہ عامل اور مدبر تھا۔ دنیا کے کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت ہے وہ اس میں ضرور تھی''۔276

ڈاکٹر معین الحق بھی ابوالفضل کی تاریخ نویسی کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئینِ اکبری ہمارے سرمایہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اکبر نامہ ایک خاص مقصد کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ ابوالفضل اکبر کو مطلق العنان حکمران سے زیادہ، بلند مقام دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کا حصول کے لیے ضروری تھا کہ اس کے کارناموں کو ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جو دوسرے مطلق

العنان اور استعمار پرست حکمرانوں سے بہتر اور اعلیٰ معلوم ہو۔ یہی سبب ہے کہ وہ تاریخی حقائق کو بھی ایسی عبارت میں پیش کرتا ہے جو اکبر یا اس کے اجداد کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت اور تقدیس دے دیتی ہے۔277

ابوالفضل دور وسطیٰ کا پہلا مورخ ہے جس نے اصل ماخذ کی اہمیت کو جانا اور بڑی غور وفکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا۔ کسی ایک حقیقت کی تصدیق کے لیے اس نے صرف ایک ماخذ یا صرف ایک بیان پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ جتنی ہو سکتی تھیں وہ ساری روایتیں جمع کیں۔ انھیں تسلیم کرنے سے پہلے تنقیدی طور پر جانچا، پرکھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے بہت سے سوال بنا لیے تھے جنھیں وہ کسی واقع یا حقیقت کے راوی سے پوچھتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ طریق کار حق کی صداقت کے لیے مورخ کی بڑی مدد کرتا ہے''۔278

خواجہ نظام الدین احمد: (۱۵۵۱ء۔۱۵۹۴ء)

خواجہ نظام الدین احمد بخشی، ایک اندازے کے مطابق ۹۵۸ھ / ۱۵۵۱ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔279 ان کے والد خواجہ محمد مقیم ہرات کے رہنے والے تھے۔ وہ بابر بادشاہ (۱۵۲۶۔۱۵۳۰ء) کی ملازمت میں اس وقت آئے جب بابر افغانستان سے ہندوستان فتح کرنے آرہا تھا۔ پانی پت کی مشہور جنگ (۱۵۲۶ء) میں وہ شریک تھے اور فتح پور کے معرکہ میں بھی انھوں نے حصہ لیا اور خوب داد شجاعت دی اسی وجہ سے بابر بادشاہ نے ''دیوانی بیوتات'' جیسے اہم عہدہ پر خواجہ محمد مقیم کا تقرر کیا تھا۔280

خواجہ نظام الدین احمد، دربارِ اکبری کے پنجہزاری امراء میں تھا جو اس عہد کی بڑی معراج تھی۔ گجرات میں بخشی کے عہدے پر مامور تھا۔ ۱۰۰۲ھ میں طبقات اکبری لکھی جس نے اس کو حیاتِ جاوداں بخشی۔ یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کی جامع تاریخ ہے۔ مصنف نے معلومات ان تمام مستند ماخذوں سے حاصل کیں جو اس وقت ممکن صورت سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس لیے یہ کتاب ہمیشہ مستند تاریخوں میں شمار کی گئی ہے۔281

خواجہ نظام الدین نے لکھا ہے کہ ان کے والد خواجہ محمد مقیم ہروی نے انہیں تاریخ کی کتابیں پڑھنے کی فہمائش کی اور جب انھوں نے تاریخ کی کتابیں پڑھیں تو رفتہ رفتہ ان کو علم تاریخ سے ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی۔ انھوں نے دیکھا کہ اب تک جو تاریخی کتابیں ہندوستان سے متعلق لکھی گئی ہیں وہ پورے ملک کے حالات کا احاطہ نہیں کرتیں یا تو وہ ایک خاص عہد تک لکھی گئی ہیں، جیسے طبقات ناصری یا تاریخ فیروز شاہی یا پھر علاقوں کی تاریخ سے متعلق ہیں۔282 لہٰذا میرے دل میں آیا کہ میں ایک ایسی تاریخ لکھوں کہ جو ممالک ہندوستان کے مکمل حالات پر مشتمل اور جامع ہو اور اس کی عبارت صاف اور واضح ہو۔283 چونکہ یہ کتاب ہندوستان کے تمام فرمانرواؤں کے طبقات پر مشتمل ہو اور تمام طبقات کی انتہا حضرت خلافت پناہی (اکبر بادشاہ) کے طبقہ علیہ پر ہوتی ہے، اس لیے اس کا نام طبقات اکبر شاہی رکھا ہے، لیکن یہ اپنے مختصر نام ''طبقات اکبری'' کے نام سے معروف ہے۔284

خلیق احمد نظامی طبقات اکبری کے ماخذ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نظام الدین کے مآخذ میں بہت سی ایسی تاریخیں شامل ہیں جو اب نادر و نایاب ہیں۔ ایسی ہیں جو حال ہی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ فتوحات فیروز شاہی، فتوح السلاطین تاریخی محمدی وغیرہ کو ان سے پہلے کسی مورخ نے استعمال نہیں کیا تھا۔ فتوحات فیروز شاہی کی اصل نوعیت کے متعلق تو سب سے پہلے اطلاع ان ہی سے ملتی ہے''۔285

نظام الدین کے نظریہ تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیق صاحب لکھتے ہیں ''خواجہ نظام الدین کا نظریہ تاریخ اپنے دو مشہور معاصرین ابو الفضل اور عبد القادر سے بالکل مختلف تھا۔ وہ تاریخی واقعات کے تجزیے میں ذاتی تاثرات شامل کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے نہ ابو الفضل کی طرح اکبر کی مدح سرائی میں مبالغہ کیا ہے، نہ بدایونی کی طرح اس کو ہدف ملامت بنانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ کوئی نقطہ نظر پیش نہیں کیا۔ اس طرح ان کے بیانات کی صداقت تو مسلم ہوگئی، لیکن انداز بیان بالکل سادہ اور بے جان ہوگیا''۔286

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں ''عمدہ تاریخ ہے۔ ۱۰۰۲ھ تک اکبر کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ مفصل نہیں مگر

مختصر بھی نہیں، عبارت صاف، بے تکلف، بے مبالغہ، حالات کی تحقیق، احوالات کی تنقیح، اخبار کے فراہم کرنے میں بڑی کوشش اور وقت اٹھانی پڑی۔287 یہی پہلی تاریخ ہے کہ جو بادشاہ مختلف ممالک ہند میں ہونے، ابتداء سے عہد تصنیف تک سب کے حال پر حاوی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ اور ان کے بعد کے جو مورخ آئے اور اس سے زیادہ لکھ گئے، اصل سب کی یہی ہے۔288

عبدالقادر بدایونی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی مشہور تاریخ منتخب التواریخ کا خاص ماخذ طبقات اکبری ہے۔ وہ کہتے ہیں ''میرے مہربان اور مشفق دوستوں میں سے ایک نے تاریخِ نظامی کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ میرے اس دوست کو دین سے کافی لگاؤ تھا۔ اس فقیر کے ساتھ بھی اسے محبت تھی۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ رخت حیات باندھ کر فردوسِ اعلیٰ کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ہندوستان کے صاحبِ استقلال کے حالات قلمبند کروں۔ چنانچہ تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو میں نے اپنے پیش نظر رکھا۔ کچھ مواد ان سے اخذ کیا اور کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ میری اس تصنیف کو ان دونوں تاریخوں سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو بحرِ ذخار سے اور حباب کو تیز طوفان سے''۔289

شیخ عبدالحق محدث دہلوی:

حقی صاحب (۱۵۵۱ء۔۱۶۴۲ء) کا شمار ہندوستان کے مشہور ترین علماء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شمالی ہند میں علم حدیث کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ تقریباً نصف صدی تک دہلی میں ان کا مدرسہ علم وفضل کا گہوارہ اور ارشاد و تلقین کا مرکز رہا۔290 جہانگیر نے ان کے متعلق لکھا ہے:

''شیخ عبدالحق کہ از اہل ارباب وسعادت است۔ کتابی تصنیف نمودہ بود۔ مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر در آورد۔ خیلی زحمت کشیدہ۔ مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسری برد۔ مرد گرامی

است۔ صحبتش بیدوقی نیست۔ بہ انواع مراحم و دلنوازی فرمودہ

رخصت کردم''۔291

مصنف تاریخ ''عمل صالح'' لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالحق دہلوی ۱۰۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور ہندوستان کے ان مشہور عالموں میں ہیں جن کا نام آج بھی تمام ملک میں ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔292

فن تاریخ پر شیخ عبدالحق کی کتاب ''ذکر ملوک'' قابل ذکر ہے۔ اس کو حقی صاحب کی تحقیقی و ادبی کاوشوں کا نمونہ تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن تخلیص و تفسیر کا جو ملکہ ان کو تھا اس کا اظہار نہایت اعلیٰ طریقے پر اس تالیف میں ہوا ہے۔ سلطان معزالدین سام سے لے کر ناصر الدین محمود تک کے حالات منہاج السراج کی ''طبقات ناصری''، بلبن سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے حالات ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' سے نہایت سلیقہ اور احتیاط سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد عہد اکبری تک جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ذاتی مشاہدہ یا اپنے بزرگوں سے سن کر لکھا ہے۔ کتاب کا یہ آخری حصہ ہی تاریخی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ مجموعی طور پر ''ذکر ملوک'' کسی نئے تاریخی مواد کی تلاش بے سود ہے لیکن اس کتاب کو خصوصیت کے ساتھ اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ عہد اکبر کا ایک محدث اور عالم دین ہند پر کس انداز سے نظر ڈالتا تھا۔293

کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتے ہیں کہ ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۰ء کے بعد شاہانِ دکن کے حالات میسر نہیں ہوئے۔ اسی وجہ سے ان کو تاریخ میں داخل نہیں کیا جاسکا اور اس وجہ سے شاہانِ کشمیر اور سندھ کے حالات کے باعث بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ ترتیب کا کام ۱۰۰۵ھ میں ختم ہوا۔294

ملاعبدالباقی نہاوندی:

مآثر رحیمی کے مؤلف ملا عبدالباقی، نہاوند (ہمدان) میں پیدا ہوئے ان کے آباؤ اجداد قبیلہ کرد کے

سرداروں میں سے تھے۔ خاندان میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا۔ ان کے والد مدرلی حص لرتے، وہ ہم دفتر، سیاق، حساب وغیرہ کے ماہر تھے۔295 مولانا عبدالباقی نہاوندی اپنی شاعری کی بدولت تو نہیں لیکن ''مآثر رحیمی'' کے مصنف کی حیثیت سے ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

یہ کتاب خانخانان کی فرمائش پر لکھی گئی جو ۱۰۲۵ھ یا ۱۶۱۶ء میں ختم ہوئی۔ یہ تین جلدوں میں تین ہزار دو سو اکانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں خانخانان کے آباء و اجداد کے قبیلے سے متعلق کچھ معلومات ہیں۔ پھر غزنویوں، سلاطین بنگالہ، سلاطین شرقیہ، فرمانروایان مالوہ، ملتان، سندھ، گجرات، سلاطین، دہلی، پھر بابر سے لے کر جہانگیر تک کے حالات ہیں۔اس طرح اس میں تاریخی مواد بھی بہت کچھ جمع کر دیا ہے، لیکن اس کی اصل قدر و قیمت اس لیے ہے کہ اس میں خان خاناں کے نہ صرف ذاتی حالات و اوصاف بیان کیے گئے ہیں بلکہ اس کے دربار کی علمی و ادبی سرگرمیاں بھی بڑی تفصیل سے پیش کی گئی ہیں۔296

کتاب کے بنیادی موضوع عبدالرحیم خان خاناں کے متعلق محمد حسین آزاد لکھتے ہیں ''خان خاناں کی استعداد علمی کے باب میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ قابلیت و استعداد میں یکتائے روزگار تھا۔عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔عقلی ونقلی علوم سے بہرہ مند تھا اور شجاعت اور شہامت اور سیادت کے اوصاف عالیہ کا حامل ہونے کی وجہ سے قدرت الٰہی کا نشان تھا۔297 ضروریاتِ علمی کے لیے اکبر نے اس سے کہا کہ یورپ کی کچھ زبانیں سیکھ لے۔ چنانچہ ان میں بھی اس نے کچھ مہارت حاصل کی۔ افسوس کہ معاصر مورخین نے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی۔298

عبدالمجید سالک، مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' یہ کتاب عبدالرحیم خان خاناں اور اس کے آباء واجداد کا دلچسپ تذکرہ ہے۔ خان خاناں کے علمی کمالات اس کی علم دوستی، فیاضی،شوق فراہمی کتب اور اس کے دربار کے علماء و فضلاء، ادباء، شعراء اور ارباب فن کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔299

مآثر رحیمی پر تبصرہ کرتے ہوئے سبلی لکھتے ہیں ''کتاب خانخاناں کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور سرمایۂ معلومات زیادہ تر ذاتی مشاہدہ اور سرکاری کاغذات جس سے کتاب کی ضخامت دو ہزار صفحوں کی ہے۔ نصف کے قریب خانخاناں کے اسلاف اور سلاطین تیموری کے حالات ہیں۔ باقی نصف خود خان خاناں کے کارنامے ہیں۔300

محمد قاسم فرشتہ: (۱۵۷۲ء۔۱۶۰۵ء)

فرشتہ کا پورا نام ملا محمد قاسم ہندوشاہ ہے اور تخلص فرشتہ ہے۔ اس کا آبائی وطن استرآباد ہے جہاں وہ ۱۵۵۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۶۰ء میں بیجاپور کے حکمران براہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے منسلک ہوا جو ایک علم دوست حکمران تھا۔ اس نے قاسم فرشتہ کی علمی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر اسے ہندوستان میں اسلامی عہدِ حکومت کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔301

فرشتہ لکھتا ہے''اس گفتگو کے بعد میں نے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق کتابیں جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی اور ہر مقام اور ہر ملک کی تاریخی کتابوں کے مختلف نسخے جمع کیے اور متقدمین کی تصنیف کردہ کتابوں کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس مخفی خزانے کو جو ان کتابوں میں موتیوں کی طرح بکھرا ہوا تھا ایک خاص ترتیب کے ساتھ تاگے میں پرویا ہے۔ میری محنت اس کتاب کی صورت میں کہ جس کا نام''گلشن ابراہیمی'' ہے آپ کے سامنے ہے۔302

''گلشن ابراہیمی'' تاریخ فرشتہ کے نام سے معروف ہے۔ کتاب کے مترجم، صاحب تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''فرشتہ، اکبر اور جہانگیر کے عہد کے ان ابتدائی عظیم مورخین میں سے تھا جس نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت پر ایک مستند اور جامع تاریخ لکھ کر آنے والے ادوار کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس کی

جامع تصنیف کا نام تاریخ فرشتہ ہے۔ اس کا آغاز برصغیر کی ہندو تہذیب سے ہوتا ہے لیکن کتاب جامع طور پر اس خطہ کی اسلامی تاریخ پر محیط ہے، اس کتاب کے جائزے سے صاحب کتاب کے تاریخی و ادبی ذوق کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ فرشتہ نے اولین عہد کی مستند تواریخ کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت کے تحت لوگ داستانوں کا سہارا لیتے ہوئے واقعات کو ٹھوس انداز میں بیان کر کے تاریخ کا حق ادا کر دیا ہے، اور ہر دور کے حکمرانوں کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہر بات نہایت جرأت اور بے باکی سے قلمبند کرتے ہوئے اس دور کے تہذیب وتمدن کے عروج و زوال کی اصل وجوہات سمجھنے میں صحیح رہنمائی کی ہے''۔303

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سلطنت بہمنی، بیجاپور، احمد نگر، تلنگانہ، برار، بیدر، خاندیس، گجرات، مالوہ، جونپور، ملتان، سندھ، کشمیر کے بادشاہوں کے علاوہ ہندوستان کے بعض مشائخ کا تذکرہ بھی ہے۔304

تاریخ فرشتہ مسلمانوں کے ورود ہند کے مساجد کی عمومی تاریخ ہے جس کا بیشتر حصہ دوسری تاریخوں پر مبنی ہے۔ البتہ ابتدائی حالات کے لیے اس کے سامنے بعض ایسی تاریخیں تھیں جو آج ناپید ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ فرشتہ مختلف صوبہ جات کے حالات جاننے کیلئے انتہائی کارآمد ہے۔305

نورالدین محمد جہانگیر:

مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر (۱۵۶۹ء۔ ۱۶۲۷ء) نے شاہان تیمور کی خودنوشت سوانح حیات کی روایت کو جاری کرتے ہوئے اپنی سوانح حیات تزک جہانگیری کے نام سے تحریر کی۔ اس میں تخت نشینی کے

سترہ سالہ حالات جہانگیر نے بقلم خود تحریر کیے ہیں۔ عالم حقیقی کی بناء پر سترہ سے انیس سالہ عہد کے واقعات اس کے وزیر، معتمد خان نے تحریر کیے اور بادشاہ سے تصحیح کرا کر شائع کیے۔ بعد ازاں محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ایک اور امیر مرزا محمد ہادی نے بادشاہ عالم پناہ کی وفات اور حضرت شاجہان قرآن ثانی کے جلوس جہانبانی تک کہ واقعات (۱۱۳۱۔۱۱۶۱ھ) معتبر کتابوں سے اخذ کر کے کتاب مذکورہ میں شامل کر دیئے۔306

اگر چہ تزک جہانگیری پر تزک بابری کو برتری حاصل ہے، لیکن اس اعتبار سے دونوں کتابیں ایک جیسی منزلت رکھتی ہیں کہ دونوں کے مصنف اپنے وقت کے یگانہ روزگار ادیب اور صاحب انشاء پرداز تھے۔ ان کتابوں میں اگر کوئی فضل و فرق ہے، تو وہ صرف اس قدر ہے کہ پہلی کتاب کا مصنف بابر، جہانگیر کے خاندان کا جدامجد اور ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے زندگی کو جہانگیر کی نسبت بہت زیادہ قریب سے دیکھا تھا اور راہ گزر حیات پر چلتے وقت بے انتہا مصیبتیں اٹھائی تھیں۔307

جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری پر نہ صرف اس کے کردار، علم و فضل اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی نہ تھا۔ وہ اپنی کمزوریاں تحریر کرتا ہے، بڑی صاف دلی سے غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اگر محض اس کی کتاب پڑھ لی جائے تو اس کی صلاحیتوں کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، اپنے باپ کی طرح وہ بھی جواہرات کا شائق تھا، اور ایک سچے نقاد کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ وہ ایک زبردست شکاری تھا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اس کھیل کا مزہ لیتا رہا، وہ فطرت کا شیدائی تھا خواہ وہ جاندار کی شکل میں ہو یا بے جان شکل میں، اور اسے بڑی تیزی اور مشتاق نظروں سے دیکھتا تھا۔308 وہ اس انداز سے فن تعمیر اور باغبانی پر رائے زنی کرتا جیسے اس نے ان چیزوں پر بڑا وقت صرف کیا ہو اور غور کیا ہو۔309

جہانگیر کے طرز بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں "جہانگیر ہر قسم کے واقعات کو جس خوبی، سادگی، صفائی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کرسکتا ہے وہ بڑے بڑے انشا پرداز نہیں کر سکتے اور ساتھ ہی زبان کا ایسا لطف قائم رکھتا ہے کہ فارسی انشا پردازوں و سوانح نگاروں میں سے کسی سے بن نہیں

آ سلتا''۔310

ڈاکٹر معین الحق اگرچہ شبلی کے بیان کو قدر مبالغہ آمیز قرار دیتے ہیں لیکن خود اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کے طرز ادا میں بہت سی خوبیاں ہیں، اکثر اوقات تاریخی واقعات کو ادیبانہ رنگ میں بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی سختی کے ساتھ اس کی پابندی کرتا ہے کہ تاریخی حقائق کو حقائق ہی کی طرح پیش کرے اور جب کبھی محفل جشن وغیرہ کا حال لکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بزم کی قلمی تصویر کھینچ دی ہے۔311

تزک جہانگیری کا اصل نسخہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد جو جلوس کے بارہ سات کے واقعات پر مشتمل ہے۔ بادشاہ عالم پناہ کی خودنوشت ہے۔ یہ جب پایۂ تکمیل کو پہنچی تو شہنشاہ نے اہل فن اور محرران شیریں رقم کو حکم دیا کہ اس کے متعدد نسخے تیار کیے جائیں اور قلمرو کے تمام شہروں میں ارباب دولت احباب سعادت کو بھیجے جائیں تاکہ وہ اس کو اپنا دستور عمل بنائیں جو واقعات بعد میں احاطہ تحریر میں لائے گئے وہ جلد دوم قرار پائے۔ درحقیقت تزک جہانگیری اپنے وقت کی انتہائی مستند دستاویز ہے اس کے ایک ایک لفظ سے جہانگیر کی وسعت نظر عیاں ہے۔ ہر جملہ اور ہر لفظ اس کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔312

معتمد خان: (م ۱۶۳۹)

جہانگیر کے عہد پر اس کی تزک کے علاوہ دوسرا مستند تاریخی ماخذ ''اقبال نامہ جہانگیری ہے، جو جہانگیر کے وزیر اور درباری مورخ معتمد خان کی کاوشِ قلمی ہے۔ جس میں امیر تیمور سے لے کر شاجہان کے ابتدائی عہد کا احاطہ کیا گیا ہے۔313 اقبال نامہ جہانگیری محض سیاسی تاریخ نہیں بلکہ اس دور کی ادبی وعلمی تاریخ بھی ہے۔314 اس دور کے علماء، فضلاء، اطباء، شعراء اور نثر نگاروں کے تذکروں نے اسے جامع اور مستند ماخذ بنا دیا ہے۔ معتمد خان چونکہ ان حالات کا عینی شاہد تھا اس لیے بڑی تحقیق سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔315

اقبال نامہ جہانگیری کا مصنف محمد شریف بن دوست محمد امیر اصل تھا۔ جہانگیری علم پروری اور علماء نوازی کی شہرت سن کر ایران سے ہندوستان آیا اور جہانگیر کے مصاحبوں میں شامل ہوا۔ جہانگیر نے تیسرے جلوس شاہی میں اسے معتمد خان کے خطاب سے نوازا۔ مرزا محمد شریف ایک تجربہ کار منتظم اور شجاع فوجی افسر ہونے کے علاوہ بلند پایہ ادیب اور اعلیٰ درجے کا انشا پرداز تھے۔316 ان کی ادبی خوبیوں کے باعث جہانگیر نے شدید علالت کی وجہ سے بامر مجبوری تزک لکھنے کا کام محمد شریف کو سونپا جس نے سترہویں جلوس سے جہانگیر کی وفات تک کہ حالات قلمبند کیے۔317 اس میں جہانگیر کے عہد کے اہم واقعات، اسلامی شعائر کا نفاذ، غیر شرعی رسومات کا خاتمہ، نور جہاں سے شادی، نور جہاں کی ذکاوت، مہابت خان کی بغاوت، عہد جہانگیری کے فلاحی کام، جہانگیر کا سفر کشمیر، کشمیر کی عمارتوں اور خوبصورت مقامات کا تذکرہ اور کشمیر کی ثقافتی و صنعتی ترقی کا تذکرہ شامل ہے۔318 اقبال نامہ کے مقدمہ نگار محمد اقبال سلیم گاہندری لکھتے ہیں

''یہ تصنیف دور جہانگیری کا بہترین روزنامچہ ہے۔319

عبدالحمید لاہوری: (م۱۶۶۳ء)

شاہجہاں کے عہد کا مشہور مورخ شیخ ابوالفضل کے نامور تلمیذ اور سعد اللہ خان (وزیر) کا خاص ندیم اور ساکن لاہور تھا۔ ابوالفضل کے طرز انشاء پر لکھنے میں بڑی مہارت پائی تھی، جہانگیر عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا اور بعد ملازمت پٹنہ (یا ٹھٹھہ) میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ مغل شہنشاہ شاہجہان نے اس کی شہرت سنی تو دربار میں بلایا۔ عبدالحمید حاضر دربار ہوا تو اسے عہد شاہجہانی کے وقائع قلمبند کرنے پر مامور کیا۔320 اس نے دو جلدوں میں دس دس سال کے دو ادوار کی تاریخ ''بادشاہ نامہ'' میں منضبط کی ہے، جس پر شاہجہاں کے وزیر سعد اللہ خان نے نظر ثانی کی۔ تیسری جلد وہ نقاہت اور کبر سنی کی وجہ سے نہ لکھ سکا اسے عبدالحمید کے ایک شاگرد اور معاون محمد وارث نے مرتب کیا۔321

اس کتاب میں اس دور کی سیاست، انتظامیہ، عدلیہ اور مذہبی امور کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔ یوں یہ

کتاب دور مغلیہ کی ایک مستند اور جامع تاریخ اور عہد شاہجہانی کا ایک بیش قیمتی تاریخی سرمایہ ہے۔322 بادشاہ نامہ'' کے اسلوب تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد صالح کنبوہ نے اپنی کتاب ''عملِ صالح'' میں لکھا ہے ''سخن آرائی کا انداز عبدالحمید نے ابوالفضل سے سیکھا ہے اور اس فاضل بے بدل کے کلام سے اس نے پورا حصہ پایا ہے۔ چنانچہ عبدالحمید کی تحریر کا اسلوب وہی ہے کہ وہ اس پیشوائے نکتہ دان کے قدم بہ قدم چلتا ہے۔ انشاء پردازی میں کامل ہے اور نکتہ فہمی میں اپنے معاصروں سے بہت آگے! تاریخ نگاری میں اس نے اپنی طبع ارجمند سے ہر جگہ لطف سخن پیدا کیا ہے''۔323

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بادشاہ نامہ کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس کتاب میں اس دور کی انتظامیہ کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں، اور یہ عہد شاہجہان کا ایک قابل اعتماد تاریخی ماخذ ہے''۔324

محمد حسین، عبدالحمید لاہوری کے انداز تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ملا عبدالحمید نازک خیال بہار بند انشا پرداز اچھے تھے۔ دلآویز لفظ چن کر لاتے تھے اور بہاریہ فقروں میں سجاتے تھے اور مطلب ادا کر دیتے تھے۔ اس خلاق معانی کا کیا کہنا! اس کے خانہ دماغ میں گل وبلبل کو لائیں تو رنگ اڑ جائیں۔ طوطی وبلبل آئیں تو پر جل جائیں۔ وہاں تو فلسفہ وحکمت کی انشا پردازی ہے۔ بیان ومطلب کے لیے آسمان طبع سے مضمون نہیں تارے اتارتا ہے اور فلسفی نظر سے اپنی قدر الکلام زبان کے سپرد کر دیتا ہے۔325

محمد صالح کنبوہ:

محمد صالح کنبوہ کا درجہ بحیثیت مصنف بلند ہے، لیکن اس باکمال مورخ اور انشاء پرداز کے حالات زندگی ورطۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ اس جید عالم وفاضل نے جہاں فارسی ادب کی خدمت کی ہے وہاں اپنی جنبش قلم سے ہزاروں باکمال شخصیات کو زندہ جاوید بنا دیا۔ شیخ عنایت اللہ مصنف بہار دانش اور مولانا ابو البرکات کے احوال سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے، دربار شاہجہاں کے میر منشی شیخ عنایت

اللہ سے رشتہ تلمذ تھا اور ان ہی کی زیر تربیت ترقی کے منازل طے کیے اور شاہی دربار تک رسائی بھی انہی کی بدولت حاصل کی۔ رفتہ رفتہ ان کی قابلیت کے جوہر کھلتے گئے اور آخر وہ صوبہ لاہور کے دیوان ہو گئے۔326

محمد صالح کنبوہ دو نادر تصانیف کے مصنف ہیں ایک عمل صالح (شاہجہان نامہ) دوسری بہار سخن ہے۔ مورخ الذکر محمد صالح کی فارسی نثر نگاری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ چار حصوں پر مشتمل ہے اور اس دور کے فن تعمیر اور ادب و انشاء کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے نہایت اہم ماخذ ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کے فارسی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے''۔327 لیکن جس کتاب نے محمد صالح کو مغل تاریخ میں امر کر دیا وہ شاہجہاں نامہ ہے۔ جو عمل صالح کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر ناظر حسین زیدی لکھتے ہیں:

> ''شاہجہانی عہد کے تمام تاریخ نویس ابو الفضل کے مقلد ہیں لیکن ابوالفضل کی متانت میں شگفتگی اور آرائش عبارت میں سنگینی و معنی آفرینی کا امتزاج ہے۔ عبدالحمید، محمد وارث، اور محمد صالح اس انداز کی متانت و سنگینی پیدا نہیں کر سکے۔ مضمون آرائی ان کا شیوہ ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ان بزرگوں، بالخصوص محمد صالح کو قدرت کلام انتخاب الفاظ اور مضمون آفرینی کا بڑا سلیقہ ہے۔ عمل صالح سے شاہجہان کے عہد کے واقعات نہایت شرح و بسط سے معلوم ہوتے ہیں''۔328

اس میں عہد شاہجہانی کا نظم مملکت اس کی داخلہ و خارجہ پالیسی، عسکری قاعدے و دستور، جنگی مہمات اور بادشاہ کی افتاد طبع کے علاوہ جغرافیائی اور حیاتیاتی معلومات جامع انداز میں بیان کی گئی ہیں۔329

ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی عمل صالح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ تالیف اگرچہ حجم کے لحاظ سے بادشاہ نامہ، مولف عبدالحمید لاہوری سے چھوٹی ہے تاہم اپنی مستند اطلاعات کے سبب اسے بھی خاص شہرت

حاصل رہی ہے۔ طرز انشاء کے لحاظ سے اس کی زبان بڑی پر تکلف اور آرائی ہے۔330

محمد کاظم شیرازی: (م ۱٦۸۱)

محمد کاظم شیرازی، ایران کے ممتاز علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہجہان کے دور میں ہندوستان آئے اور میر منشی اور وقائع نگار کے منصب پر سرفراز ہوئے۔331 محمد کاظم شیرازی کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر اورنگ زیب عالمگیر نے اپنا منشی (سیکریٹری) مقرر کیا اور اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ سرکاری دستاویزات کی مدد سے شہنشاہ (عالمگیر) کے عہد حکومت کی ایک مکمل تاریخ مرتب کرے۔332

''عالمگیر نامہ'' اورنگ زیب عالمگیر کے دس سالہ عہد حکومت کی تاریخ ہے جو اسی انتظام و اہتمام کے ساتھ مرتب کی گئی ہے جس اہتمام کے ساتھ اکبر نامہ اور بادشاہ نامہ مرتب ہوئے۔333 درحقیقت عالمگیر نامہ ایک درباری قصیدہ ہے جو خوشامد کرنے میں نفرت انگیز حد تک اور ملامت کرنے میں بیہودگی کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ اورنگزیب کی تعریف میں القاب ستائش کی بھرمار ہے اور اس کی بدقسمت بھائیوں کو نہ صرف برا بھلا کہا گیا ہے اور ہنسی اڑائی گئی ہے بلکہ ان کے نام تک بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ دارالشکوہ کو بار بار بے شکوہ (بے وقار) اور شجاع کو نہ شجاع کہا گیا ہے۔334 لیکن گیارہ سال کے بعد شہنشاہ نے تاریخ نویسی اس خیال کی بنیاد پر ممنوع کر دی کہ اپنے کارناموں کی زرق برق نمائش سے اندرونی پاکیزگی کی سعی کہیں بہتر ہے۔335

محمد ساقی مستعد خان: (۱٦۵۰ء۔۱۷۲۳ء)

مستعد خان، شاہ عالم بہادر شاہ اول کے وزیر عنایت اللہ خان کا منشی و کاتب تھا۔336 مستعد خان، خلد مکانی (اورنگزیب) کے عہد میں ان خدمات پر مامور رہا جن کی وجہ سے اس کو بروقت بادشاہ کا تقرب

حاصل رہا چنانچہ اس نے سرکاری کاغذات اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے اورنگزیب کے پورے دور کی سرکاری تاریخ مرتب کی۔ پہلے دس سال عالمگیر نامہ کی تلخیص ہیں۔337 بقیہ چہل سالہ واقعات خود لکھ کر تاریخ کو مکمل کیا۔ اورنگزیب کی ممانعت کے باعث اس نے دکن کی مہم کا ایک تلخیص بیان پوشیدہ طور سے لکھا جس میں اس مہم کی مصیبتوں کا ذرا بھی حوالہ دیئے بغیر محض قلعوں اور ممالک کی فتوحات کی تفصیلات لکھ دیں۔ اس کی تحریر کردہ ''مآثر عالمگیری'' اورنگزیب عالمگیر کے عہد کا ایک اہم اور مستند تاریخی ماخذ ہے جس میں اورنگزیب کے پچاس سالہ دورِ حکومت کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔338

مستعد خان باوجودیکہ بادشاہ کا حقیقی جانثار و شیدائی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ صدقِ دل سے بادشاہ کو مربی دارین و مرشد و ہادی خیال کرتا ہے۔ لیکن اس کی یہ عقیدت واقعات کو صحیح و بے کم و کاست بیان کرنے میں حارج و مانع نہیں ہوتی بلکہ بعض واقعات و حوادث کی اس خوبی سے تصویر کھینچتا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ مولف کی انشا پردازی بھی اعلیٰ و قابلِ تعریف ہے بلکہ طویل واقعات کو اختصار مگر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں مستعد خان کو جو ید طولیٰ حاصل ہے وہ مورخین کی گروہ میں کم نظر آتا ہے۔339

اورنگزیب کی شخصیت کو عام طور پر ایک متعصب بادشاہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس نے مذہبی تعصب کی بناء پر ہندوؤں کے ساتھ بڑی سختی کی۔ اکثر مغربی اور ہندو مورخین نے اس بات کو بڑے زور شور سے بیان کیا ہے لیکن مآثر عالمگیری سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤں کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا، اور ان کو وہ تمام حقوق دیئے جو غیر مسلم رعایا کو اسلامی ریاست میں دیئے جاتے ہیں۔340

اس تاریخ کو جو قطعاً صحت پر مبنی ہے مطالعہ کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بادشاہ اگر ایک طرف شرع و تقویٰ و طہارت کی مجسم تصویر ہے تو دوسری طرف عدل و انصاف کا بحرِ بیکراں و علم و بردباری کا چشمۂ رواں اور عزم و استقلال کا کوہِ غیر جنباں ہے جس کو کسی عالم میں بھی تزلزل نہیں پیدا ہوتا۔ اس تاریخ کو دیکھنے سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ عدل و انصاف، نیز غیر مسلم رعایا کے ساتھ حلم و بردباری اور

سلوک مربیانہ میں بادشاہ کو اس کے تمام اسلاف پر فوقیت حاصل ہے۔ خصوصاً دشمنوں اور باغیوں سے مقابلے میں جو عفو و تقصیر کے قابل قدر جذبات خلا مکان سے ظاہر ہوتے ہیں وہ قطعاً بے نذیر و بے مثال ہیں۔341

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طویل واقعات بہت ہی اختصار و جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اور اس میں عالمگیر کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔342

اورنگ زیب عالمگیر: (۱۶۱۸ء۔۱۷۰۷ء)

عالمگیر نے اپنے تیموری اسلاف کی روایات کا احیاء کرتے ہوئے اگرچہ اپنی سوانح حیات تو تحریر نہیں کی لیکن وہ اپنے خطوط اور فرامین خود لکھتا تھا۔ اس کا یہ تحریری سرمایہ تاریخ میں ''رقعات عالمگیری'' کے نام سے مشہور ہے۔ ان رقعات کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔343

عالمگیر دینی علوم کے علاوہ ادب کے دوسرے شعبوں سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ خود کئی زبانیں جانتا تھا۔ لیکن اس کا جوہر انشا پردازی، فارسی نثر میں نمایاں ہوا اور درجہ کمال تک پہنچا۔ عالمگیر کی مصروفیات یعنی ریاضات و عبادات کے علاوہ انتظام حکومت اور لڑائیوں میں ذاتی طور پر شرکت کو دیکھتے ہوئے اس نے جس تعداد میں خطوط لکھے ہیں وہ معمولی قابلیت کا انسان نہیں لکھ سکتا۔ تعداد کے علاوہ طرز نگارش کے لحاظ سے بھی اس کے مکاتیب نے ہر طبقہ کے ادباء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔344

اورنگ زیب کے خطوط گلہائے رنگارنگ کے بہترین مجموعہ ہیں۔ کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے تو کہیں سیاسی و معاشرتی واقعات پر تنقید، کہیں شوقِ وصال بے چین کیے ہوئے ہے۔ تو کبھی دردِ فراق نے مضطرب کر رکھا ہے۔ کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے تو کہیں کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے تو کہیں تنبیہ، اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر، کہیں عتاب ہے تو کہیں عنایت، کبھی گرمجوشی ہے تو کبھی

سرد مہری، بھی الزامات کی صفائی ہے تو نہیں وہ دوسرے کے خلاف شکایت۔ غرضیکہ وہ کونسی چیز ہے جو اس مجموعہ میں نہیں ہے۔ پھر وہ کونسی شے ہے جس میں حقیقت نگاری کے ساتھ کمالِ ادب کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔345

شبلی نعمانی لکھتے ہیں ''عالمگیر تیغ وقلم دونوں کا مالک تھا، اس کی انشاء پردازی کی داد مخالفوں نے دی ہے۔ اس کے رقعات باوجود اس کے واقعات کا ذخیرۂ قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ اور جغرافیائی اطلاعات کی یادداشت ہیں، تاہم ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو دلنشین ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں۔346

ہاشم علی خان: (۱۶۶۴ء۔۱۷۳۲ء)

خوافی خان، نظام الملک، اس مورخ کو غلطی سے خافی خان کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ خراسان کے قصبہ خواف کا رہنے والا تھا اور خوافی کہلاتا تھا۔347 محمد ہاشم خوافی خاں، انصاف پسند راست گو مورخ گزار ہے جس نے شاہان مغلیہ کے قریب رہ کر مغل دربار کے ظاہر و باطن کو بہ چشم خود دیکھا ہے۔ اس نے بڑی عرق ریزی اور تحقیق وجستجو کے بعد یہ اہم ترین تاریخ ''منتخب اللباب'' مرتب کی۔ یہ کتاب شاہان مغلیہ کے تاریخی مآخذ میں سے ایک اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ اس سے استفادہ کیے بغیر مغل تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کتاب میں مغل دور کے ڈھائی سو سالہ واقعات پر ایسا مستند مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے جس کی صداقت میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔348

خوافی خان اپنی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں ''میری یہ تصنیف سلاطین تیموریہ کے تذکرے پر مشتمل ہے جو دو سو سال سے ہندوستان پر حکمران ہیں اس کا آغاز فردوس مکانی، ماوراء النہر میں اپنی تخت نشینی کے بعد ۳۳ سال تک فرغانہ، سمرقند، بلخ، بخارا اور کابل پر حکمرانی کرتے رہے، اور ۹۳۲ھ میں انھوں نے ہندوستان بہشت نشاں میں علم جہانبانی بلند کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد رکھی، اس تاریخ کا اختتام، ابو

المظفر ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ کے عہد پر ہوتا ہے، جو دو سو سال (قمری) گزرنے پر تحت یموری کے چودھویں جانشین ہیں۔ انشاء اللہ اس سلسلہ عالیہ کی فرمانروائی قیامت تک مسلسل قائم رہے گی"۔349

ایک مورخ کے فرائض کی بابت خوافی خان کا نصب العین بہت اعلیٰ تھا۔ دیانتدار ہونا، فائدے کی توقع نہ رکھنا، ضرر کا خوف نہ کرنا، نہ کسی کا طرفدار ہونا، نہ کسی سے دشمنی برتنا، دوست اور اجنبی میں فرق نہ کرنا اور خلوص کے علاوہ کسی اور نیت سے نہ لکھنا، اس نے بڑے قابل ستائش انداز میں ان معلومات کا استعمال کیا جو سرکاری کاغذات (جو چند لوگ ہی دیکھ سکتے تھے لیکن جن تک اس کی رسائی تھی) سے اخذ کی گئی تھیں۔350 مصنف کا انداز بیان بڑی حد تک غیر جانبدار ہے اس لیے اس کی تاریخ میں بیشتر ایسے واقعات مل جاتے ہیں جن سے دوسرے مورخین نے صرف نظر کر لیا تھا، ان واقعات کی تاویل وتعبیر میں بعض مقامات پر مصنف کے نکتہ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے، مگر ان کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز کرنا کسی حال ممکن نہیں۔351

صمصام الدولہ: (۱۷۰۰ء۔۱۷۵۷ء)

شاہنواز خان شہید خوافی، المعروف صمصام الدولہ، عہد مغلیہ کا ایک مدبر اور مورخ، خاندان سادات سے تعلق رکھتا تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں یہ خاندان خواف (خراسان) سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا اور شہرت و ناموری حاصل کی۔ شاہنواز ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا اصل نام عبدالرزاق حسین تھا۔ عہد شباب میں اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) آ گیا اور نظام حیدر آباد آصف جاہ کا دیوان مقرر ہوا۔ جب آصف جاہ کے بیٹے ناصر جنگ نے باپ کے خلاف بغاوت کی تو شاہنواز خان نے اس کا ساتھ دیا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد اسے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ برطرفی کے بعد پانچ سال اس نے اپنی گرانقدر تاریخی تصنیف "مآثر الامراء" لکھنے میں صرف کیے۔352

صمصام الدولہ شاہنواز خان ملکی و سیاسی معاملات دسترس رکھنے کے علاوہ مروجہ علوم میں بھی کامل

دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی زبان و ادب اور انشاء پردازی میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ مآثر الامراء کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف میں بہارستان سخن جو شعر و ادب سے متعلق ہے اور موائد الفوائد ہیں جس میں مسائل دینیہ، مسائل شرعیہ اور آداب و اخلاق کے بیان کو مختصر طور پر بڑی بڑی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھا ہے۔353 لیکن ان کے جس شاہکار نے شہرت دوام حاصل کی وہ مآثر الامراء ہے۔ صمصام الدولہ ابھی اس کی جمع و ترتیب میں مشغول تھے کہ نواب آصف جاہ نے ان کو ان کے منصب پر بحال کر دیا اور یہ علمی و تاریخی کام نامکمل رہ گیا۔354

صمصام الدولہ کو فن تاریخ سے بھی خاص دلچسپی تھی ان کے ذاتی کتب خانے میں تاریخ کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ انھوں نے عہد اکبری سے عہد محمد شاہ تک کے ۲۳۰ امراء کے مفصل حالات مستند ماخذ کی مدد سے قلمبند کیے لیکن ریاست و حکومت کے کاموں کی مصروفیات کے باعث اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ ایک روز ان کے فرزند میر عبدالحیٔ نے ان سے مآثر امراء کے مکمل کرنے پر زور دیا تو انھوں نے کہا اس کو تم پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔ صمصام الدولہ کا یہ کہنا حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ ۱۱۷۱ھ میں صمصام الدولہ اپنے خلاف ہونے والی سازش کا شکار ہو کر شہید ہو گئے۔ ان کا مال و اسباب، گھر بار لٹ گیا اور کتب خانہ برباد ہو گیا۔355

صمصام الدولہ کی شہادت کے بعد ان کے ندیم و محب صادق میر علی آزاد بلگرامی نے ان کی قابل قدر کتاب مآثر الامراء کی تلاش کی ایک سال کے بعد اس کا سراغ ملا اور کتاب کے مختلف اجزاء ہاتھ لگے۔ درمیان سے اوراق غائب تھے۔ بہت محنت کے بعد ان منتشر اوراق کو مرتب کیا۔ ۱۱۷۲ھ (۱۷۶۸۔۶۹ء) میں میر عبدالحیٔ نے اپنے والد کے اس گرانقدر علمی سرمایہ پر نظر ثانی کی اور تاریخ کے مستند مآخذ کو سامنے رکھ کر اس کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا اور بارہ سال کی طویل مدت میں اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ ۱۷۸۰ء میں مآثر الامراء مکمل ہوئی۔356

اگر چہ امرائے سلطنت کے حالات و واقعات متعدد افراد نے بڑی عرق ریزی سے جمع کیے ہیں اور

مختلف تذکرے اور کتب بھی لی ہیں۔ جیسے محمد صادق ہمدانی کی تالیف ''طبقات شاہجہانی''، فرید بن معروف بھکری کی ''ذخیرۃ الخوانین'' اس کے علاوہ کیول رام کی ''تذکرۃ الامراء'' ہیں جو فارسی زبان میں تحریر کی گئیں۔ اس موضوع پر اردو زبان میں مولوی سعید احمد مارہروی کی ''امرائے ہنود'' جو ہندو امراء کے حالات پر مشتمل ہے، ان کتب میں سے صمصام الدولہ نے جس کتاب کو اپنا معاون بنایا وہ ''ذخیرۃ الخوانین'' تھی۔ جس میں اکبر سے شاہجہان تک کے عہد کے امراء کے حالات تحریر تھے۔ لیکن صمصام الدولہ کی مآثر الامراء کو مغل عہد کی تواریخ کتب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔357

مآثر الامراء ایک تذکرہ ہے جس میں ہندوستان کے مغل سلاطین کے عہد میں، یعنی اکبر کے عہد سے مصنف کے عہد تک جتنے مشہور امراء گزرے ہیں ان کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مغل حکومت کی تاریخ کے لیے یہ ایک قیمتی ماخذ ہے۔358

غلام حسین طباطبائی: (۱۱۴۵ھ)

بنگال کے مشہور عالم سید علم الدین کے پوتے اور سید ہدایت علی خان اسد جنگ، ناظم صوبہ بہار کے فرزند ہیں۔ غلام حسین طباطبائی کی ولادت ۱۱۴۰ھ میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی، فارسی کے بڑے انشاء پرداز تھے۔359 تاریخ پر ان کی معروف کتاب سیر المتاخرین ہے۔

یہ تاریخ ایک دیباچہ اور ۲ دفتروں میں تقسیم ہے۔ دیباچہ کوروں اور پانڈوں کے حالات سے شروع ہو کر اورنگ زیب کی وفات پر ختم ہو جاتا ہے۔ دفتر اوّل، جس میں عالمگیر کی وفات کے بعد سے ۱۱۹۵ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ اور دفتر دوم ان واقعات کا مجموعہ ہے، جو ہندوستان اور صوبہ بنگال میں ۱۱۵۱ھ و ۱۱۹۵ھ کے درمیان واقع ہوئے۔360

مصنف نے اس تاریخ کا کام صفر ۱۱۹۴ھ میں شروع کر کے رمضان ۱۱۹۵ھ میں ختم کر دیا۔ ''ملخص التواریخ'' اور ''زیدۃ التواریخ'' اسی سیر المتاخرین کے خلاصے ہیں۔ دیباچہ میں مصنف لکھتا ہے کہ منجملہ اور

کتابوں نے اس کا ماخذ ایک عام تاریخ بنی ہے۔ اس کا مصنف کوئی منشی ہے۔ مگر مصنف نے دیباچہ میں نہ اس منشی کا نام لکھا ہے اور نہ اس کی تاریخ کا۔ سیر المتاخرین کا حصہ اوّل ''خلاصۃ التواریخ'' مصنف سجان رائے کی بجنسہ نقل ہے۔361

طباطبائی کی تصنیف سیر المتاخرین، اورنگزیب عالمگیر کے جانشینوں کے عہد کے حالات پر مشتمل ہندوستان کی تاریخ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں بنگال میں انگریزوں کے عروج کا حال اور ان کی حکومت اور حکمت عملی کا ایک تنقیدی جائزہ بھی شامل ہے۔362 ''سیر المتاخرین'' کے دیباچے میں محمد اقبال سلیم گاہندری لکھتے ہیں:

> ''یہ زوال سلطنت مغلیہ کی انتہائی عبرتناک تاریخ ہے جس میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد پیش آنے والے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سادات بارھہ کی سازشوں سے مرہٹوں کی شورس اور سکھوں کی ابلہ فریبیوں تک ہزار ہا واقعات پیش آئے، اس عرصہ میں متعدد بادشاہ تخت نشین ہوئے، شمال سے جنوب تک بڑی ہنگامہ خیز لڑائیاں لڑی گئیں، تخت و تاج کے لیے سازشیں ہوئیں، غرض یہ کہ زوال سلطنت مغلیہ کی داستان ریشہ دوانیوں، قتل و غارت گری، خونریزی کی بڑی ہی دلخراش داستان ہے جو ۱۶۹۸ء سے ۱۷۷۵ء تک کے واقعات پر محیط ہے۔ چنانچہ سیر المتاخرین صحیح حقائق پر مبنی زوال مغلیہ کی قیمتی دستاویز ہے''۔363

ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں سیر المتاخرین ایک ایسی کڑی ہے جس کے بغیر اس زمانے کی تاریخ غیر مربوط اور نامکمل رہتی ہے''۔364

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں یعنی اورنگزیب کے جانشینوں کے دور میں ہونے والی تاریخ نویسی

میں جن تاریخ نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں ایک نام میر مبارک اللہ ہے جس کا لقب ارادت خان تھا۔ اس نے عالمگیر کی وفات سے فرخ سیر کے داخلہ دہلی تک سات سال کی تاریخ لکھی ہے۔365 دوسرا نام نعمت خاں عالی کا ہے جس نے شاہ عالم بہادر شاہ کی حکومت کے ابتدائی دو سال کی تاریخ لکھی۔366 تیسرا نام میر غلام علی خان کا ہے اس نے بھی شاہ عالم ثانی کے پہلے دو سال کی تاریخ لکھی جو ان واقعات پر مشتمل ہے جو شاہ عالم ثانی کو حصول سلطنت میں پیش آئے۔367 ان تاریخ نگاروں میں ایک نام ہندو مورخ منالال ولد بہادر سنگھ کا ہے جس نے تاریخ شاہ عالم لکھی جو شاہ عالم کے پورے عہد حکومت کا احاطہ کرتی ہے۔368

خیرالدین الہ آبادی۔ ''عبرت نامہ'' امیر تیمور سے شروع ہو کر شاہ عالم بادشاہ کے حالات پر یہ تاریخ ختم ہوتی تھی۔369

میر محمد قاسم۔ ''تاریخ بہادر شاہی یا عبرت نامہ''۔ اورنگزیب کی وفات سے شروع ہو کر امیر الامراء سید حسین علیخان کے قتل کے واقعہ پر ختم ہوئی ہے۔ تاریخِ ہند کا یہ عہد بجا طور پر قومی عہد کہلاتا ہے اس لیے عبرت نامہ موزوں نام ہے۔370

برطانوی ہندوستان میں تاریخ نویسی

برطانوی تاجروں کی سولہویں صدی میں ہندوستان آمد بغرض تجارت ہوئی تھی اٹھارویں صدی میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں رونما ہونے والے زوال نے برطانوی تاجروں کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ تجارتی اجارہ داری کے ساتھ ساتھ حاکمانہ اختیارات پر بھی قبضہ کر لیں، اقتدار اعلی پر قبضہ کے لیے جہاں ہندوستان میں پھیلنے والی طوائف الملوکی، انگریزوں کی ذہانت اور چالبازیاں سود مند ہوئیں وہاں ہندوستان کی تاریخ نے بھی انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انگریز ارکان حکومت نے نہ صرف دلچسپی اور سنجیدگی سے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا بلکہ خود بھی مختلف حوالوں سے ہندوستان کی تاریخ رقم کی اور تاریخ و ادب کی سرپرستی بھی کی۔

سرزمین دی پر بہت سے ایسے آثار قدیمہ تھے جو ہندوستان کا قابلِ قدر سرمایہ تھے۔ انگریز ان موضوعات پر کام کر رہے تھے۔ چونکہ ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے آثار قدیمہ پر کام کرنے کے لیے فارسی کا جاننا ضروری تھا اس لیے وہ ہندوستانی منشیوں کو ملازم رکھ کر فارسی تاریخوں سے استفادہ کرتے۔ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ انگریز افسروں نے ہندوستانی علماء کو ترغیب دے کر اس طرح کتابیں لکھوائیں۔371 جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر Jonathan scot کی ہدایت پر مرتضی حسین بلگرامی نے حدیقۃ الاقالیم لکھی General Kirk Patrick کے ایما پر وشنو پرشاد نے روہیلکھنڈ کے افغانوں پر تاریخ فیض بخش، Henry verisittart کے کہنے پر سلیم اللہ نے تاریخ بنگال اور غلام حسین طباطبائی نے warren Hastings کی ہدایت پر سیر المتاخرین تحریر کی، جس میں برصغیر کی قدیم تاریخ سے لے کر ۱۷۸۶ء تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اسے مغلوں کے عہد زوال کی مکمل تاریخ اور سائنسی طریقہ تاریخ نویسی کی موجودگی کی وجہ سے اس وقت کے تاریخی ادب میں نمایاں اہمیت دی جاتی ہے۔372

اٹھارویں صدی میں یورپ میں رومانیت پسند تحریک ابھری جس نے عہد روشن خیالی کی عقلیت پسندی کے مقابلے پر ایمان واحساسات، تخیلات و پراسراریت، جذبات ورومانیت پر زور دیا۔ برصغیر میں اولین طور پر روحانیت پسند رجحان کے حامی حلقہ کو ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی حمایت حاصل رہی جو کہ فارسی زبان کا ماہر اور ہندوستان کے ادب اور فنون میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا اس نے اپنے دور حکومت (۱۷۷۲۔۱۷۸۵) میں ہندوستان کی قدیم تاریخ، قوانین اور رسوم و رواج کے بارے میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا اس کے عہد میں نمایاں حیثیت اختیار کرنے والے William Jones اور Charless Wilkins ہیں۔ ولیم جونز اگرچہ کلکتہ میں جج کے منصب پر فائز تھا۔ ماہر لسانیات بھی تھا اسے سیاسی اور آریائی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ہندوستان میں اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور مہارت حاصل کی ۱۷۸۴ء میں اس نے وارن ہسٹنگز کے تعاون سے Asiatic Society of Bengal کی بنیاد رکھی۔

اور کالی داس کی شکنتلا کا سنسکرت سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔373

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے مغربی یورپ کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ اخلاقی اور عقلی اعتبار سے دنیا کے ہر زمانے سے بہتر تھا۔ آخری تجزیے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جدید سائنس کے عروج اور فکر انسانی و ٹیکنالوجی پر اس کے اثرات نے جدید یورپین تہذیب کو ایشیا اور یورپ کی ساری تہذیبوں میں ممتاز بنا دیا تھا حتی کہ سر ولیم جونس، اپنی اس شہرت کے باوجود کہ وہ ایشیاء کے لوگوں کے سب سے بڑے مداح ہیں یہ سمجھتے تھے کہ علوم سائنس میں وہ محض طفل مکتب تھے ان کے نزدیک یورپ حسین ملکہ تھا اور ایشیاء زیادہ سے زیادہ خادمہ۔374

سر ولیم جونس نے ہندو تمدن کو ہندوؤں کے خیالات کا مجموعہ بتا کر ظاہر کیا ہے کہ ہندو تمدن ایک بے مثل چیز ہے اور اس طرح مغرب کے لوگوں کے واسطے لفظ ہندوستان کو تقریباً ہندو ہندوستان کے مترادف کر دیا اس کے بعد ہندوستانی تاریخ کو باقاعدہ طور پر ہندو اور مسلمان تاریخ میں بانٹنے کا مسئلہ محض وقت کی بات رہ گئی۔375

Henry Thomas Colebroke کو ولیم جونس کا جانشین کہا جا سکتا ہے ۱۸۰۰ء میں اسے گورنر جنرل Wellesley نے فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۸۲۳ء میں اس نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس نے ہندوستان سے متعلق علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔376

James Mill وہ پہلا مورخ جس نے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کی باقاعدہ تقسیم کی اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ علم تمدن کا ایک نہایت سنجیدہ طالب علم ہے، اس نے ہندوؤں کی حکومت، قوانین، مذہب، ادب، فن تاریخ نگاری، فلسفہ، علوم سائنس و ٹیکنالوجی اخلاقیات، اور آداب و اطوار پر بحث کی، جان بوجھ کر مسلمانوں سے ان کا مقابلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تمدن کے ہر دائرے میں مسلمان ہندوؤں سے بہتر تھے۔377

Mill کی کتاب History of British India کو برطانیہ کے علمی حلقوں میں بہت پذیرائی

حاصل ہوئی۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۵۷ء تک اس کی پانچ اشاعتیں ہوئیں اور ایسٹ انڈیا کے ملازمین کے تربیتی کالج (Haile bury) کے تربیتی نصاب میں شامل رہی۔ درحقیقت مل کا ہندوستان کے بارے میں فلسفہ برطانوی نظریہ سامراجیت کے عین مطابق اور اس وقت کے مقبول فکری رجحان کا عکاس تھا۔ Mill کے برعکس Mountstuart Elphinston قومیت کو تمدن کا ماتحت نہیں بناتا۔ رومان پسندوں کی طرح وہ یہ سمجھتا تھا کہ قومی اکائیاں تمدن کے ڈھانچے میں رہ کر زیادہ لائق توجہ ہوئی ہیں اس نے زور دے کر کہا تھا کہ ہندوستان میں دس قومیں آباد ہیں جو آداب واطوار اور زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جیسے یورپ کی قومیں اور اس کے ساتھ اس عام یکسانیت کی بھی حامل ہیں جو مسیحی دنیا کی قوموں میں نظر آتی ہے۔378

برطانوی تاریخ نگاروں میں ایک اہم نام Henry Elliat کا بھی نظر آتا ہے۔ ایلیٹ نے برصغیر کی تاریخ پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی۔ اس کا تحقیقاتی کام عہد وسطیٰ کے تاریخی مخطوطات کی تلاش، انتخاب اور اس کے تراجم کر کے ترتیب دینے پر مشتمل ہے جس میں اس کا مددگار Dowson تھا۔ عہد وسطیٰ کے تاریخی ادب کا یہ انتخاب آٹھ جلدوں میں History of India as told by its own Historian کے عنوان سے شائع ہوا۔379 جبکہ Gibbin کی History of the Dicline and fall of Roman Empire ایک معنی میں جدید یورپین نشاۃ ثانیہ کے عہد زرین کے عام خیالات کا مظاہرہ تھی۔380

William Hunter کے تذکرے کے بغیر برطانوی تاریخ نگاروں کا جائزہ نامکمل ہوگا۔ Hunter کی کتاب The Indian Musalmans بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی شدید ناانصافیوں کو واضح کرتی ہے۔ Hunter لکھتا ہے ”مسلمان ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقۂ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو ان کی ذلت وخواری کا سبب بن گیا ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں

کو مبتلائے آفات کردیا ہے"۔381

ہندوستان کی عام تاریخ کے علاوہ برطانوی تاریخ نگاروں نے علاقائی تاریخ کی طرف بھی توجہ دی۔ جن علاقوں میں ان کی تقرریاں ہوئیں ان علاقوں کے تاریخی ادب، روایات، سرکاری گزیٹرز اور ریکارڈ وغیرہ کی مدد سے انہوں نے علاقائی تاریخ مرتب کی۔

(1)History of Marathas by James Grant Duff دو جلدوں پر مشتمل تھی۔
(2)Assam by Hamilton (3)History of Maysore by Mark Wilkes
(4)History of Sikh By Joseph Devey جس میں وہ سکھوں کو ایک علیحدہ قوم کا درجہ دیتا ہے۔382 جیمس ٹوڈ جیسے رومان پسندوں نے اپنی تحقیقات کے مضامین سے بہترین باتیں اخذ کر کے یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان میں اخلاقی شہنشائیت کی ضرورت نہیں ہے۔383

بیسویں صدی میں برطانوی مورخین میں سب سے نمایاں نام Wincent A. Smith کا ہے اس نے برصغیر کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں جیسے: (1)Early History of India, (2)History of Fine Arts in India and Ceylon اور (3)Akbar the great Mughal.۔384

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی فن تاریخ نگاری کے طریقوں اور رجحانوں نے ہندوستانی دور وسطیٰ کی برطانوی تحریر کے کردار پر اثر ڈالا۔ ابتدائی انیسویں صدی کے ہندوستان کے برطانوی مورخین گو بڑی حد تک ادبی ماخذوں پر بھروسہ کرتے تھے پھر بھی وہ انہیں سند کا نہیں مآخذ کا درجہ دیتے تھے۔ ان کا مقصد جیسا کہ ان میں سے ایک مصنف نے دوسرے سے کہا یہ تھا کہ "حقائق حاصل کرنا اور انہیں سوچ سمجھ کر ملانا تاکہ لغویات و بکواس سے بھری بکوروں اور لاف گزاف سے بھری تاریخ تیار کی جائے"۔ اس بات کا اعتراف کہ غیر تاریخی ادب، تاریخی دستاویزیں اور علم آثار قدیمہ تاریخی تحقیق کے لئے موزوں ہوتے ہیں، ابتدائی انیسویں صدی کے بہت سے برطانوی مورخوں نے کرلیا تھا۔385

برصغیر میں جدید تاریخ نگاری

انیسویں صدی عیسوی کے نصب آخر میں جب کہ ہندوستان پر تاج برطانیہ کے قبضہ مضبوط و مستحکم ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ اہل ہندوستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص مسلمانوں کو مزید غلامی کے شکنجے میں جکڑا گیا لیکن مسلمانوں نے نہ تو ذہنی طور پر اس شکست کو تسلیم کیا اور نہ حکومت وقت کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ ایک نئے عزم و حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اب انھوں نے اپنے حریف کے مقابلے کے لیے اسی کے ہتھیاروں سے اپنے آپ کو لیس کرنا شروع کیا۔ وہ ہتھیار تھا عصری علوم سے آگہی اور مہارت، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں ذہنی و فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہ نہ صرف غلامی کا طوق اتار کر پھینکنے میں کامیاب ہوئے بلکہ بدیسی حکمرانوں کو ان کے دیس واپس بھیج دیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جہاں علمی و سیاسی بیداری پیدا ہوئی وہاں مسلمانوں نے مذہبی طور پر سیرت نگاری، اسلامی تاریخ اور تاریخ ہند کا بھی بھرپور احیاء کیا۔ ان جدید تاریخ نگاروں میں، سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، ذکاء اللہ، سید امیر علی، چراغ علی، محمد حسین آزاد، عبدالرزاق کانپوری، عبدالحلیم شرر، سید علی بلگرامی، سید سلیمان ندوی، غلام رسول مہر، ہاشمی فرید آبادی، رئیس احمد جعفری، سعید احمد اکبر آبادی، شیخ محمد اکرام نمایاں ہیں۔

سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء)

ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بہت ہی پر آشوب تھا۔ حساس ذہن، معاملہ فہم اور دور اندیش ہندوستانیوں کے لیے یہ شدید ذہنی کرب کا زمانہ تھا۔ مغلوں کی عظمت وشوکت اور جاہ وجلال قصہ پارینہ بن کر تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔386 سرسید کے اسلاف شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور سلاطین مغلیہ کے ماتحت کئی مناسب پر فائز رہے۔387 سرسید کے بزرگوں میں سے سید محمد دوست کو دکن کا مورچہ ختم کرنے پر عالمگیر نے یکہ بہادر کے خطاب سے

نوازا تھا۔388

سرسید کے دادا سید ہادی کو عزیز الدین عالمگیر ثانی نے ۵۵-۱۷۵۴ء میں ''جواد علی خان'' اور ان کے بھائی سید مہدی کو ''قباد علی خان'' کے خطابات دیئے اور دونوں کو مناصب سے نوازا۔ شاہ عالم تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سید ہادی کے خطاب میں ''جواد الدولہ'' کا اضافہ کر کے انھیں عہدہ احتساب، صوبہ شاجہاں آباد پر فائز کر دیا، کچھ عرصہ بعد قضائے لشکر کے عہد پر فائز ہوئے۔ سرسید کے دادا کے بعد جب شاہ عالم ثانی نے یہ خطابات سید صاحب کے والد میر متقی کو پیش کیے تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میر متقی کے اکبر شاہ ثانی سے بہت گہرے مراسم تھے جب اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے تو میر متقی کا مغل دربار میں اثر و رسوخ زیادہ ہوگیا۔389 میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے۔ وہ شاہ غلام علی (جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور ہے) سے بیعت تھے۔390

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد بہت بڑے عالم تھے، ریاضی دانی اور موسیقی پر انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، علم ہئیت اور آلات رسد کے موضوعات پر انھوں نے متعدد رسالے لکھے تھے۔ خواجہ فرید الدین ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ سفیر بنا کر ایران بھیجے گئے۔ اکبر شاہ ثانی نے انھیں دوبارہ اپنا سفیر مقرر کیا اور ''دبیر الدولہ، امین الملک، مصلح جنگ'' کے خطابات سے نوازا۔391 مختصر یہ کہ سرسید کا خاندان، ہندوستان کے اشرافیہ میں شمار ہوتا تھا۔ مغل اور انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) دونوں کے انتہائی قریب اور ان کے وفاداروں میں شامل تھا۔ خود سرسید نے بھی حصول ملازمت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ترجیح دی تھی۔392

سرسید کی تعلیم دہلی کے روایتی انداز میں ہوئی تھی۔ لیکن ان میں آزادی سے سوچنے اور آگے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت تھی۔ وہ اعلیٰ کردار اور اخلاقی قوت کے مالک تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد سے جب کہ ان کی عمر اکیس سال تھی اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک جب ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا انھوں نے اگر کوئی کام کیا تو اس کا تعلق علم و ادب سے تھا۔ تاریخ اور ادب سے

ان کو گہری دلچسپی تھی۔393 اس کے ذریعے وہ اپنی قوم کے مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے۔ سرسید نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا ''جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے اس قدر نہ واقف ہیں کہ آئندہ راستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اسی سبب سے وہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا'' اس بیان میں سرسید نے واضح کردیا کہ وہ ماضی کی تاریکیوں سے مستقبل کے روشنی حاصل کرنے کے قائل تھے۔394

سرسید کو تاریخ سے اس وقت تک دلچسپی رہی جب تک ان کی زندگی میں ''جدید سیاسی دینیت کا رنگ کچھ زیادہ گہرا نہ ہوا۔ اگرچہ سید صاحب نے بعد میں دوسرے اشغال کے سبب تاریخ سے توجہ کو ہٹا لیا مگر ان کا ذہن تاریخ نگاری کے لیے حد درجہ موزوں تھا۔ تحقیق کا ذوق اور ماضی پر بے لاگ تبصرہ۔ اس کے لیے ان کی صلاحیتیں ہر طرح سازگار تھیں۔ انہوں نے گبن کی کتاب زوال سلطنت روما کا اردو ترجمہ کرایا۔ آثار الصنادید جو آثار و عمارات پر ایک عظیم کتاب ہے' ان کے تحقیقی شغف کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ انہوں نے پرانی تاریخی کتابوں کی تصحیح و اشاعت پر بھی توجہ صرف کی۔ آئینِ اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی اس کی مثالیں ہیں۔395

سرسید کی تاریخی تصانیف

جام جم:

تیس صفحات پر مشتمل فارسی میں یہ رسالہ ۱۸۴۰ء میں چھاپہ سنگ لیتھوگرافک، اکبرآباد سے شائع ہوا۔396 سرسید نے اس رسالہ میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ تک تمام (تینتالیس) مسلمان بادشاہوں کی مدت حکومت، سال تاج پوشی، سن پیدائش اور موت وغیرہ کا اندراج جدول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ دراصل تاریخ نگاری کی وہ شکل ہے جسے ''تقویم'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔397

جام جم اب تک دریافت شدہ سرسید کی پہلی تصنیف ہے اور اس حقیقت کا ثبوت ہے اگرچہ انھوں

نے بے شمار موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھے لیکن انہیں تاریخ میں خصوصی دلچسپی تھی۔ جام جم کا غالباً ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا تھا یہ رسالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزادی لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے مقالات سرسید کے حصہ شانزدھم (مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء) میں یہ رسالہ شامل کرلیا ہے۔398

آثار الصنادید:

اگرچہ سرسید نے مذہبی، تاریخی، علمی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت آثار الصنادید کو حاصل ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی یہ کتاب دلی کے آثار قدیمہ کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔399

سرسید کی تاریخ نگاری کے فن کے پیش نظر ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے بڑی جائز لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''عہد وسطیٰ کے مسلمان مورخین نے اردو کی اپنی کتابوں پر بھی ناگزیر اثر ڈالا ہے۔ سرسید احمد خان کی آثار الصنادید میں، جو اردو میں تاریخ کی اولین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، یہ اثر نمایاں ہے۔ اس میں ان کے اپنے شہر دہلی کے آثار قدیمہ کا بیان ہے اور ساتھ میں تاریخی عمارتوں کے نقشے ہیں۔ نیز ایک باب اس زمانے کے سماج اور طور طریق پر ہے۔ اگرچہ اس میں ماضی کی تاریخ کا سلسلہ وار بیان نہیں ملتا، لیکن اس کا تاریخی مقصد واضح ہے اور روزنامچہ کی تقسیم کے مطابق یہ اسی طرز پر لکھی گئی ہے جسے ''لوکل ہسٹری'' کہا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید کے دل میں اس کتاب کے لکھنے کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہو کہ اس سے چند برس پہلے ایک برطانوی افسر کی دعوت پر فارسی میں

آگرہ (اکبر آباد) کی روتاریخیں لکھی جا چکی ھیں۔ جس سم کی تفصیلات ان کتابوں میں ملتی ہیں اسی طرح کی تفصیلات تقریباً سب ہی فارسی تاریخوں میں درج کی جاتی تھیں، اور طبقات اکبری اس کی کھلی مثال ہے۔ سرسید کی اولین تصنیف بھی فارسی میں تھی، جب کہ آثار الصنادید اردو میں ہے''۔400

آثار الصنادید سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف تاریخ نگاری کے سلسلے میں تاریخ کے ماخذوں کی اہمیت سے خوب واقف تھا۔ آثار کی تیاری میں انھوں نے جن اصل مآخذ سے استفادہ کیا ان کی فہرست دی ہے اسی سے بجا طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ ضروری کتابوں سے استفادہ کر رہے تھے، انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، مخطوطوں کی شکل میں کتابیں اس حالت میں ملی ہوں گی کہ ان سے فائدہ اٹھانے میں دقت ہوئی ہوگی اور انھوں نے یہ منصوبہ بنالیا ہوگا کہ اگر زمانے نے کچھ فرصت دی تو ان میں سے کم از کم چند کتابوں کی اشاعت کا انتظام ضرور کریں گے۔ ۱۸۵۵ء میں انھوں نے ابو الفضل کی آئین اکبری کا پہلا لتھو گراف 401 ایڈیشن چھپوایا جس کا متن ان متنوں کے مقابلے کے بعد حاصل ہوا جو مہیا ہو سکے اور ان میں قابل قدر توضیحات کا اضافہ کیا گیا۔ محض یہی دو کتابیں (آثار الصنادید اور آئین اکبری) انھیں دنیا کے عالموں میں اونچا مقام دلوا سکتیں ہیں۔402

سلسلۃ الملوک:

سرسید نے ''آثار الصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن کے لیے دلی کے ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست مرتب کی تھی جنھوں نے گزشتہ پانچ ہزار سال میں دلی پر حکومت کی تھی، فہرست کا پہلا نام راجہ جدہشٹر اور آخری نام ملکہ وکٹوریہ کا ہے۔ دو سو دو فرمانرواؤں کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ انہتر صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں دلی کے شرف المطابع سے شائع ہوئی۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے یہ

رسالہ مقالات سرسید (حصہ ششم، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء) میں شامل کر لیا ہے۔ سلسلہ الملوک پہلے کتابی شکل میں شائع ہوا بعد میں اس میں ترمیم کر کے آثار الصنادید کے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا۔403

آئین اکبری کی تصحیح:

سرسید دلی میں منصف کے عہدے پر فائز تھے، تو دلی کے مشہور تاجر حاجی قطب الدین نے ان سے درخواست کی تھی کہ، اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اس کو چھپوا دوں، اور اس کے معاوضے میں آئین اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپے کے آپ کی نذر کر دوں گا۔ سرسید نے اپنے منصب کے باعث یہ درخواست قبول نہ کی، لیکن تاریخ سے دلچسپی کے باعث انھوں نے اس کام کی تکمیل کا فیصلہ کر لیا تھا۔404 چنانچہ جنوری ۱۸۵۵ء میں قیام بجنور کے دوران سرسید نے اس پر کام کیا اور متعدد نسخوں کے مدد سے آئین اکبری کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا۔ آئین اکبری میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ استعمال ہوئے تھے جن کا مطلب عام آدمی کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتا تھا۔ سید صاحب نے ان الفاظ کی تشریح کر کے اسے آسان فہم بنایا۔405 آئین اکبری کی پہلی جلد کے بعد دوسری جلد اشاعت کے مراحل میں تھی کہ غدر شروع ہو گیا اور مسودہ وغیرہ ضائع ہو گیا۔ پہلی اور تیسری جلدیں مطبع اسماعیل سے ۵۶۔۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔406

سرسید کی قرون وسطیٰ کی تاریخ سے دلچسپی صرف آئین اکبری کی تصحیح تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی تکمیل کے کچھ عرصہ بعد آپ نے اس عہد کی مزید دو معروف کتب ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء) اور تزک جہانگیری (۶۴۔۱۸۶۳ء) کی تدوین کر کے شائع کرایا۔407

تاریخ بجنور:

۱۸۵۵ء میں جب سرسید کو مستقل صدر امین کے عہدے پر تقرر کر کے بجنور بھیج دیا گیا یہاں آ کر سرسید کو معلوم ہوا کہ حکومت جن ضلعوں کی تاریخ لکھوانا چاہتی ہے ان میں ضلع بجنور بھی ہے، ابھی تک کسی مورخ کا انتظام نہیں ہوا تھا، کیونکہ یہ کام سرسید کے مزاج کے مطابق تھا اس لیے انھوں نے حامی بھر لی اور کام شروع کیا۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو کلکٹر نے اس کا مسودہ صدر بورڈ میں اگرہ بھیج دیا جہاں وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔408

تاریخ سرکشی بجنور:

اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید بجنور سے صدر الصدور کے عہدے پر ترقی پا کر مراد آباد آ گئے، یہیں انھوں نے ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھ کر شائع کی۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات، جو ضلع بجنور میں گزارے نہایت تفصیل سے تاریخ وار بیان کیے گئے ہیں۔409 مولانا حالی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں ''اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو، رعایت اور بے کم وکاست لکھے گئے ہیں جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائش اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بے وفائی کی تھی اور اس سے مقابلے کے ساتھ پیش آئے تھے، ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے۔410 اور جن لوگوں پر بغاوت کا الزام عائد نہیں ہوتا اس کی بھی تفصیل لکھ دی ہے۔411

تاریخ بجنور اور تاریخ سرکشی بجنور بجنور، علاقائی تاریخ کے حوالے سے نہ صرف بجنور کی تاریخ کی اہم دستاویزات ہیں بلکہ مؤخر الذکر کتاب میں سرسید کی تاریخ نگاری بحیثیت ایک غیر جانبدار مورخ کے تمام خوبیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ چنانچہ کتاب کے آغاز میں ہی اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''الٰہی مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو، اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر، کیونکہ طرفداری کی تاریخ لکھنا

ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے۔412

اسباب بغاوت ہند:

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد انگریز، ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے بڑی بے دردی سے بدلہ چکا رہے تھے جسے دیکھ کر سرسید کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔413 سرسید کے خیال میں انگریزوں نے بغاوت کے اسباب سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ ان کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی۔ وہ بھی بغاوت کے ارادے سے نہیں بلکہ محض جہالت اور مذہبی توہمات کے سبب تھی اسی بناء پر انھوں نے ''اسباب بغاوت ہند'' پر ایک رسالہ لکھا، جس میں رعایائے ہندوستان کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس بغاوت کے الزام سے بری قرار دیا، جس پر انگریزوں کی بدگمانی کا سارا دارو مدار تھا۔ سرسید نے نہایت جرأت کے ساتھ تمام حقائق بیان کیے اور انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔414 بقول حالی سرسید نے دو رکعتیں بطور نفل ادا کیں اور دعا مانگی اور اس وقت دو کم پانچ سو جلدوں کا پارسل ولایت روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔415

تصانیف سرسید کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہے اور حالی نے، حیات جاوید میں موضوعات کے اعتبار سے انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مذہبی، علمی، تاریخی،416 لیکن تقاضائے مقالہ کے پیش نظر سرسید کی تاریخی تصانیف کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

شبلی نعمانی: (۱۸۵۷ء۔۱۹۴۱ء)

شبلی بندول (اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حبیب اللہ ایک متمول تاجر، خوشحال زمیندار اور کامیاب وکیل تھے۔ سلسلہ نسب ایک نومسلم راجپوت شیخ سراج الدین (سابق سوراج سنگھ) تک پہنچتا

ہے۔ شبلی اپنے سب بھائیوں میں بڑے تھے۔417 خاندانی روایات کے مطابق شبلی کو بھی پڑھنے بٹھا دیا گیا اور ان کی تعلیم و تربیت اسی انداز میں شروع ہوئی جو اس زمانے کا دستور تھا۔ مولوی عبداللہ جیراجپوری نے ابتدائی تعلیم دی اور پھر مروجہ علوم خصوصاً عربی کی تعلیم کے لیے ان کے والد نے انھیں مشہور عالم محمد فاروق چریاکوٹی کے سپرد کر دیا۔ صاحب کمال استاد کا شاگرد بھی باکمال ثابت ہوا۔ شبلی خود بھی علم کے شائق تھے انھوں نے صرف سترہ برس کی عمر میں ظاہری علوم کی تکمیل کر لی۔ مولانا فاروق سے تحصیل علم کے بعد شبلی دیگر شہروں کے اصحاب علم کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوئے۔418

شبلی نے اپنی ابتدائی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا تھا ''علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروف علم تھے۔ اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے انہی علماء کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ مثلاً حدیث کے لیے مولانا احمد علی سہارن پوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن لاہور''۔419

پچیس سال کی عمر میں شبلی صحبت علمائے کے باعث مذہبی اثرات کو شدت سے قبول کر چکے تھے۔ انہی اثرات کے زیر اثر انھوں نے ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ سے وابستگی اختیار کی۔ سرسید کی جوہر شناس نگاہوں نے ہیرے کی قدر و قیمت کو پرکھتے ہوئے نہ صرف شبلی کو علی گڑھ کالج میں عربی کا استاد مقرر کیا بلکہ اپنی کوٹھی اور کتب خانے کے دروازے بھی ان کے لیے کھول دیئے، بقول شیخ محمد اکرام:

> ''شبلی علی گڑھ جانے سے پہلے ہی سرسید کے مداح تھے۔ اپنے والد کے ساتھ جب وہ پہلی بار سرسید سے ملے تو ان کی شان میں عربی میں لکھا ہوا قصیدہ بھی ساتھ لیتے گئے۔ علی گڑھ میں ان دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے، دونوں ایک دوسرے کے قدر دان بن گئے''۔420

شبلی نے سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا، گھنٹوں مطالعہ کیا کرتے تھے، کتب الماریوں کے سامنے کھڑے کھڑے کتابوں کی ورق گردانی کرتے کرتے تھک جاتے تو وہیں الماری کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر مطالعہ جاری رکھتے سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی۔ پھر کھانے کی میز پر سرسید کا ساتھ ہوتا تو دونوں میں نئے نئے مسائل پر گفتگو چھڑ جاتی یوں دونوں کا ایک دوسرے کے خیالات جاننے کا موقع ملتا۔421

شبلی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''تصانیف کا شوق ابتداً مجھے ان تاریخی تصانیف کو دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی تھیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھیں۔ جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا۔422 شبلی کے تلمیذ رشید سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کے وسعت مطالعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے''اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکا یک ان کا تاریخی ذوق ابھرتا ہے۔ جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانے میں عربی، تاریخ اور جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔423 گویا شبلی کو سرسید کے کتب خانے سے فائدہ پہنچا اور علی گڑھ کو شبلی کی ذات سے فیض حاصل ہوا کہ یہاں علم و تصنیف کا چرچا ہو گیا۔

قیام علی گڑھ کے دوران ہی مولانا پروفیسر آرنلڈ سے متعارف ہوئے جو انگریزی زبان کے عالم اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے شبلی کو جدید اصولوں سے آگاہ کیا۔424 آرنلڈ سے شبلی نے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین اور مغربی علماء کی تصانیف تک براہ راست رسائی حاصل کی۔ مولانا کا حصول علم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا جن کا نتیجہ ان متعدد تصانیف کی صورت میں ظاہر ہوا جو اردو زبان کا زیور ہیں۔ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کو صحیح طور پر اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا اور یہ الفاروق، المامون الغزالی، سیرۃ النبی ہی کا فیض ہے کہ ہندوستان کے خواندہ مسلمانوں کو ان عظیم الشان شخصیتوں سے خاصی واقفیت ہے۔ شعر العجم لکھ کر مولانا نے فارسی شاعری کا ذوق جو ہندوستان سے اٹھ رہا تھا اسے برقرار رکھنے کا سامان

کیا۔425 شبلی باکمال شخصیت اور ہمہ جہت علمی اصناف کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت نقاد، شاعر، ماہر علم الکلام، جید عالم سوانح نویس اور مورخ تھے۔426

تاریخ میں شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ انسانی (خصوصاً) تاریخ اسلامی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفۂ تاریخ کے واضح اور نقاد بھی تھے۔ انہوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے، وہ بلاشائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لیے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں شبلی نے یورپ کے مورخ اور فلسفیوں کے افکار سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور مسلمان علمائے تاریخ کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ پھر ان سب معلومات کی بناء پر مسلمانانِ ہند کی جدید قومی زندگی کے مصالح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک نئے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے۔427

تاریخ کے بارے میں شبلی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ''تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے۔ انہی ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور اسے فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ تاریخی نتائج منضبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے۔428 ڈاکٹر آفتاب احمد، شبلی کے نظریہ تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''قوموں کی تعمیر و تنظیم میں ان کی تاریخ ماضی کو بڑا دخل ہے۔ بدقسمتی سے اردو کا دامن اس سے بڑی حد تک خالی تھا۔ ہندوستان میں ابھی تک کوئی ابن خلدون پیدا نہیں ہوا تھا جو تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھاتا، اس کمی کو شبلی کی ذات نے پورا کیا، مسلمانوں کے عروج و ترقی کا سب سے زرین زمانہ عباسیوں کا عہد حکومت ہے۔ اس لیے مولانا نے سب سے پہلے تاریخ بنی عباس پر کام شروع کیا، لیکن جلد ہی محسوس ہوا کہ میدان بہت وسیع ہے اس لیے پوری تاریخ لکھنے کے بجائے ناموران اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ المامون اس سلسلے کی پہلی تصنیف ہے جو واقعی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے جس نے شبلی کو اردو مصنفین کی صف اول میں بٹھایا کوئی شبہ نہیں کہ شبلی اردو کا پہلا فلسفی مورخ ہے۔429

شبلی پر اگرچہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ باضابطہ مورخ نہیں تھے اور کسی مربوط تاریخ کے مصنف

بھی نہ تھے تاہم انھوں نے اسلامی مشاہیر کا تذکرہ اس طور لکھا ہے کہ اسباب وعلل کے ساتھ اسی زمانے کی کلچر کی پوری تصویر بڑی وضاحت سے سامنے آجاتی ہے۔شبلی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کا انداز تحریر مورخانہ نہیں بلکہ ادیبانہ ہے۔شبلی کا انشا پردازانہ ذہن تاریخ، سوانح، تذکرہ ہر جگہ موجود ہے۔ اسی باعث تاریخ نویسی میں تشبیہات، استعارے اور کنائے کی آمیزش لابدی تھی۔ مگر جہاں کہیں بھی ان کا قلم عظمت رفتہ کی یاد دلانے کے لیے رواں ہوا ہے تو اپنے ساتھ ماخذ، حوالہ جات، اور مصادر کا ایک سلسلہ رکھتا ہے۔ مبالغہ آرائی کا ملمع ان کے محقق ذہن نے کبھی قبول نہیں کیا انھوں نے اپنے قلم کی جنبش بڑے ادیبانہ انداز میں دکھائی ہے اور واقعات کو تجربے اور مشاہدے سے ثابت کیا ہے۔صرف قلم کے زور سے انھوں نے اپنے آپ کو مورخ منوانے کی کوشش نہیں کی۔430

شبلی کی تاریخی تصانیف

المامون:

شبلی کی تصنیف کردہ المامون درحقیقت بنو عباس کی تاریخ کا نچوڑ ہے جسے دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں مامون الرشید کے ابتدائی حالات زندگی اس کی تخت نشینی تک تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ پھر تخت نشینی کے بعد ہونے والی خانہ جنگیاں، عسکری فتوحات اور اس کی وفات تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں عہد مامونی کا نظم حکومت، مملکت کی خوشحالی، آمدنی کے ذرائع اور صرف واخراجات کی تفصیل، اصلاح عامہ کے لیے اقدامات اور حربی و دیوانی امور کی تفصیل اور اس عہد کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں بیان کی گئی ہیں جس سے اسی دور میں جاری معاشرتی و مذہبی رجحانات اور علمائے کرام سے اس کے تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

سرسید المامون کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''تاریخانہ واقعات لکھنے چنداں مشکل نہ تھے، مگر وہ باتیں جن کے لکھنے کا اس زمانے کے مورخوں کو بہت کم خیال تھا، یا اس کی قدر نہیں کرتے تھے اور اس زمانہ میں

انہی کی تلاش اور انہی کی قدر کی جاتی ہے تلاش کرلی مشکل تھی۔ مولانا نے اس میں پوری یا جہاں تک ممکن تھی کامیابی حاصل کی ہے۔ پہلے حصے میں انھوں نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی اور اختصار سے دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیوں کر خاندان بنی امیہ کو برباد کر کے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین اس کا بھائی مقتول ہوا اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک بن گیا۔431

الفاروق:

شبلی کے جس تاریخی شاہکار نے ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا وہ الفاروق ہے۔ جس پر برصغیر کے اردو ادب کو فخر ہے۔ یہ شبلی کی عمر بھر کی علمی ریاضت، تحقیق و جستجو کا نچوڑ، تاریخ و فلسفہ کا امتزاج اور انشاء پردازی کا آئینہ دار ہے۔ الفاروق ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد زمانہ آزادگی اور علالت میں لکھی گئی۔ اس کے لیے مصنف نہ صرف ہندوستان کے سارے ذخیرۂ معلومات کو استعمال کیا، بلکہ روم و شام و مصر کے کتب خانوں کی بھی سیر کی۔ جس قدر اس کتاب کی مشکلات زیادہ ہیں اس قدر اس میں غیر متوقع کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔432 سیرۃ النعمان کے دیباچے میں شبلی الفاروق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اس پر کوتاہ بینوں نے عجب عجب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر آ نہیں چکیں''۔433

المامون کی طرح الفاروق کو بھی شبلی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی ابتدائی زندگی قبل از اسلام، پھر بعد از اسلام سے ان کی خلافت تک، عہد خلافت میں ہونیوالی فتوحات اور شہادت تک کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں نظم مملکت کی جملہ تفصیلات کے علاوہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلم امہ کی اخلاقی تربیت اور ان کی فلاح کے لیے اقدامات کی تفصیل موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فاروق اعظم کے ذاتی احوال اور ازدواج و اولاد کا تفصیلی و تحقیقی ذکر موجود ہے۔

شبلی اپنے عہد کے واحد مورخ ہیں جو فن تاریخ نگاری کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے تھے۔ الفاروق کے دیباچے میں وہ مسلم فن تاریخ نگاری کے ابتدائی باکمال مورخوں جیسے ابن قتیبہ، واقدی، البلازری، طبری مسعودی کی بڑے پرزور انداز میں تعریفیں کرتے ہیں لیکن ان علمائے تاریخ کے بعد آنے والے پانچوں صدی کے تاریخ نگاروں کی ذہنی تنزلی کا شکوہ کرتے ہیں اور ابن خلدون کے علاوہ سب پر سخت تنقید کرتے ہیں ان کے بموجب ابن خلدون ہی وہ شخص تھا جس نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔434

الفاروق کے دیباچے میں شبلی نے فن تاریخ نگاری کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت دو باتوں پر نظر رکھنی چاہیے ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات درج کیے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر بات پر پورا زور دینا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ کوشش کرنی چاہیے کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔ شبلی کا کہنا ہے کہ ابتدائی تاریخوں میں یہ طریقہ کار نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدائی مورخین عام طور پر فلسفے اور عقلی علوم سے ناواقف تھے۔ وہ ان مختلف علوم سے بھی ناواقف تھے جن کا تعلق تاریخی واقعات سے ہوتا ہے اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر صورتوں میں سیاسی واقعات، مہمات، تہواروں اور حکومتوں کے عروج وزوال کو محض بیان کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک اور نکتہ جو انتہائی اہم ہے وہ یہ کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ عام طور پر کس حد تک لائق اعتبار ہیں؟ چنانچہ واقعات کی درستگی کو جانچنے کے لیے شبلی نے روایت اور درایت کے دو طریقوں کی اہمیت واضح کی ہے۔435

مختصر یہ کہ الفاروق، المامون تاریخی مقالات و مضامین اور کسی حد تک سیرۃ النبی، شبلی کی تاریخی کاوشوں کے شاہکار ہیں۔ اگرچہ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی اور مولانا روم کی سوانح عمری میں شبلی ایک سوانح نگار کی حیثیت سے بھی اپنے آپ کو منواتے ہیں۔ لیکن یہ سوانح عمریوں سے زیادہ ان علوم وفنون کی تاریخیں ہیں جن کی یہ شخصیات نمائندہ تھیں۔[436] شبلی کی تاریخ نگاری کا مجموعی جائزہ این میری شمل کے اس تبصرے سے لیا جاسکتا ہے وہ لکھتی ہیں:

> ''شبلی نعمانی اردو میں تاریخ نگاری کے بانی ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم فقہ میں ہوئی، ہندوستان سے باہر کے پہلے پہل کے سفر میں ان کی ملاقات دمشق میں نقشبندی بزرگ خالد الکردی سے ہوئی۔ یہ مظہر جان جاناں کی روایت پر عمل پیرا تھے اور انھوں نے سلطنت عثمانیہ میں سرہندی کے خیالات پھیلانے کے لیے کام کیا۔ شبلی نے قاہرہ میں محمد عبدہ سے بھی تعلقات استوار کیے ان کی تصانیف سے جہاں ان کے اپنے نظریات کا پتہ چلتا ہے وہاں تبحر علمی بھی جھلکتا ہے۔ انھیں امید تھی کہ اسلام کا احیاء خود اس کے اندر سے کیا جاسکتا ہے۔ سرسید کے برعکس انھوں نے مغربی اقدار کو اسلامی نقطہ نظر سے سمجھا۔ ان کے کئی پیروؤں میں ایک امام ابو حنیفہ تھے ان کے نام کا ایک حصہ ''نعمان'' شبلی نے اپنے نام کے ساتھ لگایا۔ انھیں عمر فاروق ایک مثالی حکمران نظر آئے تھے جن کے طرز حکومت میں مساوات اور انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ انھیں غزالی میں راسخ العقیدگی اور تصوف کا ایک امتزاج نظر آیا جو ان کے اپنے رویے کے بہت نزدیک تھا۔ انھوں نے مولانا رومی کو بھی اپنی تصنیفات کا موضوع بنایا اور رومی کی زندگی

> اوران کے کام پر قلم اٹھایا۔ ان کا آخری کام سیرۃ النبی ہے جسے وہ مکمل نہ کر سکے۔ جسے ان کے شاگرد سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ تاریخ نگار کے علاوہ شبلی شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فارسی شاعری میں ایک شوق انگیز شعر العجم لکھی۔437

شبلی نے ہندوستان کی تاریخ پر بہت کم لکھا ہے۔ کیونکہ وہ دنیائے اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے۔ المامون کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں ''ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ و تیموریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔438

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے باہر بہت کچھ لکھا۔ ان کا رسالہ ''اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'' وہ واحد کتاب ہے جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ پر لکھی اس کے علاوہ ان کے چند مضامین مثلاً گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، زیب النساء، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی سیاسی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر، الندوہ لکھنؤ سے شائع ہوئے۔439

شبلی کی عظمت اس میں ہے کہ ان میں تاریخی شعور بدرجہ اتم تھا اس کے ساتھ انھیں اس کی فکر تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مستند اور اصل ماخذ کی معقول، بے لاگ اور ایماندارانہ جانچ اور پرکھ کے بعد از سر نو لکھی جائے۔ انھوں نے کتابوں کو اسی نقطہ نظر سے جانچا ہے۔ اور پھر اس لحاظ سے ان کی اہمیت بتائی ہے کہ یہ کتابیں بنیادی ماخذ ہیں اور ان سے مغلوں کے تہذیبی کارناموں سے متعلق باوثوق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں معذرت اور مدافعت کی جھلکیاں ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے یہ تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ شبلی طبعاً مورخ تھے اور اپنی قوم کو تاریخ کا درس دینا چاہتے تھے۔440 شبلی کی تاریخی خدمات کا اعتراف ملکی و غیر ملکی دونوں سطح پر کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں انھیں حکومت ترکی کی جانب سے ''تمغہ مجیدی'' عطا کیا گیا۔ جبکہ ۱۸۹۴ء میں سرسید کی تحریک پر انھیں گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے ''شمس العلماء'' کا خطاب

ملا ۔441

مختصر یہ کہ مولانا شبلی نعمانی اردو ادب کے ایک بڑے اہم ستون تھے اور رہیں گے۔ ایم مہدی حسن نے انہیں سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ اردو کے عناصرِ خمسہ میں شمار کیا ہے۔ لٹریچر کی صف میں شبلی ان سب کے شانہ بشانہ ضرور کھڑے ہیں۔ مگر ان کے کینوس پر جتنے مختلف قسم اور متنوع رنگ کے مرقع ملتے ہیں وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دیتے۔442

سر سید ہوں یا شبلی ان کے ہم عصر دیگر نامور مورخین، تاریخ پر سب نے اتنا علمی سرمایہ محفوظ کر دیا ہے کہ اگر تفصیل اور دیانتداری کے ساتھ سب کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کی تاریخ نگاری پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے جو موضوع مقالہ کے پیش نظر غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگی۔ لہٰذا اب معاصرین سر سید و شبلی اور دبستان شبلی سے تعلق رکھنے والے تاریخ نگاروں کی تاریخ نویسی کا مختصر جائزہ پیش لیا جا رہا ہے۔

سید امیر علی: (م ۱۹۳۸ء)

سید امیر علی اپریل ۱۸۴۹ء کو بنگال کے ایک گاؤں چنسورہ میں پیدا ہوئے۔443 ان کا تعلق شیعہ خاندان (سادات) سے تھا جو خراساں سے نادر شاہ کے ساتھ آیا اور ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ اس خاندان کے افراد یکے بعد دیگر مغلوں، اودھ کے درباروں اور آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے منسلک رہے۔444 امیر علی کے والد سید سعادت علی ایک دور اندیش بزرگ تھے انھوں نے اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ۱۸۶۷ء میں امیر علی نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔445

۱۸۶۸ء میں سید امیر علی نے ہگلی کالج سے تاریخ و سیاسیات میں ایم اے کیا اور اس سال کے آخر میں وظیفے پر مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ قیام انگلستان کے دوران امیر علی نے کئی ایک سماجی، ثقافتی اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا اس دوران انھوں نے Critical Examination of the life and teaching of Muhammad. کے نام سے اپنی پہلی کتاب مکمل کی، جو ۱۸۷۳ء میں

لندن سے شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا ترجمہ "عقیدۃ الکلام فی احوال شارع الاسلام" کے نام سے سید ابوالحسن نے کیا جو ۱۸۸۵ء میں لکھنو سے شائع ہوا۔446

۱۸۷۳ء میں امیر علی بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان آئے اور اہم علمی و عدالتی عہدوں پر فائز ہوئے۔ سید امیر علی اپنی قابلیت اور دانشمندی کی وجہ سے ہندوستانی اور انگریز دونوں قوموں کے نزدیک واجب الاحترام تھے اور مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی ترقی و بیداری کی تدبیروں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔447 سید امیر علی کو اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کے مقبول نظریہ ساز یا سیاسی رہنما کی حیثیت کبھی حاصل نہیں رہی، لیکن اس کے باوجود ان کی پہلو دار شخصیت کئی اعتبار سے انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اہم رہی ہے۔ نظریہ ساز مورخ اور ماہر قانون کے طور پر انھوں نے جو خدمات سرانجام دیں ان کی بناء پر انھیں نظر انداز کرنا مشکل ہے۔448

سید امیر علی کی تاریخی تصانیف

روحِ اسلام (The Spirit of Islam):

بنیادی طور پر اگرچہ سید امیر علی قانون دان تھے لیکن ان کی شہرہ آفاق تصنیف اسپرٹ آف اسلام نے ان کو تاریخ نگاروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی، مولانا شبلی نعمانی اور گزشتہ صدی کے بعض دیگر مذہبی مصنفین کی طرح سید امیر علی نے بھی یہ کتاب عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کے رد میں لکھی تھی۔ تاہم ان کے پیش نظر مقصد یہ بھی تھا کہ اہل مغرب کو اسلامی تعلیمات اور رسول خدا کی زندگی سے روشناس کرائیں تا کہ اس عام جہالت اور تعصب کو ختم کیا جا سکے، جو مغرب میں اسلام کے بارے میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب شعوری طور پر مغربی قارئین کے لیے لکھی گئی تھی۔ ہندوستان میں اس کا بہت کم چرچا ہوا۔ اگرچہ بعض اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔449

اسپرٹ آف اسلام کا اردو میں ترجمہ ''روح اسلام'' کے نام سے محمد ہادی حسین نے کیا ہے۔ روح اسلام کے دیباچے میں امیر علی اس کی وجہ تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایک عالمی مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تاریخ پیش کروں، اور یہ بیان کروں کہ وہ کتنی سرعت سے دنیا میں پھیلا، اور اس نے کیوں کر ایک قلیل مدت میں کروڑوں انسانوں کے ضمیروں اور ذہنوں پر ایک حیرت انگیز غلبہ حاصل کرلیا۔ اسلام نے نوع انسانی کی نشوونما کو جو فروغ بخشا اس کا تو عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن اس نے نوع انسانی کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں یا تو تجاہل برتا جاتا ہے یا ان کی کماحقہ قدر دانی نہیں کی جاتی۔ اسی طرح اس کی عقلی اساس اور اس کے مقاصد غائی کو پوری طرح سمجھا نہیں جاتا، میں نے اسلام کا جو تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ تاریخ ادیان میں اس کا جو حقیقی مقام ہے اسے واضح کروں۔ اسلام کی عقلی اساس اور اس کے مقاصد غائی کا جو مرقع میں نے کھینچا ہے، وہ تو بالکل سرسری ہے، لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے مفید ہو، جو حال ہی میں واقع ہونے والے حادثہ عظیمہ کی پیدا کی ہوئی کشمکشوں کے بعد کسی ایسے تعمیری نظام عقائد کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جو نفس انسانی کو قرار بخش سکے۔ میری یہ بھی امید ہے کہ جو لوگ دین اسلام کے پیرو ہیں یہ جائزہ انھیں اپنے عقائد کی اساس سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں مدد دے گا''۔450

شارٹ ہسٹری آف سارسینز :(A Short History of Saracens):

سیر امیر علی کی یہ تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے خلافت راشدہ، بنوامیہ اور بنی عباسی کی خلافت کے حالات بغداد کی تباہی تک، اس طرح لکھے ہیں کہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اسلام کی معاشرتی، ذہنی اور اقتصادی ترقی بھی نظر آجاتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی لیکن جلد ہی اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوگیا۔ اس ترجمے سے پہلے تاریخ اسلام پر اردو میں کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی اس کی اشاعت نے دوسروں کا کام بہت آسان کر دیا۔ اب اس موضوع پر اردو میں کئی کتابیں ہیں۔451

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ہونے والے ترجمے کے مترجم، ترجمہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں ''سید امیر علی کی کتاب ''اے شارٹ ہسٹرف آف سارسینز'' کا شمار تاریخ کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب جنگوں اور فتوحات کے تذکروں تک محدود نہیں، بلکہ وہ ہر دور کے تہذیبی اور معاشی حالات کو بھی پیش کرتی ہے۔ عربوں نے مختلف علوم وفنون میں جو ترقی کی اسے وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم و نسق اور حکمرانی کے دوسرے شعبوں میں عربوں نے جو کچھ کہا اسے مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔452

سید امیر علی بااعتبار عقیدہ شیعہ تھے لیکن ان کی تصانیف میں اس رجحان مذہبی کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی عظمت کا ذکر بھی حضرت علیؓ کی تعریف کے برابر کرتے ہیں، انھوں نے رسول اللہؐ کی سیرت اور اسلام کے اصول وعقائد کی حمایت میں زور قلم صرف کیا کہ بڑے بڑے مغربی مصنفین عش عش کر گئے، اور اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں متعصب مغربیوں نے پھیلا رکھی تھیں ان سب کا مدلل قلع قمع کیا۔ یہ آغان خان، قائداعظم محمد علی جناح، راجہ صاحب محمود آباد اور امیر علی جیسے شیعہ بزرگوں کی روشن خیالی اور بے تعصبی ہی تھی جس نے شیعہ اور سنی فرقوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا اور سنی اکثریت کو کبھی ان حضرات کی اسلامی ہمدردی اور قومی رہنمائی سے انکار کی گنجائش پیدا نہ ہوئی۔453

معرکۃ الاراء تصانیف کے مصنف ہونے کے باوجود سید امیر علی کو برصغیر میں عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تصانیف تک یہاں کے صرف محدود تعلیم یافتہ طبقے کو رسائی حاصل تھی، بلاشبہ یہ طبقہ ان تصانیف میں پیش کیے گئے افکار سے بھی متاثر ہوا تھا، ان میں علامہ اقبال کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ اصل میں برصغیر میں مسلم فکر کے ارتقاء میں سید امیر علی کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے، کہ انھوں نے گزشتہ صدی کے وسط اور موجودہ صدی کے اوائل کی مقامی نو آبادیاتی صورت حال میں سید احمد خان، اور مولوی چراغ علی کے انداز فکر میں مثبت پہلو کا اضافہ کیا، اور ان کے پیش کردہ اسلام کے خاکے میں رنگ بھرنے کی سعی کی۔454

مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ کشمیری الاصل تھی۔ ان کے آباؤ اجداد کشمیر سے پنجاب آئے۔ ان کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں آباد ہوئے اور وہیں ملازم ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ والد کے انتقال کے وقت سب سے بڑے لڑکے چراغ علی کی عمر ۱۲ سال سے زائد نہ تھی۔ اس یتیمی کے سبب ان کی ابتدائی تعلیمی ناقص رہ گئی۔ اس پر حالات نے جلد ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کیا۔455

ڈاکٹر عبداللہ، چراغ علی کی تاریخ نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مولوی صاحب کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں اور باوجود یہ کہ ان کی انگریزی تعلیم باقاعدہ نہ ہوئی تھی مگر بڑے بڑے اہلِ علم ان کی انشاء پردازی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کے مضامین انگلستان کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور ان کی تصانیف پر انگریزی رسالوں میں نہایت عمدہ ریویو لکھے گئے۔ انہیں عبرانی اور سریانی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ اسی زبان دانی کا نتیجہ تھا کہ ان کے مضامین لسانیاتی تحقیق کے اعتبار سے بڑے محققانہ ہوتے تھے۔ جن میں تحقیق، وسعت نظر اور تبحر کی پوری پوری خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی

انگریزی کتب کے نام درج ذیل ہیں:

1- Critical Exposition of the Popular Jehad.

2- Proposed Political, Legal and Social

Reforms under Muslim Rule

(اس کا اردو ترجمہ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام [۱۹۱۰ء] کے نام سے مولانا عبدالحق نے کیا ہے)

-3 Muhammad- The True Prophet.458

عقیدہ کے لحاظ سے مولوی چراغ علی شیعہ تھے۔ مذہبی مسائل سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اس کی وجہ عیسائی پادریوں کی اپنے مذہب کی بے جا تبلیغ اور اسلامی تعلیمات اور ذات رسول کو ہدف تنقید بنانا تھا، جو دیگر مسلمانوں کی طرح مولوی چراغ علی کیلیے بھی باعث آزار تھا، اسی بناء پر ان کا جھکاؤ مرزا غلام احمد کی طرف تھا جو مسیحی علماء سے مناظروں کے باعث شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے غلام احمد کو ''براہین احمدیہ'' لکھنے میں مدد دی تھی۔459 تاریخی پس منظر میں رسول اللہ کے کار منصبی کے متعلق چراغ علی کا بیان بنیادی طور پر اسلام کے ہمدرد علمائے مغرب سر ہملٹن گب کی نگارشات سے مختلف نہیں ہے۔ وہ نبی کو اولاً ایک مصلح قرار دیتے ہیں، جس نے قدیم عربوں کے توہمات کی جگہ وحدانیت کو دے دی، عربوں اور دوسری اقوام کے اخلاقی معیار کو بلند کر دیا، اور تعداد ازدواج کو محدود کر کے عورتوں کے مقدر کو بہتر بنا دیا۔ غلامی کی حوصلہ شکنی کی اور بچوں کے قتل کا انسداد کیا۔460

چراغ علی کی تاریخی تصانیف

عثمانی سلطنت اور دیگر مسلمان ریاستوں میں مجوزہ سیاسی، قانونی اور سماجی اصلاحات:

یہ مولوی چراغ علی کی شاہکار تصنیف ہے جو ۱۸۸۳ء میں بمبئی سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔461 اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان کے نام معنون ہے۔ اس میں مولوی چراغ علی صاحب

نے نہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام دنیاوی ترقی میں مانع نہیں ہے، بلکہ وہ طریقے بھی بتائے ہیں جن سے احکام اسلامی کے تابع رہ کر مسلمان ہر طرح کی دنیوی ترقی کر سکتے ہیں، اور ترکی کی تاریخ سے ثابت کیا کہ مسلمان ترکوں کے زمانے میں رواداری سیاسی اور سوشل اصلاح، کی وہ صورتیں جاری رہی ہیں جو کسی اور حکومت نے روانہیں رکھیں۔462

تعلیقات:

یہ رسالہ مولوی چراغ علی نے پادری عماد الدین کی ''تاریخ محمدؐ'' کے مآخذ کے رد میں ''تعلیقات'' عنوان سے لکھا، جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ کے حالات زندگی انتہائی ناقابل اعتبار ہیں، اور عیسائیوں کی مذہبی کتب بھی مصدقہ نہیں۔ تعلیقات کے علاوہ انھوں نے چند دیگر رسائل اور مضامین بھی ایسے ہی موضوعات پر رقم کیے تھے۔463

قدیم قوموں کی مختصر تاریخ:

عیسائی مورخین نے قرآن کریم میں بیان کردہ امم بائدہ پر جو اعتراضات کیے، مولوی چراغ علی اس کتاب میں ان اقوام کے وجود کو قدیم یونانی و عبرانی کتب کے حوالوں کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ اپنے استدلال میں ایسی کتب سے حوالے نقل کیے ہیں جن کا سنہ تالیف، قبل از نزول قرآن تھا۔464

محمد حسین آزاد: (۱۸۳۲ء۔۱۹۱۰ء)

آزاد اردو زبان کے مایہ ناز انشاء پرداز تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے سب سے پہلا اردو اخبار جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ اس جنگ میں مولوی باقر گرفتار کر کے شہید کر دیئے گئے۔ محمد حسین آزاد نے شیخ

ابراہیم ذوق کی سرپرستی میں تربیت حاصل کی اور اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیے۔465 اپنی کتاب آب حیات کے دیباچے میں آزاد لکھتے ہیں:

''تعجب ہوا کہ ایک بچہ شاہ جہانی بازار میں پھرتا ملے۔ شعراء اسے اٹھالیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہوجائے۔ اس حالت میں اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ہر عہد میں اس کے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں جن کی وقت بوقت کی تربیت اور اصلاح نے اس بچہ کو انگلی پکڑ کر قدم قدم آگے بڑھایا اور رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچایا جو آج حاصل ہے''۔466

۱۸۸۹ء میں مولانا محمد حسین آزاد کو ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر شمس العلماء کا خطاب ملا۔467

آزاد کی تاریخی تصانیف

اردو میں ادبی تاریخ کی ابتدا آزاد نے کی۔ ان کے زمانے تک ادبی تاریخ اگر تھی تو صرف تذکرہ نگاری کی صورت میں تھی۔ مگر کون نہیں جانتا کہ تذکرہ نگاری، ادبی تاریخ کی قائم مقام نہیں بن سکتی۔ آزاد نے پرانی تذکرہ نویسی کے انداز بدل دیے، اور ''آبِ حیات'' لکھ کر اردو شاعری کی پہلی بااصول تاریخ لکھی۔ انہوں نے آنے والے ادبی مورخوں کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی قندیل روشن کردی جس سے آج تک مسافرانِ راہِ تحقیق مستفید ہورہے ہیں۔468

اگرچہ اردو ادب میں اردو اور فارسی میں آزاد کی متعدد تصانیف ہیں جیسے اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب، قصص الہند، آب حیات، نیرنگ خیال (دو حصے) سخندان فارس، نگارستان (فارسی)،

جانورستان، مجموعہ نظم آزاد، نصیحت کی کرن، پھول فند فارسی، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، جامع القواعد، قواعد اردو اور سپاک ونماک۔469

تاریخ کے موضوع پر آزاد کی کتاب ''دربار اکبری'' ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کی نامور شخصیات میں سے اکبر اور اس کے درباری، ابوالفضل اور فیض، آزاد کی پسندیدہ شخصیات تھے۔ جن کے بیان واقعات میں آزاد خود کو غیر جانبدارانہ رکھ سکے، اور ان کی تعریف وتوصیف کے پل باندھ دیئے، اور اپنی اس کمزوری کا احساس کرتے ہوئے دربار اکبری میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق و عادات، سلطنت کے دستور و آدات اور اس عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں۔470

اگر تاریخ نویسی کی بڑی خوبی مصروفیت اور خودفراموشی ہے تو آزاد کی متواتر اور اکثر اوقات مضحکہ خیز مداخلت اور رازدارانہ انکشافات اور توجیحات اس تصنیف کی تاریخی اہمیت کے منافی ہیں۔ کتاب کا کارآمد حصہ وہ ہے جہاں آزاد دینِ الٰہی پر تنقید کرتے ہوئے اکبر کے علمائے سو کی تنگ نظری، ابلہ فریبی، تفرقہ پردازی اور باہمی حسد وعداوت اور ریاکاری سے نفرت پر محمول کرتے ہیں۔471

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں آزاد کے یہاں تاریخ اپنی برہنہ سچائیوں اور سائنسی برہنگی کے باوجود تخیل کے ایسے رنگین لباس میں ملبوس ہو کر منظر عام پر آتی ہے کہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کو حقیقت کہیں یا افسانہ۔472

ڈاکٹر سید علی بلگرامی:

سید علی بلگرامی کا خاندان اودھ کے ان خاندانوں میں شمار ہوتا ہے جو صدیوں سے اس علاقہ میں صاحب ارشاد و ہدایت اور مرجع خاص و عام رہے ہیں۔473 سید علی بلگرامی ۱۸۵۱ء کو پیدا ہوئے۔ آٹھ برس

کی عمر سے ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چودہ سال کی عمر تک فارسی، عربی کی تکمیل میں مصروف رہے۔ ۱۸۶۶ء سے انگریزی پڑھنا شروع کی۔ ۱۸۷۴ء کو کلکتہ یونیورسٹی سے بے اے کی سند حاصل کی۔ ۱۸۷۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔474 آپ ہندوستان کے علمی حلقے میں عالم ہفت زبان کے لقب سے مشہور تھے۔475 ۱۹۰۷ءمیں بیرسٹری کا امتحان دیا، اسی سال ہندوستان واپس آئے۔ وطن واپس آ کر علیگڑھ کالج کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ اس زمانے میں کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز زیرِ غور تھی۔ اس کارروائی میں ڈاکٹر سید علی نے بھی شرکت کی اور ترتیب و تنظیم کا ذمہ لے لیا۔476

سروقار الامراء بہادر477 کے عہد وزارت میں ڈاکٹر سید علی کی سعی و کوشش سے حکومت نے ''سررشتۂ علوم وفنون'' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ تالیف و ترجمہ کے ذریعے اردو میں علمی کتابیں مہیا کی جائیں۔478 اور ان کو خاص خاص اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا جائے۔ اس سررشتۂ کے نگراں ڈاکٹر سید علی مقرر ہوئے۔ چار سال بعد مولانا شبلی کو یہ خدمت ملی، ڈاکٹر سید علی کی نگرانی میں شائع ہونے والی کتب سیاحت نامہ موسیو ٹیورنیر، سیاحت نامہ موسیو تھیونو، تاریخ دکن جلد اول و دوم اور نظام اکبری ہیں۔479

ڈاکٹر سید علی نے اگرچہ مختلف موضوعات پر متعدد کتب تالیف و ترجمہ کی ہیں۔ لیکن تاریخ پر ان کی کتابیں کلیلہ دمنہ، تمدن عرب، یہ گستاؤ لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ لیکن یہ پوری کتاب کا ترجمہ نہیں، بلکہ اس کے ایک جزو ''قبل از اسلام عرب کے حالات'' کا ترجمہ کیا ہے۔ تمدن ہند، یہ بھی لیبان کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔480 فرانسیسی زبان پر دسترس کے باعث ڈاکٹر سید علی نے، فرانسیسی تاریخ نگاروں کی اسلامی و جنوبی ایشیائی تاریخ پر کی گئی تحقیق کو، اردو زبان میں منتقل کر کے سرمایۂ تاریخ میں بہترین اور معیاری اضافہ کیا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ:

مولوی ذکاء اللہ کا شمار معاصرین سرسید وشبلی میں ہوتا ہے۔ وسیع المطالعہ شخصیت ہونے کے باعث تاریخ اور تاریخ سے متعلقہ علوم، اخلاقیات اور فلسفہ کے علاوہ سائنس اور ریاضی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ نگار کی حیثیت سے تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ تاریخ پر ان کی تصانیف:

تاریخ ہند (ہندوستان کی قدیم تاریخ)

تاریخ عہد انگلشیہ (چار جلدیں)

تاریخ عروج انگلشیہ ہند

آئین قیصری

کرزن نامہ

محاربات عظیم

سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ طومار نویس ہونے کی وجہ سے کوئی مبحث انہوں نے نہیں چھوڑا۔[481]

تاریخ وسوانح کے متعلق مولوی ذکاء اللہ کی اہم تصنیف تاریخِ ہندوستان ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ تاریخ ہندوستان کے طویل مقدمہ سے مولوی ذکاء اللہ کے مورخانہ تصورات کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ان سے کوئی اہم سلسلہ فکر قائم نہیں ہوتا۔ البتہ یہ خلش ضرور پائی جاتی ہے کہ شبلی کی طرح مولوی ذکاء اللہ بھی مغرب کی تاریخ نگاری کے بعض پہلوؤں کے گلہ مند ہیں۔[482]

تاریخِ ہندوستان کی دس جلدوں میں مجموعی طور پر عرب و ہند کے تعلقات قبل از اسلام اور بعد از اسلام، ہندوستان میں مختلف خاندانوں (سلاطین دہلی وسلاطین مغلیہ) کے تحت اسلامی حکومت کا قیام، اور ہندوؤں پر اس حکومت کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تعمیرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

تاریخ ہندوستان کے مقدمہ میں مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ کے لغوی معنی، تاریخ کی تاریخ، عہد

اسلامی میں تاریخ کی ابتداء، ضیاء الدین برنی کا نظریہ تاریخ، ابن خلدون کا نظریہ تاریخ، ابن خلدون کے نظریہ تاریخ پر اہل یورپ کے اعتراضات، یورپی مورخین کی تاریخ نویسی کا مختصر جائزہ، تاریخ کے مختلف رخ، اور علم تاریخ کے فوائد اور قدیم تاریخ و حال کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لے کر تاریخ کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اس کے علاوہ انھوں نے ''مورخ کے کیا اغراض ہونی چاہئیں'' کے عنوان سے تاریخ نویسی کے اصولوں کا جائزہ بھی پیش کیا ہے جن سے مقالے کے باب سوم ''تاریخ نویسی کے فنی اصول'' میں استفادہ کیا گیا ہے۔

عبدالحلیم شرر:

عبدالحلیم شرر کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ بنیادی طور پر شرر کی دلچسپی و رجحان ناول نگاری کا میدان ہے، لیکن انھوں نے تاریخ کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھا کر بحثیت مورخ یا تاریخ نگار کے بھی اپنی شخصیت کو منوایا ہے۔ شرر کی تاریخ نگاری میں بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ شخصیات کے حوالے سے انھوں نے حضرت علیؓ کے حالات زندگی پر ''ابوالحسنین'' جب کہ حضرت ابوبکرؓ کے حالات و واقعات ''ثانی اثنین'' کے نام سے قلمبند کیے ہیں۔ ان کے علاوہ ''سکنیہ بنت حسین''، ابوبکر شبلی، جان عالم، حسن بن صباح، جنید بغدادی اور حزن اختر کے علاوہ دیگر تاریخی کتب، تاریخ اسلام، تاریخ خلافت، مغلیہ میں اسلام، گزشتہ لکھنو، معتزلہ اور ان کا عروج و زوال، تاریخ سندھ، تاریخ عزیز مصر، تاریخ مسیح و مسیحت، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، عصر قدیم ایام العرب اور فردوس بریں تحریر کی ہیں۔

شرر در حقیقت کیونکہ ناول نگار ہیں، اس لیے چند تاریخی موضوعات کو انھوں نے نہایت خوبصورتی سے تاریخی ناول کے روپ میں ڈھال دیا ہے، جیسے ''فردوس بریں'' جو حسن بن صباح کی تحریک سے متعلق ہے۔ اس میں حسن بن صباح کی طلسماتی جنت، فدائیوں کی حقیقت اور منگولوں کے ہاتھوں تحریک صباحیہ کے آخری امام رکن الدین خورشاہ کے خاتمہ کا حال تحریر کیا ہے۔ فردوس بریں کے دیباچہ میں شرر لکھتے ہیں

میرے خیال میں یہ بالکل کی طرح کا سب سے اچھوتا اور نہایت ہی دلچسپ ناول ہے۔ اس قسم کے تاریخی واقعات میں سے بہت کم ہیں جن پر کسی انگریزی مصنف نے کوئی ناول نہ تیار کر دیا ہو، مگر حیرت ہے کہ جہاں تک میں دریافت کر سکا یہ واقعات ان مغربی متجسوں کے قلم سے بچے ہوئے ہیں۔483

اس موقع پر مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ جو کوئی اس ناول کو پڑھے گا اس کی آنکھوں کے سامنے ایسے عجیب وغریب واقعات گزریں گے، جو اسے نہایت حیرت ناک معلوم ہوں گے اور وہ انتہا سے زیادہ متحیر ہو کر بار بار اپنے دل میں کہے گا کہ یہ تاریخی حالات ہیں یا محض خیالی کارنامے، اور واقعی جس گروہ یا مذہب کے حالات ان صفحات پر دکھائے گئے ہیں، اس کی تاریخ موجودہ زمانے میں ایک افسانے ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کے پیرو اب بھی موجود ہیں، مگر ان میں نہ وہ قدیم شان باقی ہے، اور نہ وہ پرانا فدائیت کا جوش۔484

شرر کا دوسرا تاریخی ناول ''ایام العرب'' ہے جس میں قبل از اسلام عربوں کی بے باک معاشرتی و ادبی زندگی کی نہایت خوبصورتی کے ساتھ منظر کشی کی ہے۔ شرر نے جتنے تاریخی ناول لکھے ہیں وہ بقول شخصے ''مٹی کا پہاڑ سہی لیکن آپ کو اسے ٹھٹھک کر دیکھنا ضرور پڑے گا''۔ اس مٹی کے پہاڑ یا ڈھیر میں سے درجن بھر کتابیں نکالی جا سکتی ہیں۔ جو اب بھی کسی نہ کسی وجہ سے دلچسپ ہیں۔485

ناول نگاری کی خوبی سے قطع نظر شرر کی تاریخی کتب، تاریخ اسلام، تاریخ سندھ، صقلیہ میں اسلام، عصر قدیم اور دیگر کتب، تاریخی تحقیقی مواد کے اعتبار سے شرر کو اپنے معاصر مورخین کی صف میں کھڑا کرتی ہیں۔ عصر قدیم میں شرر نے قبل مسیح کی عالمی تاریخ کو سن عیسوی سے واضح کرنے کے بجائے سنہ محمدی سے واضح کیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں شرر لکھتے ہیں ''ہم مسلمانوں کو یقین ہے کہ جتنا تاریخی ذخیرہ ہم نے فراہم کیا ہے اور ہمارے پاس ہے کسی کے پاس نہیں۔ یہ بے شک سچ ہے مگر اب تو ہم بالکل بصیرت ہو گئے ہیں۔

ہمارا جو کچھ اصلی ذخیرہ ہے عربی میں ہے، اور ہندوستان کے مسلمان روز بروز عربی سے بے بہرہ

ہوتے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے تھوڑی بہت واقفیت جو اپنے موجودہ لٹریچر سے ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ زمانہ اسلام تک محدود ہے۔ اسلام سے بیشتر کے حالات سے ہم بالکل نا آشنا ہیں اور سخت ضرورت ہے کہ اردو میں ایک ایسی مختصر اور جامع تاریخ مدون ہو جائے جس میں حضرت رسالت سے پہلے اور قدیم الایام کے حالات و واقعات اس طرح سلجھا کے بیان کیے گئے ہوں کہ اس کے مطالعہ سے تاریخ کا صحیح خاکہ اردو دان طلبہ کے دماغ میں محفوظ ہو جائے۔486

اس بارے میں مجھے انگریزی زبان کی لیڈ مارکسی ہسٹری بہت پسند آئی، جس میں تخلیق عالم کے آغاز سے لے کر اسرائیلیوں، مصریوں، اسیریا، بابل اور ایرانیوں، رومیوں، اور اہل قرطاجنہ کے حالات نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بلحاظ زمانہ مرتب کر کے بیان کر دیے ہیں، لیکن اس کا بعینہ ترجمہ کر دینا مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اس میں بہت سی باتیں مسلمانوں کے مذاق و معتقدات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ میں نے بجائے ترجمہ کر دینے کے اس بات کو مناسب سمجھا کہ واقعات اپنی زبان میں لے لیے جائیں، مگر ترتیب وہی قائم رکھی جائے۔ میں نے اس میں اتنی اور زیادتی کی کہ سنین کا حساب بجائے اس کے کہ ولادت مسیح سے رکھا جائے، ولادت مصطفیٰ سے قائم کیا تاکہ ہر واقعہ کی نسبت سے مسلمانوں کو بخوبی ذہن نشین ہو سکے کہ آغاز اسلام سے کتنے دنوں بیشتر تھا۔487

سنہ محمدی کی روایت اگرچہ دیگر مورخین کی روش سے ہٹ کر اختیار کی گئی ہے۔ لیکن شرر کے معاصرین اور بعد میں آنے والے جدید تاریخ نگاروں نے اس کی پیروی نہیں کی، اس طرح سنہ محمدی کی روایت کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

سید سلیمان ندوی: (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء)

سید سلیمان ندوی جیسی جامع کمالات شخصیات کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کمالات میں آئمہ سلف کی یادگار تھے۔ جملہ اسلامی علوم پر ان کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی اور بعض علوم میں امامت و

اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اور ان میں اپنی کی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگاریں چھوڑیں، جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہیں گی۔ ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور ان کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع، گوناگوں اتنا تنوع ہے، کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ ایک مضمون میں اس کو سمیٹنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔488

سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی کے شاگرد رشید تھے۔ لہٰذا تاریخ نگاری میں انھوں نے اپنے استاد کے اصولوں کی پیروی کی ہے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن ان کے ذوقِ مطالعہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''مطالعہ کی کثرت اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو نے ان کے دماغ کو مستقل کتب خانہ اور متنوع علمی معلومات کا خزانہ بنا دیا تھا، ان کی کوئی گفتگو علمی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی۔ ان کی صحبت سے جو قیمتی معلومات حاصل ہو جاتی تھیں، وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں''۔489

سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی احکام وتعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی اور اسلامی علوم وفنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی وتمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آجاتی ہے۔ اور ان کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور ہیں نقطہ ہے''۔490

سید سلیمان کی اہم تصانیف سیرۃ النبی491 خطبات مدارس، سیرت عائشہ، ارض القرآن، خیام، حیات شبلی، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں مضامین لکھے۔ علم وادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہے جو تشنہ تحقیق رہا ہو۔492

شبلی نعمانی نے اپنے شاگردوں کی صورت میں اعظم گڑھ میں جس دبستان کی بنیاد رکھی تھی اس

دبستان نے "ماہنامہ معارف" کے ذریعے نہ صرف اپنے استاد کے شمع وسیل کے دیئے کو روشن رکھا ہوا ہے بلکہ ہر شاگرد اپنی جگہ ایسا روشن ستارہ ہے جس نے اپنی انفرادی علمی کاوشوں سے تاریخ کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ بتقاضائے اختصار ان شخصیات اور ان کی تصنیفات کا انتہائی مختصر جائزہ پیش نظر ہے۔

صباح الدین عبدالرحمٰن:

ان کی تاریخ کا موضوع ہندوستان ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر ان کی تصانیف بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ، بزم صوفیہ، عظمت رفتہ کی سچی کہانیاں، ہندوستان کے ازمنہ، وسطیٰ کی ایک جھلک، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں۔

شاہ معین الدین ندوی: ان کی معروف کتب، تاریخ اسلام (چار جلدیں)، سیرۃ الصحابہ، اسلام اور عربی تمدن، عرب کی موجودہ حکومتیں، تابعین، مہاجرینِ جلد دوم ہیں۔

مولانا ابوظفر ندوی: ان کی شائع شدہ تصانیف تاریخ سندھ اور گجرات کی تمدنی تاریخ۔

عبدالسلام ندوی: ان کی معروف تصانیف حکمائے اسلام، فقرائے اسلام، سیرت عمر بن عبدالعزیز، اسوہ صحابہ (دو جلدیں)، اسوہ صحابیات، امام رازی، اور انقلاب اہم ہیں۔

ریاست علی ندوی: تاریخِ مغلیہ حصہ اول، تاریخ اندلس حصہ اول ہیں۔

ڈاکٹر محمد عزیز: سلطنت عثمانیہ کی تاریخ پر ان کی دو جلدیں "تاریخ دولت عثمانیہ" کے نام سے شائع ہوئیں۔

سید نجیب اشرف ندوی: مقدمہ رقعات عالمگیری اور رقعات عالمگیری جلد اول ان کی معروف تصانیف ہیں۔

مولانا ابوالحسنات ندوی: ان کی مشہور کتاب ''ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں'' ہیں۔

مذکورہ بالا تاریخ نگاروں کی تمام کتب دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔

شاگردان شبلی کے علاوہ بھی تاریخ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم تاریخ کی ترویج و اشاعت میں ہندوستان کی سرزمین جتنی زرخیز واقع ہوئی ہے شاید ہی کوئی دوسرا خطہ اس کی ہمسری کر سکے۔ اگر دیانتداری کے ساتھ صرف بیسویں صدی کے جدید مورخین کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ جب کہ موضوع مقالہ اختصار کا متقاضی ہے۔ لیکن کسی بھی تاریخ نگار کی تاریخی تحقیق کو نظر انداز کرنا بھی ناانصافی اور علمی خیانت ہے۔ لہٰذا مختصراً ان جدید مورخین اور ان کی تاریخ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

غلام رسول مہر:

غلام رسول مہر بیسویں صدی کے نمایاں مورخین ہیں۔ انھوں نے بیشتر اوقات اپنے موضوع کو صرف تاریخ و سوانح تک ہی محدود رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں رطب و یابس کی کمی اور تحقیقی نکات کی فراوانی ملتی ہے۔ انھوں نے تالیفات و تراجم کا قابل ذکر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ مہر تاریخ نگاری کے بنیادی اصولوں سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی تاریخ نویسی میں ایک طرح کی محققانہ شان نظر آتی ہے۔ وہ حالات و واقعات کی تحقیق و تنقیح کے وقت اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اس موضوع پر جتنے ماٰخذ ہیں ان

سے استفادہ کیا جائے اور تحقیق کے سلسلے میں اس بات کا خاص التزام رکھتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں معاملے کے تمام پہلو اجاگر ہو جائیں۔493

مہر کی تاریخی تصانیف میں سیرت سید احمد شہید، سرگزشتِ مجاہدین، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین، (تحریک مجاہدین پر یہ ایک کتاب کے تین حصے ہیں)، جماعت مجاہدین (یہ بھی تحریکِ مجاہدین کے سلسلے کی کڑی ہے)، تاریخ سندھ، انسائیکلوپیڈیا تاریخِ عالم (تین جلدوں میں ہے)، عرب اور اہل عرب (یہ انگریزی کتاب "The Arabian Painsula" کا اردو ترجمہ ہے)، سو تاریخی واقعات، جزیرا اور اسلام، سکندر اعظم، تاریخ لبنان، قسطنطنیہ، ترکی، بلجیم، اٹلی، تاریخ تہذیب اور جنگ عظیم یہ تمام کتب انگریزی کتابوں کے تراجم ہیں۔ جنھیں مہر نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اردو میں منتقل کر کے اردو دان طبقہ کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

اکبر شاہ خان نجیب آبادی:

اکبر شاہ خان بھی اردو کے کثیر التصانیف تاریخ نگار ہیں۔ ان کی معروف تاریخی تصانیف میں تاریخ اسلام (تین جلدیں)، حجت اسلام، جنگ انگورا تو اریخ نجیب آباد، مسلمان اندلس میں، نظام سلطنت، مقدمہ تاریخ ہند، آئینہ حقیقت نما، ویدا اور اس کی تاریخی قدامت خان جہاں لودھی اور قول حق ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی کا لاحقہ مولد و منشائے طفولیت اور اولین سعید تعلیمی کی نسبت سے لگاتے تھے۔ جب کہ ان کا آبادی وطن مراد آباد تھا۔

مولانا سعید احمد نے پنجاب یونیورسٹی سے السنۂ شرقیہ کے امتحان پاس کیے بعد ازاں انگریزی زبان

کی تحصیل کی طرف توجہ دی اور گریجویشن کیا۔ اس کے بعد والد کی خواہش کے احترام میں دارالعلوم دیو بند میں داخل ہو گئے، جہاں اس عہد کے نامور علمائے حدیث وفقہ، مشاہیر اساتذائے ادب وفلسفہ ومنطق اور اصحاب علوم وفنون جمع تھے۔ یہ مولانا کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا بشیر احمد عثمانی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، میاں اصغر حسین اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علمائے عصر اور فضلائے دہر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ایم اے کیا اور اسی کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کے صدر اور فیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین بھی مقرر ہوئے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد چار سال تک ہمدرد دہلی کے ایک تحقیقی ادارے سے وابستہ رہے۔

اس کے علاوہ وہ کینیڈا کی میکنیکل یونیورسٹی کالی کٹ یونیورسٹی انڈیا، ایک بار پھر علی گڑھ سے وابستگی کے بعد دارالعلوم دیو بند کی شیخ الہند اکادمی سے بحیثیت ڈائریکٹر منسلک ہو گئے۔ تاریخ پر ان علمی وتحقیقی تصانیف صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین، غلامان اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت، مسلمانوں کا عروج و زوال، فہم قرآن، خطبات اقبال پر ایک نظر اور ہندوستان کی شرعی حیثیت خاص شہرت کی حامل ہیں۔[496]

ہاشمی فرید آبادی:

ہاشمی فرید آبادی کا شمار ان تاریخ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترجمہ وتالیف کے ذریعے مخزن تاریخ میں گراں مایہ اضافہ کیا ہے۔ ان کی تاریخی کتب میں تاریخ ہند (چار جلدوں میں شائع ہوئیں، یہ نصابی کتب ہیں)، مآثر لاہور، تاریخ فرشتہ پر نوٹس، تاریخ مسلمانانِ پاک و بھارت (دو جلدیں)، دکن کی تاریخی کہانیاں، پنجاہ سالہ تاریخ، انجمن ترقی اردو کے علاوہ تراجم جن میں ہسپانیہ سرزمین اور باشندے، یورپ کا عصر جدید، مشاہیر یونان وروما، بلاد فلسطین و شام، تاریخ سلطنت روما، تاریخ یونان، دنیائے

اسلام، تاریخ افغانستان، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، تاریخ دولت عثمانیہ، سرزمین اور باشندے، جغرافیہ عالم، یونان قدیم، تاریخ شاہان مغلیہ، سیاسیات اسلامی، قدیم علوم وجدید تہذیب شامل ہیں۔

ڈاکٹر ظفر اقبال (استاد شعبہ اردو۔ جامعہ کراچی)، ہاشمی فرید آبادی کی تاریخ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''وہ عموماً ثانوی ماخذ کو بطور اول ماخذ استعمال کرتے ہیں، ان کے استنباط نتائج میں عجلت جگہ جگہ نمایاں ہے۔ انھوں نے تاریخ نویسی کے مخصوص اسلوب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بعض کتب میں ایسی زبان اور انداز اختیار کیا ہے جو تاریخ کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔ غرض کہ سہل انگاری اور زورنویسی نے مل کر، ایک فاضل اجل کو درجہ دوم کا مصنف بنا دیا۔ ان کی نمائندہ کتاب ''مآثر لاہور'' قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حقیقی معنوں میں دادِ تحقیق دی ہے۔497

مولانا ابوالحسن علی ندوی:۔ (۱۹۱۴ء۔..........)

ابوالحسن علی ندوی عالمِ دین، مفکر، مصنف، محقق اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں تفسیر وادبِ عربی کے استاد کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور ایک عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم کے عہدے پر فائز رہے اور لکھنؤ میں ایک ''مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام'' بھی قائم کی۔

مولانا ندوی ہند و بیرونِ ہند کے نمایاں علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں سے مختلف حیثیتوں میں گہرا ربط وتعلق رکھتے ہیں۔ آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ (شبلی اکیڈمی) اور صوبہ اترپردیش (بھارت) کی دینی تعلیم کی کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ بیرونِ ہند مجمع علمی دمشق کے رکن، اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ کی مجلسِ اعلیٰ کے رکن، رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے بانی رکن، عرب یونیورسٹیوں کی فیڈریشن کی مجلسِ انتظامیہ (مراکش) اور اردن کی مجمع علمی کے رکن رہے۔ آپ کی بعض عربی تصانیف کئی عرب ممالک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اسلام کے لیے آپ کی بیش بہا خدمات کے اعتراف کے طور پر

''شاہ فیصل ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

اگر چہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کثیر التصانیف مصنف ہیں لیکن تاریخ و سیرت پر آپ کی کتابیں النبی الخاتم، نبی رحمت، تاریخ دعوت و عزیمت، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش اور پرانے چراغ ہیں۔498

مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ شیخ محمد اکرام، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، محمد دین فوق اور رئیس احمد جعفری جیسے ممتاز تاریخ نویس ہیں جنھوں نے تالیف و تراجم کے انبوہ کثیر سے تاریخ اسلام و تاریخ پاک و ہند کے مختلف گوشوں کو قلمبند کر کے ذخیرہ تاریخ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ان میں شیخ محمد اکرام کی آب کوثر، رود کوثر اور موج کوثر ہندوستان کی تاریخ پر سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب کہ خواجہ حسن نظامی کی بیگمات کے آنسو، دلی کی سزا، بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، سیر دہلی، تاریخ رسول، محرم نامہ اور دیگر کتب بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔ محمد دین فوق صاحب جی کثیر التصانیف تاریخ نگار ہیں، لیکن ان کی تاریخ بنگال، غازی محمد بن قاسم، تاریخ حریت اسلام، لاہور عہد مغلیہ میں اور تاریخ کا روشن پہلو نمایاں ہیں۔

جناب رئیس احمد جعفری، تاریخ نگاری کے میدان کی ہمہ صفت شخصیت ہیں، بے شمار تصانیف کے مصنف ہیں، تراجم کی تعداد الگ ہے۔ (دیگر تاریخ نگاروں کی طرح ان کی بھی صرف اہم کتب کے نام تحریر کیے جا رہے ہیں)۔ ان کی اہم تاریخی تصانیف، تاریخ دولت فاطمیہ، تاریخ اسلام، اورنگزیب عالمگیر، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، واجد علی شاہ اور ان کا عہد اور ہارون الرشید ہیں جب کہ مقالات و مضامین کی تعداد اس کے سوا ہے۔499 ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سابق رئیس الجامعہ کراچی، کی پاک و ہند کی تاریخ پر ۳ کتابیں، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ اور جدوجہد پاکستان، علماء میدانِ سیاست میں نہ صرف پاک و ہند کے موضوع پر سند کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ جامعہ کراچی کے شعبہ فنون کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ یہ تینوں کتابیں انگریزی میں ہیں500 اور ان کا ترجمہ ہلال احمد زبیری نے کیا ہے۔

بیسویں صدی میں جدید تاریخ نگاری کے مختصر جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا شخصیات

تاریخ نگاری کے کسی خاص اسلوب کے موجد نہیں ہیں۔ انھوں نے درجہ اول کے ماخذ کے علاوہ درجہ دوم و سوم کے ماخذ کو بھی اپنی تاریخ نگاری کی بنیاد بنایا ہے۔ اصل موضوع تحقیق ان مورخین کی تاریخ نگاری کے جائزہ میں مولانا موجودی کی تاریخ نگاری کا فنی و تجزیاتی مطالعہ اور بحیثیت مورخ ان کے مقام کا تعین کرنا ہے۔ جس پر اگلے باب میں سیر حاصل بحث کی جائے گی۔

حوالہ جات

-1 سرہندی، یحییٰ بن احمد، (اکتوبر ۱۹۸۶ء)، تاریخ مبارک شاہی طبع دوم، مترجم آفتاب اصغر، ڈاکٹر، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ۲۱

-2 الزبیدی، محمد مرتضیٰ الحسینی، (۱۹۹۳ء)، تاج العروس من جواہر القاموس، طبع ثانی، کویت: مطبعۃ حکومت الکویت، الجز سابع

-3 ابی الفضل جمال الدین محمد، علامہ۔ (۱۳۶۳ق) لسان العرب، ایران: نشر ادب، الحوزۃ، قم، المجلد ثالث

-4 السخاوی، شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن۔ (جون ۱۹۶۸ء) تاریخ التاریخ موسم بہ الاعلان بالتوبیخ، ترجمہ، محمد یوسف، ڈاکٹر، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ص ۲۷

-5 مصباح اللغات، (۱۹۵۶ء) مرتب، ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی، طبع دوم، دہلی: مکتبہ برہان

-6 مختار الصحاح، (۱۹۱۱ء) شیخ الامام محمد بن ابی بکر عبدالقادر رازی، الطبعۃ الثالثہ، مصر: بالمطبعۃ الامیریہ

-7 الفرائد الدریۃ فی اللغتین العربیہ والانکلیزیہ (۱۹۵۱ء)، Catholic Press Beirut

-8 القاموس العصری، (۱۹۶۱ء)، تالیف الیاس الطون الیاس طبعۃ الثانیہ عشرہ، القاہرہ: المطبعۃ العصریہ انکلیزی۔ عربی

-9 نور اللغات، (مارچ ۱۹۵۹ء)، مؤلف نور الحسن منیر، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، جلد دوم

-10 اردو لغت، ۱۹۸۲، کراچی، ترقی اردو بورڈ، جلد چہارم

-11 فیروز اللغات، ۲۰۰۵ء، مرتبہ مولوی فیروز الدین، لاہور: کراچی: راولپنڈی: فیروز سنز

-12 Oxford Advance Learner Dictionary, Oxford University Press. 7th edition

-13 دائرہ معارف اسلامیہ، (۱۹۹۳ء)، طبع اوّل لاہور: دانشگاہ پنجاب، ص ۳۸۔۳۹

-14 الاعلان بالتوبیخ۔ص ۲۷، محولہ بالا

-15 حسن اللغات، (س ن)، لاہور: اورینٹل بک سوسائٹی

-16 فرہنگ جدید فارسی، رازی، (تاریخ نشر ۱۳۴۴)، تالیف، پوری، محمود سعید، کتاب فروش، فخر رازی

-17 الاعلان بالتوبیخ، ص ۲۹، محولہ بالا

-18 ابن خلدون، عبدالرحمٰن، س ن، مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ، یوسفی، مولانا سعد حسن خان، کراچی: میر محمد کتب خانہ، مرکز علم و ادب، ص ۳۴

-19 اردو لغت جلد چہارم، فیروز اللغات اور نور اللغات (محولہ بالا) میں بھی یہی اصطلاح بیان کی گئی ہے۔

-20 خورشید احمد، پروفیسر۔ دسمبر (۱۹۷۲ء) ادبیات مودودی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، ص ۶۰۔۲۵۹

-21 کشاف اصطلاحات تاریخ۔ (۱۹۸۸ء) مرتب قریشی، محمد صدیق، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ص ۱۵۷

-22 Toynbee, Arnold.J. 1964. Astudy of History, London. Oxford University Press. P.255, Vol.12

-23 Beeker,Carl. (1960), Every man his on historian, London. Oxford University Press. P.233

-24 Cartyle, Thomas, (1966), Herod, Hero worship and Heroic in History, London: Luzacd Company Ltd. P.27

-25 Kent, Shermon, (1941) Wriling History, First edition New york, P.1

-26 سپنگلر، اولوالڈ Spengler, Dswald (۲۰۰۵ء) زوال مغرب، ترجمہ عبداللہ طارق، لاہور: نگارشات پبلشرز، ص ۱۰۱

27- کشاف اصطلاحات تاریخ، ص ۱۵۷

28- کومیجر، ہنری اسٹیل، (۲۰۰۲ء)، مطالعہ تاریخ، ترجمہ، غلام رسول مہر، لاہور: فکشن ہاؤس، ص ۹

29- ایضاً، ص ۱۱

30- Jaffer,S.M. (1961), History of History, Peshawer, Sadiq sons, P.2

31- مقدمہ ابنِ خلدون، ص ۵۴، محولہ بالا

32- برنی، ضیاء الدین۔ ۱۹۹۱ء، تاریخ فیروز شاہی، اشاعت دوم، مترجم ڈاکٹر معین الحق، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ۱۶

33- جیراجپوری، اسلم۔ (جون ۱۹۹۵ء) تاریخ الامت، نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، ص ۱۱

34- تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۱، محولہ بالا

35- تاریخِ الامت، ص ۱۱۔ محولہ بالا

36- ایضاً، ص ۱۲

37- المسعودی، ابوالحسن بن حسین۔ (نومبر ۱۹۸۵ء) مروج الذہب و معاون الجواہر، ایڈیشن اوّل، ترجمہ کوکب شادانی، پروفیسر، کراچی: نفیس اکیڈمی ص ۳۴

38- ابنِ اثیر، عزالدین علی۔ (۱۹۹۳ء) الکامل فی التاریخ، الطبعۃ الرابعۃ، لبنان: لدار احیاء التراث العربی، ص ۱۷، الجلد اوّل

39- الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۲۱، محولہ بالا

40- ایضاً، ص ۳۰

41- ایضاً، ص ۳۳

42- ایضاً، ص ۳۶

43- بدایونی، عبدالقادر۔ (س ن)، ترجمہ، فاروقی، محمود احمد، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۳۰

44- برنی ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۷

45- ایضاً

46- ایضاً، ص ۱۸

47- History of History, P.7

48- Mohan, R.P, (1970) philosphy of History, New york, P.3

49- بٹالوی، سجان رائے، (دسمبر ۱۹۶۶ء)، خلاصۃ التواریخ، بار اوّل، مترجم، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی،
لاہور: مرکزی اردو بورڈ ص ۱

50- فرشتہ، محمد قاسم، (۱۹۹۸ء)، دیباچہ تاریخ فرشتہ، عبدالحئی، خواجہ، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ص ۱۵

51- مطالعہ تاریخ، ص ۱۳، محولہ بالا

52- مقدمہ ابن خلدون، ص ۳۴

53- ایضاً

54- مسعودی، ابوالحسن، (۱۳۴۶ھ)، مروج الذھب، مصر، مطبعۃ البہیہ قاہرہ، ص ۳، الجز اوّل

55- الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۴۰

56- ایضاً، ص ۱۵۵

57- ایضاً، ص ۱۵۴

58- ایضاً

59- ایضاً

60- ایضاً

61- ایضاً

62- ایضاً

-63 ایضاً،ص ۱۶۰

-64 برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۹

-65 ایضاً،ص ۱۹۔۲۰

-66 ایضاً،۲۰

-67 مطالعۂ تاریخ،ص ۳۸۔۳۹

-68 باری۔ (۱۹۴۹ء)، تاریخ کا مطالعہ، اشاعت اوّل، لاہور: مکتبۂ اردو، ص ۱۳

-69 تاریخِ فرشتہ،ص ۱۵

-70 احسان الحق، ڈاکٹر محمد۔ (دسمبر ۲۰۰۱ء)، تاریخ نویسی اور اہلِ اسلام، اکبر شاہ خان نجیب آبادی، لاہور: ناشران و تاجران کتب، مقدمہ، جلد اوّل

-71 ایضاً

-72 شبلی نعمانی، (۱۹۸۹ء)، الفاروق، طبع سوم، اعظم گڑھ: معارف، ص ۲۵، حصہ اوّل

-73 ایضاً،ص ۲۶

-74 ایضاً،ص ۲۷

-75 ایضاً،ص ۲۸

-76 ایضاً

-77 ایضاً،ص ۳۱

-78 ایضاً،ص ۳۵

-79 مطالعہ تاریخ،ص ۳۰

-80 مفتی زین العابدین شہابی انتظام اللہ۔ (فروری ۱۹۹۱ء) تاریخ ملّت، لاہور: ادارہ اسلامیات، ص ۲۴، جلد اوّل

-81 الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۷۹

-82 ایضاً، ص ۱۵۳

-83 مبارک علی، ڈاکٹر، (۲۰۰۲ء) تاریخ شناسی، لاہور: فکشن ہاؤس

-84 اشرف، کے ایم۔ (۲۰۰۲ء)، تاریخ اور مؤرخ، ترتیب، ڈاکٹر مبارک علی، لاہور: فکشن ہاؤس، ص

-85 تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۳

-86 کومیجر، ہنری اسٹیل۔ مطالعۂ تاریخ، ص ۱۲

-87 باری، تاریخ کا مطالعہ، ص ۱۳

-88 مبارک علی، ڈاکٹر۔ (۲۰۰۵ء)، تاریخ اور فلسفہ تاریخ طبع پنجم، لاہور: فکشن ہاؤس، ص ۶۴

-89 تاریخ شناسی، ص ۱۲، محولہ بالا

-90 ایضاً، ص ۱۱

-91 تاریخ اور مؤرخ، ص ۲۵

-92 ایضاً، ص ۲۷

-93 کومیجر، مطالعۂ تاریخ، ص ۴۴

-94 ایضاً

-95 تاریخِ شناسی، ص ۳۰

-96 کومیجر۔ مطالعہ تاریخ، ص ۳۸

-97 تاریخ اور فلسفۂ تاریخ۔ ص ۴۸

-98 تاریخ شناسی، ص ۲۱

-99 ایضاً، ص ۲۰۔۲۱

-100 ایضاً

101- صدیقی، علی حسن۔ (فروری ۲۰۰۶ء)، مضامین تاریخی، کراچی: قرطاس، ص ۱۸۳

102- ایضاً، ص ۱۸۴

103- سبط حسن۔ (۲۰۰۷ء)، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبہٗ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، ص ۵

104- ایضاً، ص ۶

105- ایضاً

106- تاریخ اور مؤرخ ص ۲۷۔۲۸، محولہ بالا

107- ایضاً، ص ۲۹

107-A- مطالعہ تاریخ، ۱۲

108- تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۶

109- بہار، محمد تقی۔ (۱۳۲۱)، سبک شناسی، تہران، چاپخانہ خودکاری، جلد اوّل

110- صفا، ذبیح اللہ۔ (۱۳۷۳)، حماسہ سرائی در ایران، تہران: چاپخانہ رامین، ص ۶۴

111- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۴۳

112- بدخشانی، مقبول بیگ مرزا۔ (س ن)، ادب نامہ ایران، لاہور: نگارشات، ٹمپل روڈ، ص ۴۱۔۴۲

113- تاریخِ مبارک شاہی۔ ص ۲۸۔۲۹

114- شبلی نعمانی۔ (۱۹۸۲)، الفاروق، طبع سوم، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ دیباچہ ص ۱۸

115- دائرہ۔ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۴۷

116- ایضاً

117- تاریخ نویسی اور اہلِ اسلام، مقدمہ

118- نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ (مارچ ۱۹۸۶ء)، تاریخ اسلام، طبع یازدہم، کراچی: نفیس اکیڈمی، ص ۲۰، جلد اوّل

119- تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۴

120- مضامین تاریخی، ص ۱۸۱، محولہ بالا

121- ابن ندیم، محمد بن اسحٰق۔ (۱۹۹۰ء)، الفہرست، مترجم محمد اسحٰق بھٹی، طبع دوم، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۲۱۸۔۲۱۹

122- ایضاً، ص ۲۲۰

123- ایضاً، ص ۲۲۳

124- غازی، محمود احمد، ڈاکٹر۔ (مئی ۲۰۰۷ء) محاضراتِ سیرت، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ص ۱۶۰۔۱۶۱

125- ایضاً، ص ۶۱

126- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۴۵۰

127- ''جرجی زیدان۔ (۱۹۳۱ء)، تاریخ التمدن الاسلامی، مصر: مطبعۃ الہلال، ص ۸۹

128- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۵۰

129- الفہرست، ص ۲۲۶

130- ''مضامین تاریخی'' ص ۱۸۲، محولہ بالا

131- سعید اختر، پروفیسر۔ (س ن)، مسلمان تاریخ نویس، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۴

132- ایضاً، ص ۵

133- شبلی نعمانی۔ (س ن) سیرۃ النبی، کراچی، محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، جلد اوّل، ص ۲۳
حواشی۔ واقدی کے بارے میں الفہرست ص ۲۳۶ میں ابن ندیم لکھتا ہے کہ یہ نیک کردار شیعہ تھا جو تقیہ کا پابند تھا۔

134- شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص ۲۳

135- ایضاً، ص ۱۸

136- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (اگست ۱۹۸۳ء)، خلافت و ملوکیت، اشاعت ۱۵، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۳۱۱

137- الفہرست، ص ۲۳۷، محولہ بالا

138- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۵۱

139- مسلمان تاریخ نویس، ص ۱۲، محولہ بالا

140- الفہرست، ص ۲۳۸، محولہ بالا

141- سیرۃ النبی، جلد اوّل، ص ۲۵

142- ایضاً، ص ۲۶

143- البلاذری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب فتوح البلدان لکھ کر اپنے معتقدین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے مختلف بلد اسلامیہ کی تسخیر، تعمیر اور عید بعید کی ترقیوں کا حال بیان کیا۔ مختلف روایات پر تنقید اور صحیح روایات کا تعین کیا۔ (مضامین تاریخی، ص ۱۸۶، محولہ بالا)

144- تاریخِ مبارک شاہی، ص ۲۵، محولہ بالا

145- Hitti, P.K History of Arabs, Palgrave Macmillon. New york Revicsed Tenth edition: 2002 P.389

146- مضامین تاریخی۔ ص ۱۸۱، محولہ بالا

147- تاریخ المسعودی۔ ص ۳۶۔۳۷، محولہ بالا

148- دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۵۵، جلد ۶

149- نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، تاریخِ اسلام، مقدمہ

150- تاریخ المسعودی، ص ۱۵

151- History of the Arabs, P.391

152- شبلی نعمانی۔(۱۹۳۴ء)، مقالاتِ شبلی، اعظم گڑھ، مطبع معارف دارالمصنفین، ص ۲۲، جلد چہارم

153- دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۵۹، جلد ۶

154- History of Arabs, P392

155- دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۶۳، جلد ۶

156- شبلی نعمانی۔''سیرۃ النبی'' ۱۹۸۸ء، طبع پنجم، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جلد اوّل، مقدمہ، ص ۳۷

157- تاریخ اور اہلِ اسلام، مقدمہ تاریخ اسلام، اکبر شاہ نجیب آبادی، محولہ بالا

158- دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۶۵، جلد ۶

159- سالک عبدالمجید۔(س ن) مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۲۷۰

160- ایضاً، ص ۲۷۲

161- ایضاً، ص ۲۷۳، محولہ بالا

162- تاریخ مبارک شاہی، ص ۳۱، محولہ بالا

163- الکوفی، علی بن حامد بن ابی بکر۔(۱۹۳۹ء) فتح نامہ سندھ، المعروف، چچ نامہ، تصحیح عمر بن داؤد پوتا، حیدرآباد دکن، مجلس مخطوطات فارسیہ، مقدمہ

164- ایضاً

حواشی۔ فتح نامہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ کا مرکزی مضمون برہمنوں اور بدھ مت کے پیروکاروں کی تاریخ ہے۔ ازمنہ قدیم کے ہندوستانی راجوں، مہاراجوں کے حالات پہلو بہ پہلو، راجہ چاچ کی سوانح حیات کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔

فتح نامہ کے دوسرے حصے میں مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتحانہ داخلے اور ان کی ابتدائی معرکہ آرائیوں کا بیان ہے۔ جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ مسلمان فاتحین مفتوح باشندوں کے

ساتھ بے تعصبی اور سر دمہری سے پیش آتے تھے۔ نیز راجہ داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی یا حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کے مابین جو مراسلت ہوئی اس کا تذکرہ خاصا دلچسپ اور دل آویز ہے۔ ان خطوط و مراسلات کی سیاسی و تاریخی اہمیت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ ان پر محرروں یا کاتبوں کے نام مع تاریخ کتابت ثبت ہیں۔ (بحوالہ تاریخ شناسی، ص ۳۵)

165- صباح الدین، عبدالرحمن۔ (۱۹۸۴ء) بزم مملوکیہ، اعظم گڑھ: مطبع معارف دارالمصنفین، ص ۵۹

166- مبارک، علی، ڈاکٹر۔ تاریخ شناسی، ص ۳۸

167- سرکار، جگدیش نرائن۔ (جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء)، ''دور وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں'' بحوالہ، ہندوستانی دور وسطیٰ کے مؤرخین، مرتب محمد حبیب، اشاعت اوّل، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ص ۲۸۳

168- ایضاً، ص ۲۸۵

169- ایضاً، ص ۲۸۲

حواشی۔ اگرچہ غزنوی دور کی دو اور اہم تصانیف تاریخ یمنی اور تاریخ بیہقی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق براہِ راست ہندوستان سے نہیں ہے۔

170- تاریخ مبارک شاہی، ص ۳۷، محولہ بالا

171- ''دور وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں'' ص ۲۸۸۔ ۲۸۹

172- بزم مملوکیہ۔ ص ۱۷

173- ایضاً، ص ۱۸

174- سندیلوی، نبی احمد، چوہدری۔ (جولائی ۱۹۶۸ء)، تذکرہ مؤرخین، کراچی: اقبال پبلیکیشنز، ص ۳۵

175- عوفی، محمد سدید الدین۔ (۱۹۹۲ء)، جوامع الحکایات ولوامع الروایات' ترجمہ اختر شیرانی، اشاعت دوم، کراچی: انجمن ترقی اردو، ص ۵

176- ایضاً، ص ٦

177- ایضاً، ص ٧

178- ایضاً

179- ایضاً، ص ٨

180- ایضاً، ص ٩

181- ایضاً، ص ١٠/ حواشی ١٧، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا عوفی کس ماہ و سال سندھ پہنچا لیکن ٦١٧ھ سے پہلے سندھ پہنچا اور ٦٢٥ھ تک ناصرالدین کے دربار سے وابستہ رہا اس دوران کچھ عرصہ تک کھمبایت کا قاضی بھی رہا، (بحوالہ ایضاً ص ١٨)

182- ایضاً، ص ١٧

183- ایضاً، ص ١٩

184- ایضاً

185- ایضاً، ص ٢٠

186- ایضاً

187- عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (س ن) بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ص ١١

188- بزم مملوکیہ، ص ٥٣

189- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ٢٨٩

190- دہلوی، عبدالحق، شیخ۔ (١٣٨٣)، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، تصحیح وتوضیح، علیم اشرف خان، تہران: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ص ١٥٢

191- جوزجانی، منہاج الدین سراج، (١٩٨٥ء)، طبقات ناصری، طبع دوم، مترجم، غلام رسول مہر، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ١، جلد اوّل

-192 تاریخ مبارک شاہی، ص ۳۷، محولہ بالا

-193 ایضاً، ص ۳۸، محولہ بالا

-194 تاریخ فیروز شاہی، ص ۶۵، محولہ بالا

-195 Mehta, J.L (1982) History of Medivol India, India: Munshiram Manohar lal publisher, P.8 Vol.1

-196 طبقات ناصری، ص ۱۹، محولہ بالا

-197 بزم مملوکیہ، صباح الدین عبدالرحمٰن۔ ص ۱۹۱

-198 دور وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۳۹۰

-199 دائرۂ معارف اسلامیہ، (۱۹۷۳ء) طبع اول، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، ص ۹۳۳، جلد ۸

-200 گریوال، شیر محمد۔ (۱۹۸۹ء)، اسلامیانِ ہند کا شاندار ماضی، لاہور: اسلامک بک سروس، ص ۶۸

-201 ایضاً، ص ۷۰

-202 شبلی نعمانی۔ (۱۳۳۵)، شعر العجم، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جلد دوم، ص ۱۲۶

-203 مضامین تاریخ، ص ۲۱۱

-204 ایضاً

-205 تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، ص ۲۲۲، جلد ۳

-206 شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۶۰، محولہ بالا

-207 معین الحق، سید، ڈاکٹر۔ (۱۹۶۵ء)، ''معاشرتی و علمی تاریخ'' کراچی: حق نشان، نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، ص ۱۰۲

-208 Rasul, M.G, 1991 The Origin and Devolepment of Muslim History graphi, P.78 Lahore: L.Iqbal Publisher. 1991

-209 دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۶۴ء) طبع اوّل، دانشگاہِ پنجاب، ص ۴۳۲، جلد اوّل

-210 عائشہ بیگم۔ (۱۹۸۷ء)، تاریخ اور سماجیات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ص ۱۰۲

-211 برنی، ضیاء الدین۔ تاریخ فیروز شاہی، مقدمہ، ص ۱

-212 ایضاً، ص ۵

-213 نظامی، کے، اے۔ ''ضیاء الدین برنی'' بحوالہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین، ص ۸۴، محولہ بالا

-214 تاریخ مبارک شاہی، ص ۴۰، محولہ بالا

-215 نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء، آئینۂ حقیقت نما، اشاعت دوم، کراچی: نفیس اکیڈمی

-216 عفیف، شمس سراج۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳، مترجم عبدالقدوس ہاشمی

-217 نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ (۱۹۵۸ء)، آئینۂ حقیقت نما، اشاعت دوم، کراچی: نفیس اکیڈمی

-218 قریشی، وحید، اکرم، ایس، ایم۔ (جون ۱۹۶۶ء) دربار ملی، طبع اوّل، ترجمہ خواجہ عبدالحمید یزدانی، لاہور: مجلس ترقی اردو، ص ۷۶

-219 تاریخ مبارک شاہی، ص ۴۰

-220 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۲۹۵

-221 ایضاً

-222 عفیف، شمس سراج۔ ۱۹۳۸ء، تاریخ فیروز شاہی، ترجمہ مولوی فدا علی طالب، دکن: جامعہ عثمانیہ، ص ۱۔۲

-223 ایضاً، ص ۳

-224 تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۱۱، محولہ بالا

-225 ایضاً

-226 S.M Jaffer, history of History. P.45

-227 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۲۹۶

228- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور تحریریں، ص ۳۰۱، بحولہ بالا

229- ایضاً، ص ۳۰۳

230- اکرام، شیخ محمد۔ (۱۹۹۶ء)، رودِ کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۱۸

231- بابر، ظہیر الدین، محمد۔ ۱۹۸۵ء، تزکِ بابری، ترجمہ رشید اختر ندوی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ص ۶

232- ایضاً، تزکِ بابری کا فارسی ترجمہ اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاقان نے کیا تھا، بحوالہ ایضاً

233- سوری، پشپا۔ ''بابر'' ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین، ص ۱۷۶

234- ایضاً، ص ۱۷۷

235- فرید آبادی، ہاشم۔ (۱۹۸۹ء)، مسلمانان پاکستان و بھارت، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۳۷۹، جلد اوّل

236- دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۸۱۷، جلد سوم

237- عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (مئی ۱۹۸۹ء)، بزمِ تیموریہ، کراچی: نفیس اکیڈمی، ص ۲۹

238- رودِ کوثر، ص ۲۲۔۲۳

239- گلبدن بیگم۔ (۱۹۹۵ء)، ہمایوں نامہ، ترجمہ، رشید اختر ندوی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ص ۷

240- ایضاً، ص ۲۶۶

241- شبلی نعمانی۔ (۱۹۳۴ء)، مقالات شبلی اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۵۴، جلد چہارم

242- عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۴۸ء)، بزمِ تیموریہ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۴۳۶

243- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں۔ ص ۳۰۷

حواشی۔ خانزادہ۔ بابر کی بہن تھیں، ماہم بیگم۔ بابر کی بیوی تھیں، حمیدہ بانو۔ ہمایوں کی بیوی تھیں

244- بزمِ تیموریہ، ص ۹۳

حواشی۔ ڈاکٹر سید معین الحق نے تذکرۃ الواقعات کا اردو ترجمہ کر کے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے شائع کیا ہے

245- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریر۔ص ۳۰۸۔۳۰۹

246- معاشرتی وعلمی تاریخ، ص ۱۶۹

247- بزمِ تیموریہ، ص ۸۷

248- ایضاً، ص ۸۸

249- تذکرۂ مؤرخین، ص ۶۷، محولہ بالا

250- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۳۰۷

251- ایضاً، ص ۳۰۸

252- تذکرہ مؤرخین، ص ۶۷

253- طبقات اکبری، ص ۵۱

254- بدایونی، عبدالقادر۔ منتخب التواریخ، ص ۵۳

255- ایضاً

256- دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں۔ص ۳۱۷

257- مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۲۱۶

258- منتخب التواریخ، ص ۳۱

259- ایضاً، ص ۳۲

260- بزمِ تیموریہ، ص ۱۹۳

261- معاشرتی وعلمی تاریخ، ص ۱۸۶

262- بزمِ تیموریہ۔ص ۸۶

263- آزاد، محمد حسین۔(۱۹۸۸ء)، دربارِ اکبری، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ص ۴۴۷

264- بزمِ تیموریہ، ص ۸۶

-265 تاریخ اور سماجیات، ص ۱۱۳، محولہ بالا

-266 Nizami, Khaliq Ahmed, (1983) On History and Historyan of Medeval India, First Published India Munshiram Manoharlal publisher P.261

-267 صدیقی، نعمان احمد۔ شیخ ابوالفضل، ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین، محولہ بالا، ص ۲۱۷

-268 ایضاً، ص ۲۱۸

-269 بزمِ تیموریہ، ص ۱۲۷۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اکبر کے لیے جو القابات استعمال کیے ان میں سے کچھ یہ ہیں: شہریار جہانگیر، بائین، عظمت و جلالت، شہریار آگادل، شہریار جہاں آرا، شہریار دانش پژدہ، شہریار سعولت دوست، شہریار دادگر، خدیو خدا پرست حق سگال، خدیو عالم، اور بہت سے، بحوالہ ایضاً

-270 ہربنس مکھیا۔ (۲۰۰۳ء) عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، ترجمہ رشید ملک، لاہور: فکشن ہاؤس، ص ۱۱

-271 دربارِ اکبری، ص ۴۹۴، محولہ بالا

-272 عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، ص ۱۳، محولہ بالا

-273 ایضاً، ص ۱۸

-274 ''شیخ ابوالفضل'' ص ۲۳۲، محولہ بالا

-275 بزم تیموریہ، ص ۱۷۷، محولہ بالا

-276 دربارِ اکبری، ص ۵۰۰، محولہ بالا

-277 علمی ومعاشرتی تاریخ، ص ۱۸۴۔۱۸۵

-278 ''شیخ ابوالفضل''، ص ۲۳۲، محولہ بالا

-279 ''طبقات اکبری'' ص ۳۴

-280 ایضاً، ص ۴۰

-281 بزمِ تیموریہ، ص ۸۸

-282 طبقاتِ اکبری، ص ۴۰

-283 نظام الدین احمد، خواجہ۔ (۱۹۹۰ء)، طبقاتِ اکبری، اشاعت اوّل، ترجمہ محمد ایوب قادری، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص ۱۵، جلد اوّل

-284 ایضاً، ص ۱۶

-285 نظامی، خلیق احمد، (جنوری ۱۹۶۶ء)، تاریخی مقالات، اشاعت اوّل، دہلی: ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، ص ۱۳۱

-286 ایضاً، ۱۳۲

-287 دربارِ اکبری، ص ۸۴۲

-288 ایضاً، ص ۸۴۳

-289 بدایونی، مُلّا عبدالقادر۔ (س ن) منتخب التواریخ، ترجمہ محمود احمد فاروقی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۳۱

-290 تاریخی مقالات، ص ۱۳۴

-291 جہانگیر، نور الدین محمد۔ (۱۳۵۹ء)، توزک جہانگیری، (جہانگیر نامہ) بہ کوشش، محمد ہاشم، ایران: انتشارات بنیاد فرہنگ، ص ۳۲۰

-292 تذکرہ مؤرخین، ص ۶۶، محولہ بالا

-293 تاریخی مقالات، ص ۱۳۶

-294 تذکرۂ مؤرخین، ص ۶۵، محولہ بالا

-295 بزم تیموریہ، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۱

-296 ایضاً، ۲۲۲

-297 دربارِ اکبری، ص ۶۴۱

-298 معاشرتی وعلمی تاریخ، ص ۲۲۵

-299 مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ص ۲۸۰

-300 مقالاتِ شبلی، ص ۶۸۔۶۹، جلد چہارم

-301 فرشتہ، محمد قاسم۔ (۱۹۹۸ء)، تاریخ فرشتہ، ترجمہ۔ عبدالحیٔ خواجہ، لاہور: دوست ایسوسی ایشن، ص ۱۶، جلد اوّل

-302 ایضاً، ص ۲۰

-303 ایضاً

-304 ایضاً

-305 دربارِ ملی، ص ۲۲۴، محولہ بالا

-306 تزکِ جہانگیری، (۲۰۰۴ء)، ترجمہ مولوی احمد علی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ص ۵

-307 ایضاً، ص ۳

-308 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۳۰۶

-309 ایضاً، ص ۲۰۷

-310 مقالاتِ شبلی، جلد چہارم، ص ۸۴

-311 معاشرتی وعلمی تاریخ۔ص ۲۵۹

-312 تزکِ جہانگیری، ص ۵

-313 خان، معتمد۔ (۱۹۶۳ء)، اقبال نامہ جہانگیری، مترجم، محمد ذکریا، کراچی: ص ۶۳

-314 ایضاً

315- تاریخ اور سماجیات، ص ۱۱۴

316- سعید اختر۔ (جون ۱۹۹۴ء)، سرمایہ تاریخ اشاعت دوم، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۱۱۰

317- تزکِ جہانگیری، ص ۵

318- اقبال نامہ جہانگیری۔ ص ۶۳

319- ایضاً

320- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۲، ص ۸۵۴

321- ایضاً

322- تاریخ اور سماجیات، ص ۱۱۴

323- کنبوہ، محمد صالح۔ (فروری ۱۹۷۲ء)، عمل صالح الموسوم شاہجہاں نامہ، طبع دوم، ترتیب دکتر غلام یزدانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۳۴۰، جلد سوم

324- Quraish, I.H, 1966 The Administration of the Mughal empire, Karachi: Karachi university, P.223

325- دربار اکبری، ص ۵۰۲، محولہ بالا

326- کنبوہ، محمد صالح۔ (۲۰۰۴ء) شاہجہاں نامہ، تلخیص ممتاز لیاقت، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

327- ایضاً، ص ۷

328- شاہجہاں نامہ۔ ص ۵، ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، محولہ بالا

329- ایضاً

330- یزدانی، عبدالحمید، ڈاکٹر۔ تاریخ ادبیات پاکستان جلد چہارم، ص ۵۲۰

331- شاہنواز خان، صمصام الدولہ۔ (جولائی ۱۹۷۰ء، مآثر الاثراء، بار دوم، ترجمہ محمد ایوب قادری، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ص ۵۹۲، جلد سوم

-332 دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۹، ص ۵۱۲

-333 تذکرۂ مؤرخین، ص ۹۲

-334 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ، ص ۳۱۵

-335 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں، ص ۳۱۵

-336 دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۲۰، ص ۵۷۱

-337 مستعد خان، محمد ساقی۔ (۱۹۳۲ء) مأثر عالمگیری، ترجمہ مولوی فدا علی طالب، دکن: جامعہ عثمانیہ، ص ا

-338 بزمِ تیموریہ، ص ۲۸۹۔۲۹۰

-339 مأثر عالمگیری، ص ا، محولہ بالا

-340 تاریخ اور سماجیات، ص ۱۱۵

-341 مأثر عالمگیری، ص ا۔۲، محولہ بالا

-342 بزمِ تیموریہ، ص ۲۹۰۔۲۹۱

-343 مقدمہ رقعات عالمگیری، ص ۳

-344 معاشرتی و علمی تاریخ، ص ۳۸۹

-345 ندوی، نجیب اشرف۔ مقدمہ رقعات عالمگیری، (س ن)، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۵۵۔۵۶

-346 شبلی نعمانی، ''اورنگ زیب عالمگیر'' ترتیب ڈاکٹر مبارک علی، (۲۰۰۰ء)، لاہور: فکشن ہاؤس، ص ۱۲۹

-347 مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۲۷۹، محولہ بالا

-348 خان، ہاشم علی۔ (۱۹۸۵ء)، منتخب اللباب، طبع چہارم، ترجمہ محمود احمد فاروقی، کراچی: نفیس اکیڈمی، ص ۲۹

-349 ایضاً، ص ۳۸

-350 دورِ وسطیٰ کے کچھ مؤرخین کی نجی تاریخ، ص ۳۲۰

-351 منتخب اللباب، ص ۲۹، محولہ بالا

352- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۱۲، ص۲۲۴

353- شاہنواز خان۔ صمصام الدولہ (۲۰۰۴ء)، مآثر الامراء، طبع دوم، ترجمہ ایوب قادری، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ص۲-۳

354- ایضاً

355- ایضاً، ص۵، محولہ بالا

356- ایضاً

357- ایضاً، ص۳-۴، محولہ بالا

358- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۱۲، ص۲۲۴

359- طباطبائی، غلام حسین۔ (جولائی ۱۹۶۸ء)، سیر المتاخرین، طبع اوّل، مترجم یونس احمد، کراچی: نفیس اکیڈمی، ص۴

360- تذکرۂ مؤرخین، ص۱۲۹

361- ایضاً

362- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۱۴/ ۲، ص۵۵۲

363- سیر المتاخرین، ص۳، محولہ بالا

364- مرزا، وحید، ڈاکٹر۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، ص۱۵۹

365- مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص۲۷۷

366- ایضاً، ص۲۷۸

367- ایضاً

368- ایضاً

369- تذکرۂ مؤرخین، ص۱۲۷

-370 ایضاً، ص ۱۴۲

-371 خان، سر سیّد احمد۔ آثار الصنادید، خلیق انجم، ص ۱۴۳

-372 مبارک علی، ڈاکٹر۔ (دسمبر ۲۰۰۷ء)، برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، بار اوّل، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ص ۴۷

-373 Tara chand, (January 1961) History of the freedom movement in india, India: The publication division. P.219-320 Vol.1

-374 گریوال، جے ایس۔ ''دور وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات'' ہندوستانی دور وسطیٰ کے مؤرخین، ص ۳۸۰

-375 ایضاً، ص ۳۸۳

-376 Dharam.E.Seri. (2000) A Text book of Historiography New Delhi, Orient Longman. P.396

-377 ''دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات: ص ۳۸۳

-378 برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، ص ۷۸۔۷۹

-379 ''دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات'' ص ۳۸۴

-380 برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، ص ۷۹

-381 Hunter.W.W. (June 1975) The Indian Musalmans. Bangladesh: Barnalipi Mudrayan. Dacca. P.132

-382 دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات، ص ۳۸۰

-383 برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، ص ۸۰

-384 دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات، ص ۳۸۵

-385 ایضاً،ص ۳۷۹

-386 خان، سر سیّد احمد۔ (۱۹۹۰ء)، آثار الصنادید، مترجم، خلیق انجم، دلی، اردو اکادمی، ص ۱۴۰، جلد اوّل

-387 دائرۂ معارف اسلامیہ، (۱۹۸۰ء) اشاعت دوم، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۲، ص ۱۱۶

-388 حالی، الطاف حسین۔ (۱۹۸۶ء)، حیات جاوید، پاکستان میں اشاعت نو، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ص ۳۰

حواشی۔ سیّد محمد دوست جو کہ سر سیّد سے پانچ پشت اوپر ہیں دکن کی مہم میں عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے۔ جب اس مورچے کو انہوں نے بلاشرکت غیرے فتح کرلیا تو عالمگیر نے انہیں یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان واپس نہیں آئے مگر ان کے بیٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ سیّد احمد کے دادا سید برہان کے پوتے تھے۔ حیات جاوید ص ۳۰

-389 آثار الصناوید، ص ۱۴۲، محولہ بالا

-390 حیاتِ جاوید۔ ص ۳۲، محولہ بالا

-391 دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۱۶

-392 فاروقی، زیڈ ایچ۔ سر سیّد اور مولانا شبلی، ۳۹۴، ہندوستانی دور وسطیٰ کے مؤرخین

-393 ایضاً

-394 آثار الصناوید، ص ۱۴۴

-395 عبداللہ، ڈاکٹر سیّد۔ (۱۹۶۵ء)، سر سیّد اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری وفنی جائزہ، اشاعت دوم، لاہور: مکتبۂ کاررواں، کچہری روڈ، ص ۲۶۵

-396 آثار الصناوید، ص ۱۴۴

-397 سر سیّد اور مولانا شبلی، ۳۹۶، محولہ بالا

-398 آثار الصناوید، ص ۱۴۷

399- ایضاً، ص ۱۵۲

400- سر سیّد اور مولانا شبلی، ۳۹۶

401- Lithograph: Print from a metal plate & from a stons.

پتھر کی چھپائی

402- سر سیّد اور مولانا شبلی، ص ۳۹۶

403- آثار الصنادید، ص ۱۴۷

404- حیات جاوید، ص ۷۰

405- آثار الصنادید، ص ۱۴۸

406- ایضاً

407- سر سیّد اور مولانا شبلی، ص ۳۹۷

408- حیات جاوید۔ ص ۶۰

409- خان، سر سیّد احمد۔ (۱۹۶۹ء)، اسباب بغاوت ہند، لاہور: آئینہ ادب، ص ۸

410- حیاتِ جاوید، ص ۸۹

411- آثار الصنادید، ص ۱۴۹

412- خان، سر سیّد احمد۔ (۱۹۶۲ء)، مقالات سر سیّد، مرتب محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۲۷۲، جلد ششم

413- آثار الصنادید، ص ۱۵۰

414- اسباب بغاوتِ ہند، ص ۱۰

415- حیاتِ جاوید، ص ۹۴

416- ایضاً

417- دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۱، ص ۶۵۰

حواشی۔ خاندان کے مؤرث اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبول اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے ''ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقہ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہوگئی دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کر کے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے۔ گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے، یہ خیال ہی نہیں رہا کہ جوتیاں اتار دیں، ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب و دانہ تھیں، بگڑ کر بولیں، کیا نرے ترک ہو گئے، جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا برسٹ کر ڈالا۔ ایک راجپوت پر ایک عورت کے یہ چبھتے ہوئے طعنے نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علماء کے بحث و مناظرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنا تو کہا مجھے ترک ہونے کا طعنہ دیتی ہو تو میں سچ مچ ترک ہوا جاتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی بلکہ دینِ حق کے آب حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا۔ خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی اور اب تک یہ لوگ مبذول کے قریب دھرن نامی ایک موضع میں آباد ہیں۔ (بحوالہ، حیاتِ شبلی، ص ۶۰)

418- عظیم، اختر وقار۔ ''شبلی بحیثیت مؤرخ''، دسمبر ۱۹۶۸ء، لاہور: تصنیفا، ص ۴۹۔۵۰

419- ندوی، سیّد سلیمان۔ (۱۹۷۹ء)، حیاتِ شبلی، طبع سوم، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۱۱۶۔۱۱۷

420- اکرام، ایس، ایم۔ (۱۹۹۴ء)، یادگارِ شبلی، طبع دوم، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۱۱۸

حواشی، سرسیّد نے اس قصیدے کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور قصیدہ کو اپنے اخبار علیگڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں چھپوا دیا۔ (بحوالہ حیات شبلی، ص ۱۱۸)

421- حیاتِ شبلی، ص ۱۳۷

-422 ایضاً

-423 ایضاً، ص ۱۳۶

-424 عثمانی، محمد واصل۔ (۱۹۶۸ء)، شبلی ادیبوں کی نظر میں، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ص ۲۳

-425 اکرام، ایس، ایم۔ (۱۹۹۵ء)، موج کوثر، اشاعت ۱۹، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۲۶۲

-426 شبلی بحیثیت مؤرخ، ص ۵۶

-427 سیّد عبداللہ، ڈاکٹر۔ ''سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ'' ۱۹۶۵ء، اشاعت دوم، لاہور: مکتبہ کاررواں، کچہری روڈ، ص ۱۳۲

-428 نعمانی، شبلی۔ (۱۹۲۶ء)، المامون، دیباچہ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۶

-429 آفتاب احمد، ڈاکٹر۔ (س ن) شبلی ایک دبستان، ڈھاکہ: مکتبۂ عارفین، عظیم پور، ص ۸

-430 شبلی ادیبوں کی نظر میں، ص ۲۷

-431 المامون، ص ۲

-432 سر سیّد اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری وفنی جائزہ، ص ۱۵۲

-433 شبلی نعمانی۔ (س ن)، سیرۃ النعمان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۳

-434 سر سیّد اور شبلی۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸

-435 الفاروق، ص ۲۵۔ ۲۶

-436 دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۱، ص ۶۵۳

-437 برصغیر میں اسلام، ص ۲۲۵

-438 المامون، مقدمہ، ص ۶، محولہ بالا

-439 سر سیّد اور شبلی، ص ۳۹۹

-440 ایضاً، ص ۴۰۱

441- نثری ادیبوں کی نظر میں، ص ۲۲

442- دسنوی، شہاب الدین۔ (۱۹۸۹ء) علامہ شبلی، معاندانہ تنقید کی روشنی میں، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ص ۱۹

443- موجِ کوثر، ص ۱۲۸

444- دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۳، ص ۲۷۱

445- موجِ کوثر، ص ۱۲۹

446- قاضی، جاوید۔ (۱۹۹۸ء)، سرسیّد سے اقبال تک، لاہور: تخلیقات، ص ۶۵

447- ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' ص ۶۴۵، محولہ بالا

448- سرسیّد سے اقبال تک، ص ۶۲

449- ایضاً، ص ۷۶

450- امیر علی، سیّد۔ (۱۹۹۵ء)، روح اسلام، طبع نہم ترجمہ، محمد ہادی حسین، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۳

451- موجِ کوثر، ص ۱۷۳

452- امیر علی، سیّد، (۱۹۹۷ء)، روح اسلام، ترجمہ باری علیگ، لاہور: تخلیقات، پیش لفظ

453- مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ ۶۴۵

454- سرسیّد سے اقبال تک، ص ۷۹، محولہ بالا

455- سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء کی نثر، ص ۶۹، محولہ بالا

456- موجِ کوثر، ص ۱۶۶، محولہ بالا

457- مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۶۴۴

458- سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء کی نثر، ص ۶۹۔۷۰

459- عبداللہ، سیّد۔ (نومبر ۱۹۳۸ء)، سرسیّد کے ہم خیال علماء کے دینی نظریے، اورینٹل کالج میگزین، جلد ۱۵، ص ۵۶

460- عزیز احمد۔ (جون ۱۹۹۷ء)، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، سبع دوم، مترجم جمیل جالبی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۹۸

461- The preposed political, Legal and social Reforms in the ottoman Empire and other Mohammadan states (1883)

462- موجِ کوثر، ص ۱۲۷۔ ۱۲۸

463- سرسیّد سے اقبال تک، ص ۵۰

464- عبیداللہ خان، ڈاکٹر۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک ہند، جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱۶

465- محمود، سیّد قاسم۔ (س ن) اسلامی انسائیکلوپیڈیا، کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن، ص ۱۳۳

466- آزاد، محمد حسین۔ (۱۹۵۷ء)، آبِ حیات، بار ہفتدھم، لاہور: شیخ غلام اینڈ سنز، ص ا، دیباچہ

467- اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۳۳۰

468- عبداللہ، سیّد۔ (مئی ۱۹۶۵ء)، میر امن سے عبدالحق تک، طبع اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۲۰۷

469- اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۳۳۰

470- دربار اکبری، ص ۳۵، محولہ بالا

471- محمد صادق۔ (فروری ۱۹۷۲ء)، محمد حسین آزاد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، طبع اوّل، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ص ۳۲۶، جلد چہارم

472- میر امن سے عبدالحق تک، ص ۲۱۰، محولہ بالا

473- بلگرامی، سیّد علی، ڈاکٹر۔ (س ن) تمدن عرب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ص ۵

یہ کتاب فرانسیسی مؤرخ G.Le.Bon کی کتاب Civilization des Arabes کا ترجمہ ہے۔

474- ایضاً، ص ۷

475- ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی، عربی، فارسی، اور جو اس وقت کی علمی زبانیں تھیں پر عبور کے علاوہ جرمنی،

فرانسیسی، انگریزی، پالی، ترکی اور سنسکرت پر بھی عبور رکھتے تھے۔ (بحوالہ ایضاً)

476- ایضاً، ص ۱۰

477- ریاست اودھ کے وزیر

478- ایضاً، ص ۱۱

479- ایضاً، ۱۲

480- ایضاً، ص ۱۶

481- سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء کی نثر، ص ۱۸۲

482- ایضاً، ص ۱۸۳

483- شرر، محمد عبدالحلیم۔ فردوسِ بریں، (۱۹۹۵ء)، لاہور: مکتبہٗ عالیہ، ص ۵

484- ایضاً، ص ۶

485- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد چہارم، ص ۳۷۸

486- شرر، عبدالحلیم۔ (۲۰۰۵ء)، عصرِ قدیم، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ص

487- ایضاً،

488- ندوی، شاہ معین الدین۔ (مئی ۱۹۵۵ء)، معارف سلیمان نمبر، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ص ۱۷۳

489- عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۸۰ء)، حیات سلیمان، اعظم گڑھ: دارالمصنفین

490- معارف، سلیمان نمبر ص ۱۷۷

491- سیرۃ النبی کی جلد اوّل شبلی نے جبکہ باقی پانچ جلدیں سیّد سلیمان ندوی نے تالیف کی ہیں

492- معارف سلیمان نمبر، ص ۲۰۷

493- ظفر اقبال، ڈاکٹر۔ (۲۰۰۴ء)، اردو میں تاریخ نویسی، ۲۰۰۴ء، کراچی: ادارہ یادگار احسان غنی، ص ۲۶۴

494- اکبر آبادی، سعید احمد، مولانا۔ (دسمبر ۱۹۸۶ء)، مولانا ابوالکلام آزاد، سیرت و شخصیت اور علمی اور

علمی کارنامے، اشاعت اوّل، مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، کراچی: ادارہ تصنیف و تحقیق

پاکستان، ص ۹

495- ایضاً

496- ایضاً، ص ۱۱

497- اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ص ۷۹

498- اردو میں تاریخ نویسی، ص ۲۷۶

499- ایضاً

500- (1) Muslim Community of the indo-pakistan

(2) The struggle for pakistan

(3) Ulema in Politics

باب چہارم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے تاریخی اصول ونظریات

سید مودودی کے تاریخی اصول ونظریات

ابوالاعلیٰ مودودی کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے ان صاحبان فکر وعمل میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے دینی و سیاسی افکار، معاشی و معاشرتی نظریات اور جہاد بالقلم کے ذریعے اسلام کو ایسی مثبت اور موثر قوت کے طور پر پیش کیا ہے، جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ حیات کا احاطہ کرتی ہے، آپ نے تنہا اپنی ذات سے ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جو تجدید و احیائے دین کے لیے انتہائی شدت سے کوشاں تھی۔ آپ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کے علمی اثرات سے نہ صرف ان کے عہد کے عہد کے اہل علم و دانش متاثر ہوئے بلکہ عہد حاضر کے ارباب وفکر وبصیرت و طالبان حق متاثر ہو رہے ہیں۔

سید مودودیؒ کا تعلق ہندوستان کے چشتی خاندان سے تھا، علمی لحاظ سے بھی یہ خاندان نمایاں تھا۔ سید مودودی کے والد سید احمد حسن جدید مروجہ تعلیم سے بہرہ ور تھے لہٰذا اپنی اولاد کی تربیت بھی اسی نہج پر کی۔ ابوالاعلیٰ سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے باعث سب سے زیادہ لائق توجہ تھے۔ سید احمد حسن دبستان دہلی کے مداح تھے اور اردوئے معلی کے پاسدار تھے۔ لہٰذا اپنے صاحبزادوں (ابوالخیر اور ابوالاعلیٰ) کی تربیت میں فصاحت و بلاغت کا بھی خاص اہتمام کیا۔ ابتداء ہی سے سید مودودی کی فکری و تاریخی تربیت کے لیے آپ نے جن کتابوں کا انتخاب کیا ان میں مسدس حالی بھی شامل تھی۔[1]

مودودی کہتے ہیں ''تحریر وانشاء کی طرف میرے فطری میلان کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب میں نو برس کا تھا۔ اس زمانے میں میرے ایک قریبی عزیز جناب اشفاق احمد زاہدی صاحب جن کو مضمون نویسی اور کتب بینی کا شوق تھا اورنگ آباد آئے اور کچھ مدت ہمارے ہاں رہے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں (ابوالخیر مودودی) کے دلوں میں انشاء پردازی کا شوق پیدا کیا اور درسی کتب کے علاوہ عام رسالے اور خبارات پڑھنے کی طرف متوجہ کیا، ایک مرتبہ انھوں نے ہماری صلاحیت کا امتحان لینے کے لیے

کہا کہ اپنے خیال میں سمجھ لو کہ تم کسی لڑکی پر عاشق ہوگئے ہو اور خیالی معشوق کو خط لکھو جس میں محبت کے جذبات اور ہجر کی تکالیف کا احساس ہو۔ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس سے ہم بالکل نہ بلند تھے اور کم از کم میری عمر تو ایسی تھی کہ میرے ذہن میں عشق و معشوق اور محبت و ہجر کے تصور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں گلستان و بوستان پڑھ چکا تھا، اس سے صرف اتنا معلوم ہوگیا کہ عشق کوئی مرض ہے جو کسی اچھی صورت کو دیکھ کر ہو جایا کرتا ہے اس مرض سے دل کے اندر آگ لگ جایا کرتی ہے، جو صرف اس کے ملنے ہی سے بجھتی ہے اور جب تک وہ نہ ملے اس وقت تک غریب بیمار جلتا رہتا ہے اور اس حالت کا نام ہجر ہے، ان معلومات کو ہم نے اپنی بساط کے مطابق خوب استعمال کیا اور ایک لمبا چوڑا خط ان کیفیات کے بیان میں لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ہم دونوں میں سے کسی کو یاد نہیں اور نہ بھائی اشفاق کو یاد ہے کہ ہم نے اس وقت کیا لکھا تھا، مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ ان خطوط کو دیکھ کر پھڑک گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ میرے خط کو انھوں نے زیادہ پسند کیا تھا اگر چہ عبارت کے اعتبار سے بڑے بھائی کا خط زیادہ بڑھا ہوا تھا''۔2

طلب علم کی جانب خود مولانا کا میلان و دلچسپی کا اندازہ اس واقعہ سے جو انہوں نے اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے استاد مولانا عبدالسلام نیازی کے طریقۂ تدریس سے متعلق لکھتے ہیں۔ مولانا نیازی مرحوم اپنے وقت کی اکابر اہل علم میں سے تھے اور بعض اعتبارات سے تو پورے ملک میں ان کا جواب نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی قوتِ تقریر کہ جس مسئلے پر بھی کلام فرماتے تھے اس میں کلام کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ علومِ قدیم میں سے کوئی علم ایسا نہ تھا جس میں ان کو کمال حاصل نہ ہو۔3

بچپن میں میری عربی زبان کی تعلیم انہی کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہوئی تھی۔ دہلی میں چند مہینوں ان کی صحبت سے استفادہ کیا لیکن چونکہ میرے والد مرحوم کا قیام اورنگ آباد دکن میں تھا۔ لہٰذا زیادہ مدت تک ان سے شرف تلمذ نہ رہ سکا۔4

ایک مدت دراز کے بعد ۱۹۲۱ء میں جب مجھے مستقل طور پر دہلی رہنے کا موقع ملا تو میں نے مولانا سے گزارش کی کہ مجھے پھر تعلیم کے لیے کچھ وقت عنایت فرمائیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اس کو قبول

فرمایا۔ محبت سے وہ مجھ کو سید بادشاہ کہا کرتے تھے۔ فرمانے لگے کہ سید بادشاہ روزانہ فجر کی اذان کے وقت تم میرے کمرے پر پہنچ جایا کرو۔ ان کا کمرہ میرے مکان سے کافی دور، ترکھان دروازے کی قریب تیلیوں کی گلی میں تھا۔ میں جاڑے، گرمی، برسات ہر موسم میں بلاناغہ ٹھیک اذان کے وقت پہنچ جاتا تھا اور وہ نماز کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جس قدر ان کا جی چاہتا مجھے درس دیتے تھے۔ کبھی جب ان کا جی نہ چاہتا تو اندر ہی سے ارشاد فرما دیتے کہ بھئی سید بادشاہ آج طبیعت حاضر نہیں ہے، کل آنا۔ کبھی کبھار ایسا اتفاق دو دو تین تین دن مسلسل ہوتا تھا، مگر میں کبھی بددل نہ ہوا اور وقت مقررہ پر حاضری دیتا رہا۔ اس زمانے میں میں نے ان سے معانی و بلاغت اور معقولات کی کتابیں پڑھیں۔5

بزرگوں کی تربیت اور مولانا کی فطری صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریر اتنی پر اثر تھی کہ لاکھوں افراد کی فکر کو متاثر کیا۔ سید اسعد گیلانی مولانا کی تحریر کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مولانا کا خط نہایت پاکیزہ اور نفیس ذوق کا آئینہ دار تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت حروف، ہمیشہ پورے حروف لکھتے تھے، شوشے، کامے، نکتے، زیر، زبر اور شد کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ فن کتابت کے لحاظ سے بھی کبھی غلطیاں نہیں کرتے تھے، ان کے حروف ایک سلیقے سے قطار اندر قطار چلے جاتے تھے، سطریں سیدھی، پورے صفحہ پر کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی جو ان کی راست فکری اور ذہنی یکسوئی پر دلالت کرتی تھی، اور لکھا ہوا صفحہ بلا پڑھے خود بتا دیتا تھا کہ جس شخص نے لکھا ہے اس کا ذہن ہر قسم کے الجھاوؤں سے صاف اور استدلال کے اعتبار سے محکم ہے۔ تصورات و جذبات میں کہیں جھول نہیں ہوتی تھی، تحریر اتنی پختہ تھی کہ بیس برس پہلے کی لکھی ہوئی تحریر اور بعد کی تحریر کے خط میں کوئی فرق نہیں تھا جو محکم کردار اور راست فکری کی علامت شمار ہوتا ہے۔6

سید مودودی، اپنی خانگی، تحریکی اور سیاسی سرگرمیوں کے باوجود وسیع المطالعہ اور کثیر التصانیف شخصیت تھے ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنا منفرد انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ اپنے طرز نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ''۱۹۱۷ء میں قیام بھوپال کے دوران عام مطالعہ کے ساتھ انشا پردازی کا

ستوں ایسا دامن گیر ہوا کہ اب شاید مرنے سے پہلے پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابتدائی تین چار سال تک نومشقی کی حالت تھی جس کا انداز تحریر پسند آجاتا تھا اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا، مگر جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا میں یہ محسوس کرتا گیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں بلکہ خود اپنے انداز میں لکھنا ہے۔7 ۱۹۲۱ء سے خود اپنا مستقل رنگ اختیار کیا ہے جس میں کسی کا مقلد نہیں ہوں۔ میں اس نظریہ کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہوتے ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے باقی رہے الفاظ تو انتخاب میں الجھنے کی ضرورت نہیں وہ آپ سے آپ مضمون کے ساتھ آجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے کبھی لکھنا ہوتا ہے تو میں اپنی تمام تر کوشش صرف خیالات کو مجتمع کرنے اور دلائل و شواہد اور مواد فراہم کرنے میں صرف کرتا ہوں، اور جب دماغ میں مضمون مرتب ہوتا ہے تو پھر اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی، ان الفاظ کے انتخاب سے میری بے اعتنائی ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اکثر و بیشتر میں لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی نہیں کرتا اِلّا اس صورت میں جب کوئی خاص ذمہ داری کی تحریر لکھنی ہو۔8

مولانا کے شوقِ مطالعہ کا یہ حال تھا کہ علالت کے دوران جب ڈاکٹروں کی ہدایت یہ بھی تھی کہ مطالعہ بالکل نہ کیا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ لوگ کیا جانیں کہ مطالعہ کیا چیز ہوتا ہے۔ مطالعہ تو میری غذا ہے، میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہوں۔ چنانچہ ہلکا پھلکا مطالعہ ان کی ممانعت کے باوجود بھی جاری رہا۔9 اس ضمن میں ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ''میرا بس چلے تو میں اپنی قبر میں بھی اینٹوں کے بجائے کتابیں چنوادوں۔10

اقبال احمد ندوی جو مولانا کے ایک رفیق کار ہیں۔ مولانا کے طریقۂ مطالعہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے کا کام میرے سپرد کر دیا تھا، اس زمانے میں مولانا مودودی قرآن مجید کا بڑا تفصیلی مطالعہ فرما رہے تھے۔ فہرست بناتے ہوئے میں جب شعرائے عرب کے دواوین پر پہنچا تو مولانا کے کتب خانہ میں کلامِ عرب اور اس کی شروح کا وسیع ذخیرہ دیکھ کر حیرت میں پڑ

کیا۔ لیکن جلد میں مجھے کلام عرب کا مصرف معلوم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ قرآن مجید اور احادیث میں وہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے، وہ آیتیں اور احادیث مولانا الگ شیٹ پر تحریر فرمارہے ہیں۔ پھر مفسرین، محدثین اور اہل لغت نے جو مفہوم اس لفظ کے بتائے ہیں، انہیں اٹھاتے ہیں اور اسے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، جس شعر میں وہ لفظ آیا ہے، وہ سب اشعار شاعر کے نام کے تحت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سارے دیوان ختم ہو جاتے ہیں۔

ضرورتاً لغت کی طرف بھی رجوع کرتے جاتے ہیں۔ پھر اس لفظ کا قرآن وحدیث اور کلام عرب کے استعمال اور لغت و تفاسیر سے جو مفہوم متعین ہوتا ہے، اسے اختیار کرتے ہیں۔11

قرآن کے ایک ایک لفظ کا مفہوم متعین کرنے میں، میں نے دیکھا ہے کہ مولانا کو کبھی کبھی دس بارہ دن کلامِ عرب، تفاسیر، اور احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ قرآن کے کسی لفظ کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلے میں مولانا تفرد کو درست نہ سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی شدت اور التزام کی کیفیت یہ تھی کہ کسی لفظ کا مفہوم لغت اور کلام عرب کا استعمال کچھ بھی بتلائے، مگر جب تک اس کی تائید سلف کے کسی مفسر کے یہاں نہ مل جائے وہ اس مفہوم کو قبول نہ کرتے تھے۔12

سید مودودی علمی دنیا میں بحیثیت عالم، مفکر، ادیب، صحافی، دانشور، ممتاز ومنفرد مقام پر فائز رہے لیکن تاریخ پر دقیق نظری اور بھاری بھرکم تاریخی سرمائے کے باوجود، مورخانہ خصوصیات کے اعتبار سے آپ کی شخصیت کا نہ تو جائزہ لیا گیا اور نہ آپ کی تاریخ نویسی کے خصوصی گوشوں کو اجاگر کیا گیا۔ حالانکہ آپ نے تاریخ اسلامی کے تمام پہلوؤں، تفسیر، سیرت نگاری، تاریخ اسلامی اور تاریخ ہندوستان کے علاوہ خطبات اور مکاتیب میں بھی نہ صرف تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ تاریخ پر گہرے نقوش ثبت بھی کیے ہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں وہ اشہر حرم (حرام مہینے جن میں جنگ ممنوع تھی) کی حرمت بعد از اسلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: دراصل اشہر حروم کی حرمت کا حکم جزیرۃ العرب کے لیے تھا اور اس زمانے کے لیے تھا جب عرب میں قبائلی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ طوائف الملوکی برپا تھی اور کوئی مرکزی حکومت قانون کو نافذ کرنے

والی نہ تھی۔ ابتدائے اسلام میں بھی یہ حکم رہا جبکہ مسلمانوں سے اہلِ عرب برسرِ پیکار تھے لیکن جب تمام عرب مسلمان ہو گئے تو یہ حکم آپ سے آپ منسوخ ہو گیا کیونکہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد تو ان پر دوسرا اور عظیم تر حکم یعنی قتل مسلم بغیر حق کی حرمت کا حکم عائد ہو گیا ورنہ اشہر حروم کی حرمت کا حکم باقی رہنے کے معنی یہ ہوں گے کہ قبائل عرب صرف چار مہینے تو جنگ سے پرہیز کریں، باقی ایام میں وہ لڑ سکتے ہیں۔13

اس حکم کے جزیرۃ العرب کے لیے، اور اس کے بھی آغاز اسلام کے دور تک کے لیے مخصوص ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے مسلمان ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی لڑائی (جائز طور پر) صرف جزیرے کے باہر کفار کے ساتھ ہی ہو سکتی تھی اور ان لڑائیوں میں صحابہ کے دور سے لے کر آج تک کبھی اشہر حروم کی حرمت کا سوال کسی عالم نے نہیں اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ کفار تو جنگ کی ابتدا کرنے میں اشہر حروم کا لحاظ کر ہی نہیں سکتے لیکن خود مسلمانوں نے بھی کسی کافر پر حملہ کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہیں کیا ہے کہ کسی حرام مہینے میں جنگ نہ چھڑے اور میرے علم میں نہیں کہ کسی فقیہ نے کبھی کوئی اعتراض کیا ہو۔14

اگرچہ سید موجودی نے از خود اپنے تاریخی اصول و نظریات واضح نہیں کیے لیکن ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی متعدد تحریروں کی مدد سے ان کے تاریخی اصول مرتب کیے گئے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کے تاریخی اصول و نظریات کا اہم ماخذ قرآن و سنت رسول ہے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''قدیم اور جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ اچھی خاصی لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا۔ علم کی جڑ تو اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نطشے، مارکس اور دنیا کے بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھاتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی نہ حل کر سکے۔ اس کتاب (قرآن) نے دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیے۔15

سید مودودیؒ نے تاریخ کو دفتر پارینہ کے اوراق سے تشبیہ دی ہے اور اس کے مطالعہ کے لیے تین طریقوں کی نشاندہی کی ہے۔ تاریخ سے متعلق طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ایک نقطہ نظر معروضی مطالعہ کا ہے، یعنی واقعات اور حالات جیسے بھی گزرے ہیں، ان کو جوں کا توں دیکھا جائے یہ نقطہ نظر مورخانہ ہے اور اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس طرح کے مطالعہ سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں مگر بجائے خود مفید نہیں۔16

0۔۔ سید مودودی کے فن تاریخ نویسی کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انسانی تاریخ کے منبع قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق سے رہنمائی حاصل کر کے مختلف دینی، اخلاقی اور تاریخی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ قرآن اگرچہ تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ ضابطہ حیات ہے لیکن سیرت و اسلامی تاریخ کا ماخذ ہے۔ چنانچہ وہ تاریخ کے اسلامی نقطۂ نظر کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اسلام چونکہ کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مسلک ہے جو مطلقاً انسان اور اس کی سعادت سے تعلق رکھتا ہے اور ان تعصبات سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے جو انسانوں کو نسلی قومی اور جغرافیائی تقسیمات سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا تاریخ میں اس نے یہی آخری رویہ اختیار کیا ہے۔ اگر ایک مسلمان صحیح اسلامی ذہنیت کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کا فرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ واقعات کو جیسے کہ وہ فی الواقع گزرے ہیں بلا کسی تعصب کے جوں کے توں سامنے رکھے، اور پھر اسلام نے جو معیار حق و باطل اس کو دیا ہے، اس کے مطابق اشخاص، اقوام اور اداروں کے رویوں کو جانچ کر بے لاگ نتائج اخذ کرے، غلطی جہاں ہو، کوتاہی جہاں بھی پائی جائے اسے بے تکلف وہیں انگلی رکھ دینی چاہیے، اور کھوج لگانا چاہیے کہ اس کی

پیدائش کے اسباب کیا ہیں اور اس نے انسانی فلاح و سعادت پر کیا اثر ڈالا ہے، کتنا اور کس طرح اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح خوبی جہاں اور جس میں بھی نظر آئے، بے تکلف اس کا ادراک کرنا چاہیے اور اس کے مفید نتائج یا غیر نتیجہ رہ جانے کے اسباب کا سراغ لگانا چاہیے۔ ٹھیک ٹھیک یہی رویہ ہے جو قرآن میں سوانح اشخاص اور تاریخ اقوام سے بحث و استدلال کرتے وقت اختیار کیا گیا ہے''۔15

o۔۔ سید مودودی کے پیش نظر تاریخ نگاری سے متعلق جو اہم بات ہے وہ یہ کہ اسلامی تاریخ کی تعبیر نہ تو معذرت خواہانہ انداز میں کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا مقصد اپنے دفاع میں جواز فراہم کرنا ہونا چاہیے بلکہ تاریخ اسلامی کی ایک مستحکم بنیاد اسلام کی حقانیت ہے جس سے متصادم ہر چیز کفر و باطل ہے۔ مودودی کی تحریر کی یہی خوبی تھی جسے علامہ اقبال نے سراہا تھا۔ الجہاد فی الاسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا ''اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا مودودی نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ جنگ و جہاد کے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں انھیں کسی تاویل یا تعبیر کے بغیر برے کروفر سے پیش کیا گیا ہے۔18

o۔۔ سید مودودی کی تاریخ نگاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عظام کرام کی سیرتوں کو تقدیس کا جامہ نہیں پہنایا بلکہ ان کاموں کا تنقیدی جائزہ لے کر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے جس پر ان رہنماؤں کی نظر نہیں گئی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ہمیں اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کام کس کس طرح کیا ہے اور ان کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان سے کیا چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیے۔19

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کے تجدیدی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں انگریز بنگال پر چھا گئے اور الہ باد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انھوں

نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہیں لیا، شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانے میں دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر ان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرف بڑھا رہی ہے، اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہیں؟ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے انھوں نے سارے انتظامات کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جارہی ہے اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم وفنون سے کام لے رہی ہے اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارت قائم ہیں اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے اور اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اٹھے ہیں، اس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریزوں کی ہے اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالفت اگر ہوسکتی ہے تو انگریز ہی کی ہوسکتی ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا تھا اس کے مقابلے میں اپنی قوت کا اندازہ کرنے اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کرتے۔[20]

اسلاف کی کمزوریوں کا تجزیہ کر کے سید مودودیؒ جو حل پیش کرتے ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''مغربی جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کو جو ناکامی ہوئی اس سے پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کے لیے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دئے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ یا ان سے پہلے کے مجتہدین ومجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے

کافی نہیں ہے۔ جاہلیت جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے اور اس نے بے حساب نئے مسائل زندگی پیدا کر دیئے ہیں جن کا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدما کے ذہن میں نہ گزرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہ کے علم، اور اس کی بخشش سے رسول اللہ کی بصیرت پر ہی یہ حالات روشن تھے، لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہ عمل تعمیر کرنے کے لیے ایسی مستقل قوت اجتہاد درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے نہ کرے۔21

سید مودودی نے مجددین اسلام کے تجدیدی کاموں کی نوعیت اور مقام و مرتبہ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے جن کے باعث ان کے تجدیدی کاموں کے دیرپا اثرات رونما نہ ہو سکے۔ جیسے امام غزالی (۱۰۵۸ء۔ ۱۱۱۱ء) کے تجدیدی کارناموں کی وضاحت کے بعد نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی وفکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے وہ تین عنوانات پر تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کاموں میں پیدا ہوئے۔22 دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ ہونے کی وجہ سے تھے۔23

سلاطین ہند اور ہندوستان کی عمومی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے عبداللہ بٹ کی کتاب ''ٹیپو سلطان'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں'' سلطان ٹیپو (۱۷۶۰ء۔ ۱۷۹۹ء) کے متعلق ہمیں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ وہ جس ادارے (یعنی بادشاہی کے ادارے) سے تعلق رکھتا تھا وہ فی الاصل اسلام کے خلاف تھا، اس کی حکومت کا دستور اسلامی نہ تھا بادشاہی نظام، جس پر ہندوستان میں ان تمام حکومتوں کی بناء، ابتداء سے قائم ہوتی ہی ہے جنھیں غلطی سے ''اسلامی حکومتیں کہا جاتا ہے، دراصل وہ سب سے بڑا گناہ تھا جس کی وجہ سے اسلام کی حقیقی نعمتوں سے ہندوستان کبھی بہرہ ور نہ ہوسکا۔ اس گناہ میں جہاں تک کہ اساس حکومت کا تعلق

ہے ہمارے بہتر سے بہتر حکمران بھی اتنے ہی تاریک تھے جتنے بد سے بدتر حکمران۔ سلطان ناصر الدین، غیاث الدین بلبن، محمد تغلق، عالمگیر اور ٹیپو سلطان اور اسی قسم کے دوسرے افراد نے اپنی ذاتی خوبیوں کے سبب جو کچھ اچھے کام کیے ان کی حیثیت بہرحال انفرادی ہے وہ دستور اور نظام جس سے ان کا تعلق تھا بجائے خود غلط تھا، اس لیے ان معدورے چند افراد کی خوبیوں سے اسی غلط نظام کے برے نتائج نہ رک سکے۔24

اس بادشاہی کے اثر سے جو غلط سیاسی، اخلاقی، تمدنی اور معاشی نظام زندگی بن گیا تھا یہ چند اچھے حکمران اس میں کوئی بنیادی اصلاح نہ کر سکتے تھے اور نہ کر سکے۔ اہل ہند نے اس سیاست کو اپنی معاشرت سے اور اس معیشت کو اپنی پرانی معیشت سے کچھ زیادہ بلند اخلاق نہ پایا کہ وہ اس کے گرویدہ ہوتے۔ یہاں بھی انسانوں کے درمیان وہی اونچ نیچ تھی انسان اسی طرح انسان کا خدا بنتا تھا، ویسے ہی معاشرتی امتیازات تھے، ویسا ہی معاشی نظام تھا جس کے یہ لوگ پہلے سے خوگر تھے۔ اگر فرق تھا تو محض مدارج کا تھا اصل جوہر کا نہ تھا۔ اس وجہ سے یہاں اتنا مکمل سماجی انقلاب رونما نہ ہو سکا جو شام، عراق اور مصر میں اسلامی فتح سے ہوا تھا اور نہ اسلام اور مسلمان کی وہ عزت کبھی دلوں میں قائم ہو سکی جو اصلی اسلامی حکومت کی بدولت مشرق قریب کے ممالک میں قائم ہوئی تھی۔25

سلطان ٹیپو کی خوبیوں اور انگریزوں کے خلاف اس کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں "شخصی حیثیت سے سلطان ٹیپو ایک بہترین شخص تھا۔ غیر ذمہ دارانہ بادشاہی کے اختیارات رکھنے کے باوجود وہ خدا سے ڈرتا تھا۔ اسلامی قانون کا احترام ملحوظ رکھتا تھا، قانون کی خلاف ورزی سے اس نے پرہیز کیا اور اپنے وعدوں کی پابندی کی۔ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آیا۔ رعایا کی دولت کو اپنی عیاشی پر اس نے نہیں لٹایا، خلق خدا کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا، غیر مسلم جو اس کی حفاظت میں تھے ان سے انتہائی رواداری اور فیاضی کا سلوک کیا، ایک مسلمان حکمران کے اصلی فرائض بڑی حد تک بجالانے کی کوشش کی، غیر مہذب لوگوں کو جانوروں سے آدمی بنایا، تعلیم پھیلائی، بداخلاقیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، غلط

رواجوں (مثلاً خلاف شریعت کثرت ازدواج، دیوداسی وغیرہ) کو مٹانے میں اپنا پورا زور صرف کیا جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔26

مگر ان تمام قابلیتوں کے باوجود وہ آخر ناکام رہا؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ سب خوبیاں اور قابلیتیں محض ایک شخص کی ذاتی تھیں، اجتماعی نہ تھیں، ہندوستان کے عام باشندے اور خود مسلمان قوم کے جمہور اخلاقی حیثیت سے پوری طرح بگڑ چکے تھے۔ ان کے اندر کوئی جماعت نہ تھی کسی مشترکہ وفاداری کے رشتہ میں وہ بندھے ہوئے نہ تھے۔ درحقیقت فرد فرد الگ تھا اور ہر فرد اپنی ذات کے سوا کسی کا وفادار نہ تھا۔ اجتماعی طاقت بہرحال کسی مشترک محبوب کی وفاداری سے بنتی ہے خواہ وہ محبوب خداوند تعالیٰ کی ذات ہو، یا قوم یا ملک یا کوئی اور چیز لیکن یہاں سرے سے کوئی مشترک محبوب تھا ہی نہیں، ہر ایک کا محبوب خود اس کا اپنا وجود تھا، دوسری طرف انگریز قوم تھی جس میں اخلاقی حیثیت سے کتنے ہی عیوب تھے مگر بہرحال قومیت کے محبوب کی وفاداری میں سب ثابت قدم تھے۔ جو انگریز جس پوزیشن میں اور جہاں کام کر رہا تھا، خلوص نیت کے ساتھ اپنی قوم کی برتری کے لیے کوشاں تھا اور اس غرض کے لیے جھوٹ، فریب، بے ایمانی، سازش، ایمانوں کی خرید وفروخت اور سرفروشی و جانبازی سب ہی ذرائع استعمال کر رہا تھا۔27

پس اصل مقابلہ ٹیپو اور انگریزوں کا مقابلہ تھا۔ ایک فرد اور پوری قوم کا مقابلہ تھا اور ظاہر ہے اس نامساوی مقابلہ میں شخص واحد کا شکست کھانا امر طبعی تھا۔ اگر ٹیپو سلطان بادشاہ کے بجائے ایک مسلم لیڈر ہوتا اور اسلام کو بحیثیت ایک نظام فکر وعمل کے عوام میں پھیلا کر ان کے اندر سب سے بڑے محبوب یعنی خداوند عالم کی وفاداری کو مستحکم کر دیتا تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ آج کچھ اور ہوتی اور آج بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ کام کرے تو تاریخ اپنا راستہ آپ بدلنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔28

۵۔۔ سید مودودی کے نظریہ تاریخ کے فہم و ادراک کا حسن یہ ہے کہ ان کا استدلال ادبی اور مورخانہ ہے۔ مثال کے طور پر شرک کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نبی اکرمؐ کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلاوہ انسان کی گردن میں ڈال دیں اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و

فرمانبرداری کا قلاوہ اس کی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ دونوں کام آپ کے مقصد بعثت میں شامل تھے اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی۔ پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپؐ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں۔ کیونکہ آپ کی اطاعت پر ہی خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلے میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کردیں کہ کسی انسان کی، حتیٰ کہ خود محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے اور ان کی روحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔29

0۔۔ سید مودودی کے نزدیک تاریخ محض حالات و واقعات کا بیان نہیں بلکہ کسی بھی واقعہ کی تمام جزئیات کی تحقیق کے بعد حقائق کو واضح کرنا ہے۔ مولانا مودودی تاریخ کے بارے میں اپنے نظریے کی تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں "پوری انسانی تاریخ دراصل دو مقابل طاقتوں کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ ایک اسلام یعنی دین فطرت کی قوت دوسری جاہلیت یعنی مسخ شدہ فطرت انسانی کی قوت۔ اس کشمکش میں کبھی اسلام ابھرتا ہے اور جاہلیت دب جاتی ہے اور کبھی جاہلیت ابھرتی ہے اور اسلام دب جاتا ہے۔ جب اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو جاہلیت اس کے خلاف رجعت (Reaction) کے لیے زور لگاتی ہے اور جب جاہلیت ابھرتی ہے تو اسلام اس کے مقابلے میں انقلاب کے لیے زور لگاتا ہے دونوں قوتوں کے لیے انسان، واسطہ (Agent) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ مگر اسلام اور جاہلیت کے نازک اور باریک فرق کو بالکل واضح صورت میں بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں زیادہ تر لوگ ان دونوں کو غلط ملط کر کے کچھ اس طرح پراگندہ خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کام تو جاہلیت کے لیے کر رہے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے کر رہے ہیں، یا کام اسلامی ڈھنگ اور اسلامی تخیل پر شروع کرتے ہیں اور چلتے چلتے اسلامی سرحدوں سے گزر کر جاہلیت کی حدود میں چلے جاتے ہیں۔30

0۔۔ سید مودودی کا نظریہ تاریخ اسلامی پس منظر رکھتا ہے لہٰذا وہ اسلامی تاریخ کی اہمیت پر بالخصوص زور

دیے ہیں، اس کا اظہار آپ نے اسلامیہ کالج پنجاب میں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر ایک خطبہ میں کیا۔ آپ نے کہا:

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلامیہ کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے؟ ان درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاست، تاریخ اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساسِ حکمت، اسلام کے اصول معیشت، اسلام کے اصول قانون، اسلام کے نظریہ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں۔ غیر اسلامی نقطہ نظر سے زندگی کے ہر معاملے کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ اسلامی نقطہ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں''۔31

اسی طرح سید مودودی مغربی فلاسفہ تاریخ کے نظریات جنھوں نے اہل مشرق کی فکر کو متاثر کیا، ان کے نظریات کو قرآن کے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان نظریات نے مذہب، اخلاق اور تہذیب و عمرانیات کے متعلق بالعموم موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے نقطہ نظر کو بنیادی طور پر غلط کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر ہیگل اور مارکس نے قرآن پڑھا ہوتا تو

انھیں انسان کی حقیقت کو سمجھنے اور ارتقاء تہذیب انسانی کے اساسی قانون کو دریافت کرنے میں وہ ٹھوکریں نہ لگتیں جو انھوں نے خود گمان اور قیاس کے تیر تکے لڑانے کی وجہ سے کھائی ہیں۔ قرآن کا علم الانسان اور فلسفہ تاریخ ان تمام مسائل کو نہایت صحیح اور تشفی بخش طریقے سے حل کرتا ہے۔ جن میں یہ لوگ الجھ کر رہ گئے ہیں''۔32

ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں''موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈارونیت ان سب کی سرتاج ہے، اس نے انسان کو یقین دلایا ہے کہ تو جانوروں میں سے بس ایک جانور ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اولاد آدم آج پورے اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں حیوانیت کا برتاؤ کر رہی ہے''۔33

سید مودودی ڈارون کی لاعلمی پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں''ڈارون نے جب تحقیق و تجسس کا آغاز کیا اس وقت اگر وہ قرآن کے دیئے ہوئے نقطہ آغاز سے چلتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاضل، جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ بھنگے سے لے کر انسان میں نظر آرہا ہے یہ ایک حکیم کے منصوبے کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع زندگی کے لیے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے خاکے میں باقی نہیں رہی انھیں مٹاتا بھی رہا ہے۔34

۵۔۔ سید مودودی کی تاریخ نویسی کی نمایاں خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے تاریخ کو قرآن کے نقطہ نظر سے سمجھنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسلام کی جغرافیائی تاریخ کے بیان میں ان تمام تاریخی مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کیا جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے چنانچہ نومبر ۱۹۵۹ء سے لے کر فروری ۱۹۶۰ء تک تقریباً سوا تین ماہ بحرین، سعودی عرب (نجد و حجاز) شرق اردن، فلسطین، شام و مصر اور کویت کا ایک طویل اور مفصل مطالعاتی دورہ کیا۔ مولانا مرحوم نے اپنی مشہور تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں بھی

مختلف مقامات پر اس دورے سے حاصل شدہ معلومات کا ذکر کیا ہے۔ علوم قرآنی کے شائقین اور محققین کے لیے یہ مفید اور دلچسپ معلومات علم کا ایک خزانہ ہے جس کے ذریعے بلاد طیبہ کے مستند اور مفصل حالات، سرزمین انبیاء کی تفصیل، ان علاقوں کی قدیم اقوام کی سرگزشت، ان کے ساکن کے نشانات، بعض اہم نقشے اور ان ممالک کی اس دور کی اہم علمی شخصیات سے تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مفید معلومات کئی ضخیم کتابوں کے مطالعہ اور بڑی جستجو سے بمشکل ہی حاصل ہو سکی ہیں جو تفہیم کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔35

o-- مودودی صاحب نے بالخصوص اسلامی تاریخ اور بالعموم تاریخ ہندوستان سے متعلق مواد میں اردو زبان میں اتنا گرانقدر اضافہ کیا ہے کہ اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ تفہیم القرآن، خلافت و ملوکیت، تجدید احیائے دین، دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے تعلقات پر ایک نظر، اور دکن کی سیاسی تاریخ سلاطین کے علاوہ آپ کے خطبات، تقاریر کے مجموعے، مکاتیب کا ذخیرہ اور متعدد مضامین جو انفرادی اور مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے مخزن تاریخ میں بہترین اضافہ ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔36 جبکہ ہر تصنیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا کی ایک درجن سے زیادہ اہم زبانوں میں آپ کی تحریرات کے ترجمے شائع ہو کر پھیل چکے ہیں اور شرق اوسط، یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں آپ کی کتابیں کورس میں شامل ہیں۔37

o-- سید مودودی کی تاریخ نویسی کی انفرادیت ان کے طرز تحریر سے دو چند ہو جاتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ترکیب، عبارت کی بندش، پیرگراف کی تقسیم اور مضامین کی ترتیب مل کر ان کی تحریر کو واضح اور محکم بناتے ہیں، ان کا ہر مقالہ ایک ایسی دلکش تصویر کی مانند ہوتا ہے جس کا ہر خط واضح اور موزوں اور ہر رنگ مناسب اور نمایاں ہو۔ ان کی دلیل سے اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر ان کی تحریر کو مبہم اور غیر واضح کبھی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ الفاظ کو ایک ماہر صناع کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں اور ان کو خیالات کے ابلاغ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ معنیٰ کو چھپانے کا پردہ کبھی نہیں بننے دیتے۔38

مولانا کے طرز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ماہر القادری لکھتے ہیں ''اردو زبان میں مولانا مودودی کی تحریروں پر ادب عالیہ کا اطلاق ہوتا ہے، فکر بھی بلند اور اسلوب اظہار بھی حسین،'' اس کو عروس جمیل درلباس حریر'' کہا جاتا ہے۔ صورت اور معنی دونوں دلکش اور ان کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے گلستان میں آ گئے۔39

مولانا مودودی نے اردو میں تاریخ نگاری میں ایک نئے اسلوب کو متعارف کرایا ہے۔ اردو میں سرسید، مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی کے منفرد اسالیب سے کون واقف نہیں ہے۔ سرسید کے ہاں عبارت کی رنگینی اور الفاظ کا شکوہ نہیں ملتا مگر ان کی پرخلوص سادگی اور سلاست میں بڑی قوت اور تاثیر ہے۔ اور ان کا بیان واقعی دل میں اتر جاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے اسلوب میں پہاڑوں کا جلال، موجوں کی تندی اور دریاؤں کی روانی ہے۔ شبلی کا انداز رنگینی اور سلاست کا دل آویز امتزاج ہے۔ عبدالماجد کے چھوٹے چھوٹے فقرے شبنم کی لطافت مگر تلوار کی کاٹ رکھتے ہیں۔ لیکن سید مودودی کا اسلوب بیان بڑا جاندار، پراثر اور شگفتہ ہے۔ وہ اپنے خیال کو بڑی صفائی، زور اور صحت کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور ایسے مناسب اور بچے تلے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اس سے بہتر الفاظ اس خیال کے لیے ممکن نہیں۔ ان کا طرز (موجودہ عہد کے لیے) شبلی اور ابوالکلام آزاد، دونوں سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ عوامی ہے۔ ان کے اسلوب میں خیال اور بیان کا آہنگ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔40

5۔۔ سید مودودی کی تاریخ نویسی کی ایک اور خوبی زبان کی صحت کا اہتمام ہے جو ان کی تربیت کا حصہ تھی۔ ان کے والد نے اپنے بیٹے کی صاف اور پاکیزہ زبان کا خیال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب مودودی کی زبان دہلی کے شرفاء اور ادباء کی زبان تھی۔ اس کا اعتراف انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے جو مولانا ماہر القادری کو تحریر کیا تھا:

''برادرم! زبان کے معاملے میں آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی صحت کا سخت اہتمام کرتا ہوں اور اس باب میں دہلی ہی کی زبان کا

پابند ہوں ۔41

ماہر صاحب کو ہی اپنے ایک اور خط میں مزید تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

''اگر چہ مجھے زبان میں سند ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، لیکن اردو بولتے، لکھتے، سنتے اور پڑھتے تقریباً پچاس برس گزر چکے ہیں اور میں صحت زبان کے معاملے میں ہمیشہ متشدد رہا ہوں، میری زبان میں الفاظ کے ایسے استعمالات تو پائے جاسکتے ہیں جن میں اہل زبان کے درمیان اختلاف ہے، لیکن زبان کی غلطی آپ میرے ہاں مشکل ہی سے پاسکتے ہیں۔ پچھلے پچاس سال کے دوران میں زبان کے اندر جو تغیرات ہوئے ہیں ان کا عکس بھی آپ کو میری تحریروں میں نظر آئے گا، کیونکہ الفاظ کے جو استعمالات متروک ہوتے گئے ہیں ان کو میں بھی چھوڑتا چلا گیا ہوں اور نئے استعمالات کو اختیار کرتا رہا ہوں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ پچھلے ۲۰ سال میں تقسیم کی بدولت اردو زبان و ادب پر جو شدید بحرانی کیفیت طاری ہوئی ہے اس میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ زبان کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اور اس کے صحیح معیار کو برقرار رکھا جائے۔42

۵۔۔ سید مودودی کی تحریر کی خوبی سادہ اور قابل فہم الفاظ پر مشتمل ہونا ہے وہ ثقیل الفاظ کے استعمال سے بتوجہ خاص گریز کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخی تصانیف خصوصاً تفہیم القرآن جو اگر چہ تفسیر قرآن ہے اس میں بیان کردہ واقعات کی وضاحت تاریخی اعتبار سے سہل انداز میں جتنی خوبصورتی سے مودودی صاحب نے کی ہے اس نے ان کو اسلاف و معاصرین میں نمایاں کر دیا ہے۔ سورہ النساء کے شان نزول اور مباحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

حیثیت بحیثیت مجموعی سورہ کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانے کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ سورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد لی جاسکے۔ نبی اکرمؐ کے سامنے اس وقت جو کام تھا اسے تین بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک نئی منظم اسلامی سوسائٹی کی نشوونما جس کی بناء ہجرت کے ساتھ ہی مدینۂ طیبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور تدبیر مملکت کے نئے اصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دوسری اسی کشمکش کا مقابلہ جو مشرکین عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالف اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدت سے جاری تھی، تیسرے اسلام کی دعوت کو ان مزاحم طاقتوں کے علی الرغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنا''۔[43]

سورہ انفال کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔قبل اس کے کہ اس سورہ پر تبصرہ کیا جائے، جنگ بدر اور اس سے تعلق رکھنے والے حالات پر ایک تاریخی نظر ڈال لینی چاہیے۔

''نبی اکرمؐ کی دعوت ابتدائی دس بارہ سال میں، جب کہ آپ مکہ معظمہ میں مقیم تھے، اس حیثیت سے اپنی پختگی و استواری ثابت کر چکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت، عالی ظرف اور دانشمند علمبردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرز عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اٹل ارادہ رکھتا ہے اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو انگیز کرنے اور ہر مشکل کا

مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں کوئی ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور دماغوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اور جہالت جاہلیت اور تعصبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے عرب کے پرانے نظام جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر، جو ابتداء اس کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے، مکی دور کے آخری زمانے میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا زور اسے کچل دینے میں صرف کر دینا چاہتے تھے"۔44

سید مودودی کی تحریر کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے جناب احمد ندیم قاسمی نے ان کی وفات پر اپنے تعزیتی کلمات میں کہا تھا "ان (سید مودودی) کی تصانیف بیشتر اسلامیات یا پھر سیاست سے متعلق ہیں، مگر ان کا کٹر سے کٹر مخالف بھی اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ ان کا سا انداز تحریر بہت کم علمائے دین کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ نہ عبارت آرائی کرتے ہیں اور نہ ان کے جملوں میں فالتو الفاظ کا گزر تھا۔ یہ ان کی مربوط اور مدلل تحریروں کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں کا بھی ایک بڑا طبقہ ان سے متاثر ہوا جنھوں نے صرف مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی دین و سیاست کے علاوہ علم و ادب کی دنیا میں اپنی نگارشات کے دم سے زندہ ہیں۔45

-5 سید مودودی کی شخصیت اور تحریر کی ایک بڑی خوبی اپنی تحریروں میں کسی کمی کی نشاندہی پر نظر ثانی کرنا اور اصلاح کرنا تھی۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں "الجہاد فی الاسلام" میں جو مولانا کی بالکل ابتدائی کتاب ہے۔ اس وقت کی آراء میں اختلاف کی میں نے نشاندہی کی تو مولانا نے بڑی پیاری بات کہی۔ انھوں نے فرمایا "لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کا ذہن بھی ترقی کرتا ہے اور اس کا فکر بھی ارتقاء کے مراحل سے گزرتا ہے۔ میرے ذہنی ارتقاء کے پس منظر سے کاٹ کر کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں میں نے چند آراء قائم کی تھیں۔ تحقیق و جستجو کے بعد کچھ میں نے ترمیم بھی کی ہے۔ ایک زندہ اور سوچنے والا دماغ ایسا ہی

کرنے کا میں نے یہ کب دعویٰ کیا کہ ایک رائے ظاہر کرنے کے بعد میں سوچنا بند کر دیتا ہوں۔46

مولانا سعد الدین خان کو خط کے جواب میں مودودی صاحب کی یہ خوبی مزید نمایاں ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں ہر چیز کے حوالے دے دئے ہیں۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میری کوئی بات حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر میری تحریر میں کوئی چیز علمی حیثیت سے غلط ہو تو اس کی غلطی علمی دلائل وشواہد سے ثابت کی جائے۔47

5۔ سید مودودی کی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس سے متعلق تمام ممکنہ بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا۔ اپنی تصنیف سلاجقہ میں وہ تاریخ سلاجقہ کے مآخذ کے بارے میں لکھتے ہیں "اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ ان سب کی فہرست درج کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ دوران تحریر حسب مواقع ان کے حوالے دے دئے گئے ہیں۔ البتہ یہ بیان کرنے کی یقیناً ضرورت ہے کہ ہمارے پاس سلجوقیوں کی تاریخ معلوم کرنے کے اصلی ذرائع کون سے ہیں اور کس حد تک قابل وثوق ہیں۔48

مآخذ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے یار محمد خان کو خط کے جواب میں لکھتے ہیں "جو علمائے کرام میرے بیان اور واقعات کو غلط کہتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ جن کتابوں کے میں نے حوالے دیئے آیا وہ غلط ہیں یا میرے حوالے غلط ہیں؟ اگر میرا کوئی حوالہ غلط ہو تو براہ کرم اس کی نشاندہی کر دیں اور اگر یہ سارے حوالے صحیح ہیں تو پھر ان کو صاف صاف کہنا چاہیے کہ ابن سعد کی کتاب طبقات، ابن عبدالبر کی کتاب استیعاب اور ابن جریر اور ابن اثیر کی تاریخیں سب غلط ہیں۔ پھر ان علماء کرام سے پوچھیے کہ آپ کو کن ذرائع سے اصل تاریخ معلوم ہوئی۔ کیا الہام کے ذریعے سے اس کا علم آپ تک پہنچا ہے؟ یا کوئی پوشیدہ تاریخیں صرف آپ ہی کے پاس ہیں جن کی بناء پر آپ کہتے ہیں کہ تاریخ کی معروف کتابوں میں جو واقعات لکھے ہیں وہ غلط ہیں اور صحیح واقعات صرف آپ کو معلوم ہیں۔49

مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخی تصنیف "تاریخ ہندوستان" کے مقدمے میں تاریخ نگاری کے چند

اصولوں کا اعادہ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "اکثر تاریخ کی کتابوں میں وہ کم چھوڑ دیا جاتا ہے جس کو حقیقت میں تاریخ کہتے ہیں......... پس جس بات کا جاننا ناگزیر ہے وہ قوم کی خصوصیات اور عادات اور اوضاع و اطوار کی تاریخ ہے"۔50 سید مودودی نے بھی اسی اصول کے تحت "تاریخ سلاجقہ" تحریر کی اپنے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ہمارا مقصد صرف سیاسی تغیرات ہی کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ تہذیب وتمدن کی تاریخ بھی مطلوب ہے۔51

- ۵ تاریخ کو سائنس کی ایک شاخ قرار دیا گیا۔ سب سے اول جس شخص نے علم تاریخ کو سائنس یعنی علوم حکیمیہ میں سے ایک علم قرار دیا ابن خلدون تھا۔52 سید مودودی نے تاریخ کے سائنسی پہلو کو اجاگر کیا۔ وہ کہتے ہیں "تاریخ اپنے سینے میں معلومات کا ایک وافر ذخیرہ رکھتی ہے لیکن اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی۔53 چنانچہ ذخیرہ معلومات کو پوری طرح مفید اور کارآمد بنانے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ اسے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مرتب کیا جائے اور تاریخ کے ایک محقق طالب علم کی طرح واقعات پر بے لاگ تنقید کی جائے۔ اگر ہمیں اپنے اسلاف کے کاموں اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے تو سوانح نگاری کے قدیم طرز میں کافی ترمیم کے عقیدت مندی کے عنصر کو کم اور تنقید و تحقیق کے عنصر کو بڑھانا ہوگا۔54

پروفیسر ضیاء الدین بدایونی (سابق صدر شعبہ فارسی، علیگڑھ یونیورسٹی) مولانا مودودی کے سائنٹیفک نظریۂ تاریخ کو تمثیلاً بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولانا "نبوت محمدی" کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کے لیے اوّل دنیا اور خصوصاً عرب کی اخلاقی اور سماجی تاریخ پر تبصرہ فرماتے ہیں اور اس ماحول کا نقشہ کھینچتے ہیں جس میں رسول اللہ پیدا ہوئے۔ آپ کے معصوم بچپن اور جوانی کا ذکر کرنے کے بعد وہ آپ کی بعثت، تعلیمات، مکہ والوں کی مخالفت اور آپ کی استقامت کا تذکرہ کرتے ہیں۔55

رسول اللہ کے ہاتھوں پیغامِ الٰہی کی کامیاب دعوت کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں۔

آپ پر خدا کے محیر العقول اور معجزانہ پیام جس کی ظاہری فصاحت اور بلاغت کی مثال (عربی میں ہونے کی

باوجود) کلامِ عرب میں ہی نہیں بلکہ خود آنحضرت کے اسلوب میں اور اس پیام میں بھی نمایاں فرق ہے۔ کسی قسم کی فوجی تربیت نہ ہونے کے باوجود آپ کا حیرت انگیز حربی تدبیر اور فوجی تنظیم، عرب جیسے اور جاہل ملک میں پرورش پا چکنے کے بعد آپ کا دنیا کو ایک قانون اور حکیمانہ نظامِ حکومت عطا فرمانا پھر اوّل سے آخر تک آپ کی اعلیٰ اور مثالی زندگی اور اسی کے ساتھ وہ صالح اور گہرا اثر جو اس زندگی نے دنیا کے کروڑوں نفوس پر چھوڑا یہ وہ حقائق ہیں جن کو اگر بے تعصبی کی نظر سے دیکھا جائے اور ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو شاید دنیا کا کوئی انصاف پسند عاقل متنفس بھی اس مقدس انسان کے مامور من اللہ ہونے میں شک نہیں کر سکتا۔ ہمارا یہ یقین ہے کہ اگر یہ سائنٹیفک طریقِ استدلال آنحضرت کی نبوت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے تو دنیا میں کسی پیغمبر کی نبوت بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس پر کیا موقوف ہے پھر تو آفتاب کی گرمی اور آگ کی روشنی کا دعویٰ بھی بے دلیل رہے گا۔56

۵۔ سید مودودی کی تاریخ نویسی میں اختصار اور جامعیت نمایاں ہے۔ اس کی مثال ان کی تصنیف تجدید واحیائے دین ہے جس میں آپ نے اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش، کارِ تجدید کی نوعیت، امت کے چند بڑے بڑے مجدد دین اور ان کے کارنامے'' کے عنوان کے تحت عمر بن عبدالعزیزؒ، ائمہ اربعہ، امام غزالی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کاموں کے جائزے کے علاوہ ضمیمہ میں منصب تجدید اور امام مہدی کے متعلق چند تصریحات بیان کی ہیں۔ کتاب میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے ان میں ہر ''موضوع'' اپنی جگہ ایک پوری کتاب کا متقاضی ہے، لیکن سید مودودی نے نہایت خوبی کے ساتھ تمام موضوعات کو سمیٹ کر کوزے میں بند کر دیا اور تشنگی بھی نہ چھوڑی۔ کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سید مودودی کو تلخیص کا ملکہ بھی حاصل تھا۔

سید مودودی کے تاریخی اصول و نظریات کے مختصر جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک تاریخ نگار کے فرائض و ذمہ داریوں کے اعتبار سے سید مودودی ایک بلند نصب العین کے حامل تھے۔ انھوں نے نہایت دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ قدیم مآخذ کی مدد سے تفسیر القرآن (تفہیم القرآن) میں قرآن

کے بیان کردہ تاریخی واقعات کو تحقیق و تنقیح کے ساتھ بیان کر کے تفہیم القرآن کو تاریخی حیثیت دے دی۔

اسی نقطہ نظر سے خلافت و ملوکیت تحریر کی، جب کہ حاصل شدہ سرکاری دستاویزات کی مدد سے دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے تعلقات پر ایک نظر، اور ہندوستان کا صنعتی زوال تحریر کیں۔ جب کہ دکن کی سیاسی تاریخ کے عنوان سے دکن کی ایک مبسوط اور مفصل تاریخ لکھی، اس کتاب میں جو نادر اور محققانہ مواد پیش کیا گیا ہے وہ شاید کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔57 ان کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان تاریخی واقعات کو بھی بیان کیا ہے جن سے دیگر مصنفین نے صرف نظر کیا ہے۔ اگرچہ خلافت و ملوکیت پر مصنف کے نکتہ نظر سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے اور اختلاف بلکہ شدید ردعمل کا اظہار کیا بھی گیا ہے تاہم اس کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، جناب مودودی کی تاریخ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مولانا کی عبارت کی خصوصیت ان کا تجزیہ مسائل اور جزئیات پر نظر ہے۔ یہ وصف ان کی بالغ نظری اور علومِ جدیدہ سے آگاہی کا نتیجہ ہے۔ جدید حالات، نئی ایجادات اور روز افزوں معاشی اور سماجی تغیرات نے زندگی کے ہر شعبہ میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دی ہیں۔ جن میں بعض کی ضرب مذہب پر بھی پڑتی ہے۔ جو عالمِ دین نئے واقعات اور جدید تقاضوں سے کماحقہٗ واقف نہیں وہ ان امور میں کوئی صائب رائے دینے کے اہل نہیں ہو سکے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودی نے جدید مسائل کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ہر شعبہ سے متعلق اعداد و شمار فراہم کیے ہیں۔58
>
> میرے خیال میں مولانا مودودی ان معدودے چند مفکرِ اسلام میں سے ہیں جن کو مجمع البحرین کہنا چاہیے۔ یعنی جو قدیم و جدید اسلحہ سے

آراستہ ہو کر بہادرانہ ہمت و باحسان کا کردار ادا کر رہے ہیں ۔59

سید مودودی کے تاریخی اصول ونظریات کے جائزے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہوتی ہے کہ ان کے تاریخی نظریات اور تاریخی کاوشوں سے شدید اختلاف کے باوجود عصر حاضر کے تاریخ نگاروں میں ان کا مقام وشخصیت ممتاز اور نمایاں ہے۔ انہوں نے تاریخ کا جو قرآنی اور ادبی اسلوب متعارف کرایا ہے اس کی جھلک دیگر تاریخ نگاروں میں نہ صرف خال خال نظر آتی ہے بلکہ اکثر نے اس کی پیروی بھی کی ہے۔

حوالہ جات

1- آفاقی، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ص ۶۳،محولہ بالا

2- ''مولانا اپنی اور دوسروں کی نظر میں''۔ص ۵۱،محولہ بالا

3- عاصم،نعمانی۔(مارچ ۱۹۹۳ء)،سیّد مودودی کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات، بار دوم، لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔ص ۱۸۱

4- ایضاً،ص ۱۸۲

5- ایضاً

6- دعوت وتحریک،ص ۵۲

7- مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں،ص ۵۱

8- ایضاً،ص ۵۲

9- سیّد مودودی کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات،ص ۳۹۴

10- ایضاً

11- ندوی، خواجہ اقبال احمد۔(جون ۲۰۰۸ء)، مولانا مودودی کی رفاقت میں، طبع اوّل، لاہور: ادارہ مطبوعات سلیمانی،ص ۲۲

12- ایضاً

13- عاصم،نعمانی۔ مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، خط نمبر ۹۲، جون ۱۹۷۰ء، طبع اوّل، لاہور: ایوان ادب، جلد اوّل،ص ۱۲۱

14- ایضاً،ص ۱۲۱

15- ندوی، محمد عمران۔ ''مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں'' ۱۹۴٦ء، اشاعت اوّل، اعظم گڑھ: معارف پریس، ص ۲۷

16- خورشید احمد، پروفیسر۔ ''ادبیات مودودی'' (دسمبر ۱۹۷۲ء)، اشاعت اوّل، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ص ۲٦۰

17- ایضاً، ص ۲٦۱

18- سفیر، اختر۔ ''بیادِ سید مودودی'' (جون ۱۹۹۸ء)، اشاعت اوّل، لاہور: دارالمعارف، ص ١٦

19- تجدید و احیائے دین، ص ۹ بحولہ بالا

20- ایضاً، ۱۲۷۔۱۲۸

21- ایضاً، ص ۱۲۹

22- ایضاً، ص ۷۳

حواشی۔ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں ایسی تمام احادیث کو جمع کر دیا ہے جنہیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں درج کیا ہے اور جن کی کوئی سند نہیں ملتی۔ (ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ حصہ چہارم، ص ۱۴۵ تا ۱۸۲) (بحوالہ ایضاً)

23- تجدید و احیائے دین، ص ۷۳

24- ادبیات مودودی۔ ص ۲٦۳

25- ایضاً، ص ۲٦۴

26- ایضاً، ص ۲٦۵

27- ایضاً، ۲٦٦

28- ایضاً، ۲٦۷

29- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ ''تفہیمات'' (ستمبر ۱۹۹۱ء)، اشاعت ۱۷، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، جلد اوّل، ص ۱۵۵

30- ادبیات مودودی، ص ۲۱۷۔ ۲۱۸

31- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ ''تفہیمات'' (فروری ۱۹۹۷ء)، اشاعت سوم، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، جلد دوم، ص ۲۹۳

32- ایضاً، ص ۲۶۶۔ ۲۶۷

33- ایضاً، ص ۲۸۴

34- ایضاً، ص ۲۷۹

35- حامدی، خلیل احمد۔ ''مولانا مودودی کا سفر سعودی عرب'' نومبر ۲۰۰۱ء، اشاعت اوّل، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ص ۹

36- خورشید احمد، پروفیسر۔ ''اسلامی تحریکات اور اکیسویں صدی کے چیلنج'' ترجمان القرآن، مئی ۲۰۰۴ء، اشاعت خاص۔۲، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۱

37- ''ادبیات مودودی'' ص ۱۸

38- ادبیات مودودی، مقدمہ ص ۳۲

39- ایضاً، ص ۱۴۴

40- محمد عثمان، پروفیسر۔ سیّد مودودی کا علمی رتبہ، ترجمان القرآن، (مئی ۲۰۰۴ء)، محولہ بالا، ص ۵۵۹

41- نعمانی، عاصم۔ ''مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی'' جون ۱۹۷۰ء، طبع اوّل، لاہور: ایوان ادب، خط نمبر ۱۴۱، ص ۱۹۴

42- ایضاً، خط نمبر ۱۴۵، ص ۲۰۴

43- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ ''تفہیم القرآن'' ص ۳۱۷، جلد اوّل

44- ''تفہیم القرآن، ص ۱۱۸، جلد دوم

45- سفیر، اختر۔ ''ادب اور ادیب، سیّد مودودی کی نظر میں'' (جنوری ۱۹۹۸ء)، لاہور: دارالمعارف، ص ۱۳

46- خورشید احمد، پروفیسر۔ ''تذکرۂ زنداں'' (ستمبر ۱۹۶۵ء)، اشاعت اوّل، کراچی: مکتبہ چراغ راہ، ص ۲۷۱

47- مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، جلد اوّل، خط نمبر ۱۱۶، ص ۱۶۴، محولہ بالا

48- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ ''سلاحقہ''

49- مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، جلد اوّل، خط نمبر ۱۱۸، ص ۱۶۸

50- ذکاء اللہ، مولوی۔ (۱۹۹۸ء)، تاریخ ہندوستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۶۱، جلد اوّل

51- ''سلاحقہ'' ص ۳۸، محولہ بالا

52- ''تاریخ ہندوستان'' ص ۱۵

53- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (اکتوبر ۱۹۲۸ء)۔ ''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ: سیاسی تعلقات پر ایک نظر'' دہلی: جید برقی پریس، دیباچہ

54- ''ادبیات مودودی'' ص ۲۲۸۔ ۲۲۹

55- بدایونی، ضیاء احمد، پروفیسر۔ ''سیّد مودودی نے اردو زبان کو ایک مؤثر اور دلکش اسلوب دیا ہے'' جسارت، ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء، اشاعت خصوصی

56- ایضاً

57- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ ''دکن کی سیاسی تاریخ'' ص ۴۳

58- ''مولانا مودودی نے اردو زبان کو ایک مؤثر اور دلکش اسلوب دیا ہے'' جسارت، محولہ بالا

59- ایضاً

باب پنجم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تاریخی نگارشات

سید مودودی کی تاریخی نگارشات

بیسویں صدی کے زعماء میں نمایاں نام سید ابوالاعلی مودود ہے جنھوں نے تفسیر قرآن، سیرت نگاری، تاریخ اسلامی، علوم اسلامی، نظریات اسلامی اور تاریخ ہندوستان کو احاطہ تحریر میں لاکر اردو زبان کو اتنا معتبر کر دیا کہ ان کی تصنیف کردہ کتب کے کئی ممالک نہیں بلکہ کئی براعظموں میں بولی جانے والی زبانوں میں ترجے ہوئے اور سید مودودی ایک بین الاقوامی عالم، مفکر، ادیب اور مورخ کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے تاریخ میں امر ہو گئے۔

سید مودودی کی انفرادیت یہ ہے کہ اگرچہ ان سے قبل برصغیر کی کئی نامور اور معتبر شخصیات ان موضوعات پر کام کر چکی تھیں لیکن ان کی تحریریں اردو میں ہونے کے باوجود عام فہم نہ تھیں بلکہ عربی و فارسی کی اسیر تھیں جب کہ سید مودودی کی تصانیف و تالیفات خالص اردوئے معلی کا زیر اثر ہونے کے باعث آسان فہم تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تصنیف کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ جناب ایس ایم ظفر (ماہر قانون و سیاست) نے سید مودودی کے انتقال پر تعزیتی کلمات میں جناب مودودی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی عالمی شہرت کے حامل، عظیم مذہبی مفکر، ایک عہد آفرین اور تاریخ ساز شخصیت تھے۔ مرحوم اسلامی قانون پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی رہنمائی کی۔ اسلام کی ترویج کے لیے ان کی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا اظہار ممکن نہیں۔[1]

سید مودودی اَن گنت تصانیف و تالیفات کے مصنف و مولف ہیں لیکن بالخصوص تاریخ نگاری پر ان کی نگارشات تفہیم القرآن، تجدید و احیائے دین، خلافت و ملوکیت، سلاجقہ، دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ، دکن کی سیاسی تاریخ ہیں۔ جن میں آپ نے موضوع کے اعتبار سے اسلامی تاریخ، ہندوستان کی تاریخ اور

سلاجقہ کی صورت میں وسط ایشیاء کی تاریخ سے متعلق بیش بہا تاریخی معلومات اور تاریخی مواد کو یکجا کر دیا ہے، جس کی مدد سے سید مودودی کی تاریخ نویسی کا فنی و تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

تفہیم القرآن:

سید موجودی کی معرکہ آراء تصنیف اردو میں قرآن کی تفسیر تفہیم القرآن ہے۔ جس کی تکمیل میں تیس سال لگے۔ اس کی اہم ترین خصوصیت قرآن کے معنی اور پیغام کو ایسی زبان و انداز میں پیش کرنا ہے جو آج کے انسان کے دل و دماغ میں اتر جائے اور وہ جان لے کہ اس روز مرہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے مسائل سے قرآن کا کیا تعلق ہے۔ آپ نے قرآن کی ترجمانی دور حاضر کی سلیس اور پر زور اردو روز مرہ میں کی ہے۔ آپ کا یہ ترجمہ، قرآن کے عام لفظی تراجم سے فصیح تر اور ابلاغ کی اعلیٰ سطح پر پورا اترتا ہے۔ آپ نے قرآن کو انسانی زندگی کی کتاب ہدایت اور اس ہدایت کو انسانی زندگی میں نافذ و ساری کرنے والی تحریک کی رہنما کتاب کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس تفسیر نے برصغیر میں، بلکہ (اپنے ترجموں کے ذریعے) بیرونی دنیا میں ہم عصر اسلامی فکر پر دوررس اثرات مرتب کیے ہیں۔2

سید مودودی کی مورخانہ عظمت پوری شان کے ساتھ تفہیم القرآن میں نظر آتی ہے۔ تفہیم کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ صرف تفسیر ماثور یعنی روایات کی بنیاد پر لکھی جانے والی تفسیر نہیں بلکہ اس میں مولانا مودودی نے اسلام کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کے ساتھ بالخصوص تاریخی پہلوؤں کو بھی نہایت خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ حدیث وسنت کے قدیم ماخذ سے استفادے کے ساتھ تحقیق و تنقیح کے اصولوں کی بنیاد پر تاریخ کو بیان کیا ہے اس بارے میں وہ کہتے ہیں:

> ''میں پچھلے زمانے کے ائمہ حدیث و تفسیر ہی سے استفادہ کرتا ہوں اور ان کا پورا ادب ملحوظ رکھتا ہوں، مگر کسی کی بات بھی صرف اس بناء پر نہیں مان لیتا کہ یہ فلاں بڑے شخص نے کہی ہے بلکہ خود بھی اپنی

آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے دماغ سے سوچتا ہوں اور جو بات حقیق سے مجھے معلوم ہوتی ہے اسے مانتا ہوں اور جو غلط معلوم ہوتی ہے اسے چھوڑ دیتا ہوں''۔3

برصغیر میں لکھی جانے والی دیگر تفاسیر کے تناظر میں تفہیم القرآن اس وجہ سے امتیازی مقام کی حامل ہے کہ تاریخی واقعات کو گہرے مطالعہ اور تحقیق کے بعد جتنی جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ طالبان حق کی قرآن، حدیث اور تاریخ سے آگاہی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ تفہیم کے ذریعے سید مودودیؒ نے تفسیر قرآن کا تاریخی پہلو اجاگر کر کے ایک نئے منہج تفسیر کی بنیاد ڈالی ہے کہ اس کے بعد لکھی جانے والی تفاسیر میں تاریخ کے اسی نہج کی پیروی کی گئی ہے ان میں فی ظلال القرآن، ضیاء القرآن اور تدبر قرآن نمایاں ہیں۔

تفہیم القرآن کی ایک اور خصوصیت جو اس کی انفرادیت کو دوام بخشتی ہے، یہ ہے کہ اس میں قرآن کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کی بحث کو نہیں دہرایا گیا ہے بلکہ زبان کی سلالت اور سہل فہمی نے دیگر تفاسیر کے مقابلے میں تفہیم القرآن کو عام آدمی کے قلب و ذہن تک پہنچایا ہے۔ سید مودودی نے آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کر کے اس کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔ تفہیم القرآن کے دیباچے میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں پابندی لفظ کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں بلکہ جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقہ پر انجام دے چکے ہیں۔4 لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمے سے پوری نہیں ہوسکتیں۔5 کیونکہ قرآن مجید کی ہر صورت دراصل ایک تقریر

ھی جو دعوتِ اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہوتا تھا، کچھ مخصوص حالات اس کا تقاضہ کرتے تھے اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پورا کرنے کے لیے وہ اترتی تھیں۔ اپنے اس پس منظر اور اپنی شان نزول کے ساتھ قرآن کی ان سورتوں کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا اور قرآن کا پورا مدعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں''۔6

سید مودودی نے ترجے کی اس خوبی کو اس کی پوری روح کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

اگرچہ سید مودودی نے (از خود) اپنی تحریر کردہ تفسیر کے تاریخی پہلوؤں کو نمایاں نہیں کیا ہے لیکن ہر صورت کی ابتداء میں انھوں نے دیباچے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اسلامی تاریخ کا نچوڑ ہے، جو بالخصوص سیرت نبوی اور بالعموم اسلامی تاریخی دونوں پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔ وہ دیباچے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ارشادات کا پس منظر بھی آدمی کے سامنے ہو اور یہ چیز ترجمانی میں پوری طرح نمایاں نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر سورہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے، جس میں اپنی حد تک پوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ سورہ کس زمانے میں نازل ہوا اس وقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلے میں تھی، کیا اس کی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اس وقت درپیش تھے''۔7 جو لوگ اس کتاب سے پورا فائدہ

اٹھانا چاہتے ہیں ان کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ پہلے ہر سورہ کے دیباچے پر نظر ڈالتے رہیں"۔8

قرآن میں انبیاء کرام کی تبلیغی سعی و جدوجہد، ان کی قوموں کے عروج اور اللہ کی نافرمانی اور انبیاء کی حکم عدولی کے باعث ان قوموں کا مائل بہ زوال ہونے کے واقعات کو ضمناً بیان کیا گیا ہے۔ سید مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں ان اقوام کے عروج و زوال کی حکمتوں پر سیر حاصل بحث کی ہے اور امم بائدہ کی ہزاروں سالہ تاریخ کو نہایت خوبصورتی سے کوزے میں بند کر دیا ہے جو مولانا مودودی کی فن تاریخ نویسی کا نمایاں وصف ہے۔

ہبوط آدم سے لے کر خاتم النبین رسول اکرمؐ کے عہد تک کے واقعات کو تمام تر جزئیات کے ساتھ ضبط تحریر میں لانے کا آغاز دوسری، تیسری صدی ہجری سے ہو چکا تھا۔ اور عہد بعہد مورخین اسلام اور مستشرقین مختلف پہلوؤں سے اس سرمائے کو محفوظ رکھنے کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن اس سرمائے کا بیشتر حصہ روایتی اور بیانیہ انداز تحریر پر مشتمل ہے جب کہ سید مودودی کا شمار ان تاریخ نگاروں میں ہوتا ہے جو تاریخ کا تجزیاتی جائزہ لے کر واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کا مذہبی، سیاسی اور معاشرتی، معاشی گویا ہر رخ نمایاں ہوتا ہے۔ اختصار اور جامعیت کا جو کمال مولانا کی تاریخ نویسی میں نظر آتا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ سورہ قریش کے دیباچے میں عرب میں قریش کی اہمیت و اقتدار، ان کے حسن انتظام اور عرب کی اقتصادیات پر قریش کی اجارہ اور بین الاقوامی سطح پر تجارت کے فروغ میں قریش کی حکمت و تدبر کو مختصراً بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"قریش کا قبیلہ نبی اکرم کے جد اعلیٰ قصی بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قصی نے اس کو مکے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تولیت اسی قبیلے کے ہاتھ آگئی، اسی بناء پر قصیؔ کو مجمع (جمع کرنے والا) کا لقب دیا گیا۔ اس شخص نے اپنے اعلیٰ درجے کے تدبر

سے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد ڈالی اور جملہ اطراف عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قصیٰ کے بعد اس کے بیٹوں میں عبدالمناف کے چار بیٹے تھے ہاشم، عبدشمس، مطلب اور نوفل، ان میں سے ہاشم، عبدالمطلب کے والد اور رسول اکرمؐ کے پر دادا کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلاد مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہل عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تا کہ راستے کے قبائل ان سے مال خریدیں اور مکہ کی منڈی میں اندرون ملک تجار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی، جو شمالی علاقوں اور خلیج فارسی کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلاد مشرق کے درمیان ہوتی تھی، اس لیے جنوبی عرب سے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے خدام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے، حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے۔ اس کی بناء پر سب ان کے احسان مند تھے۔ انھیں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں تھا

کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل ان سے رہگزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اسکیم میں اپنے باقی تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبد شمس نے، یمن امراء سے مطلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ اس طرح ان لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اسی بناء پر یہ تینوں بھائی متجرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہوگئے اور جو روابط انھوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے۔ ان کی بناء پر ان کو اصحاب الایلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی الفت پیدا کرنے والوں کے ہیں''۔10

اس تجارت کے قریش کی ثقافت پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کی وضاحت کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

''اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہ راست سابقہ پیش آنے کے باعث ان کا معیار دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہوگئے اور مکہ، جزیرۃ العرب کا سب سے اہم تجارتی

مرکز بن گیا۔ ان بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس، قریش لوگوں کے لیڈر ہیں''۔11

قریش کی ترقیوں اور کامیابوں کے بیان کے ساتھ ہی سید مودودی نے ابرہ کی خانہ کعبہ پر لشکر کشی اور اس کی ناکامی کے قریشی اقتدار پر اثرات کا نتیجہ خیز تجزیہ کیا ہے۔ اگرچہ اس واقعہ کا سیاسی، مذہبی اور اقتصادی پس منظر اور ابرہہ کے انجام کو سید مودودی نے سورہ فیل کے دیباچہ اور سورہ کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن یہاں اس واقعہ کا ایک دوسرے پہلو سے جائزہ لے کر عرب میں قریش کے مقام واہمیت کی تاریخ کو مکمل کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قریش اس طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکہ پر ابرہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اس وقت ابرہہ اس شہر مقدس کو ختم کرنے اور کعبہ کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانہ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیتی اور قریش اس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی

قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ کر دیا اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گرتے چلے گئے تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدر جہا زیادہ مضبوط ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہوگئی۔ اب عربوں کو یقین ہوگیا کہ ان لوگوں پر اللہ کا فضل خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے، کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ ان لوگوں کو چھیڑتا یا انھیں چھیڑنا تو درکنار ان کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا''۔12

قریش کی تجارتی کامیابیوں اور عرب کی معاشی اجارہ داری نے انھیں مادہ پرست بنا دیا اور وہ روحانیت سے خالی محض ایک زبردست قوم بن کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کی اصلاح کے لیے انھی میں سے ایک نبی کا انتخاب کیا اور قریش کے قبیلے بنو ہاشم کو یہ اعزاز بخشا کہ ان میں سے ایک نبی محمدؐ کو منتخب کیا جوان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ گزار چکا تھا۔ رسول اللہ کے ذریعے قریش کا مذہبی اقتدار پورے عرب میں مزید معتبر ہوسکتا تھا۔ لیکن زر پرستانہ ہوس کے باعث خود قریش نے رسول اللہ کو بحیثیت نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا آغاز خود رسول اللہ کے سگے چچا ابولہب نے کیا جب کہ قبیلے کے دیگر افراد نے قبائلی روایت کی پیروی کرتے ہوئے اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رسول اللہ کی سرپرستی کی۔ سید مودودیؒ نے سورہ لہب کے دیباچے میں اسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملک عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور صدیوں سے یہ

حالت تھی کہ کسی شخص کے لیے اس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور قطع رحمی کو بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا اثر تھا کہ رسول اللہ جب اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور بنی مطلب (ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے ان خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے کبھی بھی بنی ہاشم اور بنی مطلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے آبائی دین سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے اور ان کا اپنے عزیز کی پشتبانی کرنا قریش اور اہل عرب سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا''۔13

اس اخلاقی اصول کو، جسے زمانہ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام دشمنی میں توڑ ڈالا اور وہ تھا ابولہب بن عبدالمطلب ۔ یہ رسول اللہ کا چچا تھا۔ حضور کے

والد ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے، عرب میں چچا، باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خصوصاً جب کہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا لیکن اس شخص نے اسلام دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔۱۴

جہاں تک دیگر قریش اور قوم عرب کا تعلق تھا ان کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا سورہ انعام کی آیت ۳۳ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''واقعہ یہ ہے کہ جب تک محمدؐ نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہیں کی تھیں آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق سمجھتے تھے۔ اور آپ کی راستبازی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے آپ کو جھٹلایا اس وقت جب کہ آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا اور اس دوسرے دور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ جو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو، آپ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملے میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے آپ کی جتنی تکذیب کی وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے خود نبیؐ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ''ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں ایسے جھوٹ قرار دیتے ہیں''۔ جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمد کو تم سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ اس نے جواب دیا کہ:

> ''خدا کی قسم محمد ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب
> لواء اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قصی ہی کے حصے میں
> آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟''15

اس مخالفانہ ماحول میں تیرہ سال تک محمد صلعم اللہ کے پیغام کو اپنی قوم تک پہنچاتے رہے۔ رسول اللہؐ کی اس سعی و جد و جہد کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودی سورہ انفال کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''نبی صلعم کی دعوت ابتداء دس بارہ سال میں جبکہ آپ مکہ معظمہ میں مقیم

تھے، اس حیثیت سے اپنی پختگی و استواری ثابت کرچکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت عالی ظرف اور دانش مند علمبردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرز عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہوچکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اٹل ارادہ رکھتا ہے۔ اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو انگیز کرنے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں خود ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور دماغوں میں سرایت کرتی چلی جارہی تھی اور جہالت و جاہلیت اور تعصبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہورہے تھے۔ اسی وجہ سے عرب کے پرانے نظام جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر جو ابتداء اس کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے مکی دور کے آخری زمانے میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا زور اسے کچل دینے میں صرف کردینا چاہتے تھے''۔16

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی تیرہ سالہ تبلیغی سعی کے پوری قوت کے ساتھ کامیاب نہ ہونے کا مدلل تجزیہ کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں'' چند حیثیات سے اس دعوت میں کچھ کسر باقی تھی (ا) اولاً یہ بات ابھی پوری طرح ثابت نہیں ہوئی تھی کہ اس کو پیروؤں کی ایک کافی تعداد بہم پہنچ گئی ہے جو صرف اس کے ماننے والے ہی نہیں بلکہ اس کے اصولوں کا سچا عشق بھی رکھتے ہیں۔ اس کو غالب اور نافذ کرنے کی سعی میں اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایۂ زندگی کھپا دینے کے لیے تیار ہیں۔17

اگرچہ مکہ میں پیروان اسلام نے قریش کے ظلم وستم برداشت کر کے اپنی صداقت ایمانی اور اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کی مضبوطی کا اچھا خاصہ ثبوت دے دیا تھا مگر ابھی یہ ثابت ہونے کے لیے بہت سی

آزمائشیں باقی ہیں کہ دعوت اسلامی کو جانفروش پیروؤں کا گروہ میسر آ گیا ہے جو اپنے نصب العین کے مقابلے میں کسی چیز کو بھی عزیز نہیں رکھتا۔18

۲۔ ثانیاً اس دعوت کی آواز اگرچہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی، لیکن اس کے اثرات منتشر تھے، اس کی فراہم کردہ قوت سارے ملک میں پراگندہ تھی، اس کو وہ اجتماعی طاقت بہم نہ پہنچی تھی جو پرانے جمے ہوئے نظام جاہلیت سے فیصلہ کن مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔

۳۔ ثالثاً اس دعوت نے زمین میں کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی بلکہ ابھی تک وہ صرف ہوا میں سرایت کر رہی تھی۔ ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ قدم جما کر اپنے موقف کو مضبوط کرتی اور پھر آگے بڑھنے کی سعی کرتی۔ اس وقت جو مسلمان جہاں تھا اس کی حیثیت نظام کفر و شرک میں بالکل ایسی تھی جیسے خالی معدے میں ''کنین'' کہ معدہ ہر وقت اسے اگل دینے کے لیے زور لگا رہا ہو اور قرار پکڑنے کے لیے اس کو جگہ نہ ملتی ہو۔

رابعاً۔ اس وقت تک اس دعوت کو عملی زندگی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ نہ یہ اپنا تمدن قائم کر سکی تھی، نہ اس نے اپنا نظام معیشت و معاشرت اور نظام سیاست مرتب کیا تھا اور نہ دوسری طاقتوں سے اس کے معاملات صلح و جنگ پیش آئے تھے اس لیے نہ تو ان اخلاقی اصولوں کا مظاہرہ ہو سکتا تھا جن پر یہ دعوت زندگی کے پورے نظام کو قائم کرنا اور چلانا چاہتی تھی، اور نہ یہی بات آزمائش کی کسوٹی پر اچھی طرح نمایاں ہوئی تھی کہ اس دعوت کا پیغمبر اور اس کے پیروؤں کا گروہ جس چیز کی دنیا کو دعوت دے رہا ہے اس پر عمل کرنے میں وہ خود کس حد تک راستباز ہے۔ بعد کے واقعات نے وہ مواقع پیدا کر دیئے جن سے یہ چاروں کمیاں پوری ہو گئیں۔19

مکی دور کی تبلیغی جدوجہد کے ساتھ مولانا مودودی نے جس دوسرے اہم واقعہ کا تجزیہ کیا ہے وہ بیعت عقبہ ہے۔ جس کی اسلامی تاریخ میں اہمیت دو چند ہے اور جس کا تذکرہ اکثر کتب تاریخ میں سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ مودودی اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مکی دور کے آخری تین چار سالوں

میں سے یثرب میں آفتاب اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ متعدد وجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ آخر کار نبوت کے بارہویں سال حج کے موقع پر ۷۵ نفوس کا ایک وفد نبی صلعم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلعم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا، اہل یثرب نبی صلعم کو محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام و فرمانروا کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بلاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظم معاشرہ بنالیں۔ اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو ''مدینۃ الاسلام'' کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلعم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنالیا۔20

اس پیش کش کے کیا خطرناک نتائج نکل سکتے تھے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں ''اس پیش کش کے معنی جو کچھ بھی تھے اس سے اہل مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور معاشی وتمدنی بائیکاٹ کے مقابلے میں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ بیعت عقبہ کے موقع پر رات کی اس مجلس میں اسلام کے ان اولین مددگاروں نے اس نتیجہ کو خوب اچھی طرح جان بوجھ کر نبی صلعم کے ہاتھ میں دیا تھا۔ عین اس وقت جب کہ بیعت ہو رہی تھی، یثربی وفد کے ایک نوجوان رکن اسعد بن زرارہ نے جو پورے یثربی وفد میں سب سے کم سن شخص تھے اٹھ کر کہا:

''ٹھہرو اے اہل یثرب! ہم لوگ جو ان کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے
ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انھیں یہاں سے نکال
کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے، اس کے نتیجے میں

تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم
اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو
اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر
چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو کیوں کہ اس وقت عذر کر دینا خدا
کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے''۔21

اسی بات کو وفد کے دوسرے شخص عباس بن عبادہ بن نضلہ نے دھرایا۔22 اس پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا ''ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں''۔ تب وہ مشہور بیعت واقع ہوتی ہے جسے تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔23

یہ بیعت گویا مسلمانوں کے لیے ایک مستقل پناہ گاہ کا دروازہ کھول رہی تھی جہاں رسول اللہ قریش کی دسترس سے محفوظ رہ کر تبلیغ اسلام کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے۔ لہٰذا قریش کی جانب سے مخالفانہ ردعمل ناگزیر تھا۔ اس ردعمل کے پیچھے قریش کے کیا مقاصد تھے سید مودودی ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''دوسری طرف اہل مکہ کے لیے معاملہ (بیعت عقبہ) جو معنی رکھتا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ دراصل اس طرح محمد صلعم کو، جن کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی قابلیتوں سے قریش کے لوگ واقف ہو چکے تھے، ایک ٹھکانہ میسر آ رہا تھا۔ اور ان کی قیادت و رہنمائی میں پیروان اسلام، جن کی عزیمت و استقامت اور فدائیت کو بھی قریش ایک حد تک آزما چکے تھے، ایک منظم جتھے کی صورت میں مجتمع ہوئے جاتے تھے۔ یہ پرانے نظام کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نیز مدینہ جیسے مقام پر مسلمانوں کی اس طاقت کے مجتمع ہونے سے قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ ساحل بحر احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا، مسلمانوں کی زد میں آ جاتی اور اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان نظام جاہلی کی زندگی استوار کر سکتے تھے۔ صرف اہل مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی ڈھائی لاکھ اشرفی

سالانہ تک پہنچی تھی۔ طائف اور دوسرے مقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔ 24

قریش ان نتائج کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا وہ اس خطرے کو روکنے کے لیے رسول اللہ کے قتل جیسے عمل پر آمادہ ہوگئے لیکن جب اللہ نے رسول اللہ صلعم اور مہاجرین کو خیریت سے مدینہ پہنچا دیا تو قریش نے دوسری چال آزماتے ہوئے مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی کو (جو رسول اللہ کی مدینہ آمد سے قبل مدینہ کا بادشاہ بننے والا تھا) خط لکھ کر رسول اللہ کی واپسی کا مطالبہ کیا بصورت دیگر مدینہ پر حملہ کرنے اور عورتوں بچوں کو غلام بنانے اور مردوں کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ عبداللہ بن ابی آمادۂ شر ہوا لیکن رسول اللہ نے بروقت اس شر کی روک تھام کر دی۔ 25

قریش کی منفی کارروائیوں کے سبب اسلام اور اس کے پیروکاروں کی حفاظت و دفاع کی ذمہ داری بحیثیت نبی و سربراہ ریاست رسول اللہ پر تھی۔ اس سلسلے میں رسول اللہ نے جو اقدامات کیے سید مودودی ان کے بارے میں کہتے ہیں ''چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی رسول اللہ نے نوخیز اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم ونسق اور اطراف مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ منعطف فرمائی وہ اسی شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے پر رسول اکرم نے دو اہم تدابیر اختیار کیں۔

۱۔ ایک یہ کہ مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل تھے ان سے حلیفانہ اتحاد یا ناطرفداری کے معاہدے کیے۔

۲۔ دوسری تدبیر آپ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لیے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کیے اور بعض دستوں کے ساتھ آپ خود بھی تشریف لے گئے۔ 26 ان مہمات کے دوران رسول اللہ نے جو خاص حکمت عملی اختیار کی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں ''ان تمام مہموں کو دو خصوصیتیں قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے کسی میں نہ تو کشت وخون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رخ بتانا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی تاخت میں بھی حضورؐ نے اہل مدینہ کا کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے

خالص ملی مہاجرین سے ہی مرتب فرماتے رہے تا کہ حتی الامکان یہ کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں الجھنے سے آگ نہ پھیل جائے''۔27

دوسری طرف قریش نے بھی ردعمل کے طور پر چھوٹی موٹی جھڑپوں کے ذریعے لوٹ مار کا سلسلہ شروع کیا جو بڑھتے بڑھتے بڑی جنگوں تک پھیل گیا۔حق و باطل کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ بدر کے مقام پر لڑی گئی جو رسول اللہ کی شمولیت کے باعث تاریخ میں ''غزوہ بدر'' کے نام سے مشہور ہے۔اس جنگ میں پیروان اسلام اور منکرین اسلام کا اسلحہ اور عددی طاقت کے اعتبار سے کوئی توازن نہ تھا۔مسلمانوں کے سامنے چھ سو زرہ پوش اور سو سواروں کی فوج تھی جن کے پیش نظر صرف یہی مقصد نہ تھا کہ ابوسفیان کی قیادت میں بھاری بھرکم منافع کے ساتھ شام سے آنے والے تجارتی قافلے کی حفاظت کریں بلکہ وہ اسی ارادے سے نکلے تھے کہ آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیں، مدینہ میں یہ مخالف طاقت جو ابھی نئی نئی مجتمع ہونی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آئندہ کے لیے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔28

ہجرت کے دوسرے سال ۱۷ رمضان المبارک کو بدر کے مقام پر مسلمان جن کی تعداد تین سو سے کچھ اوپر تھی (جن میں سے صرف دو تین کے پاس گھوڑے تھے سامان جنگ بھی ناکافی تھا صرف ۶۰ آدمیوں کے پاس زرہیں تھیں) اپنے سے بڑی قوت کے خلاف صف آراء ہوئے۔اس جنگ میں مسلمانوں کو جو صورت حال اور کیفیت تھی اس کا موازنہ کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں ''اس معرکہ کارزار میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرین مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند مقابل تھے کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آرہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔اس کڑی آزمائش سے صرف وہی لوگ گزر سکتے تھے جنھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تل گئے ہوں اور انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔اب تک تو انہوں نے عرب کے طاقتور ترین قبیلے قریش اور اس کے حلیف قبائل کی دشمنی

صرف اسی حد تک مول لی تھی کہ ان کے علی الرغم مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دے دی تھی۔ لیکن اب تو وہ اسلام کی حمایت میں ان کے خلاف لڑنے بھی جا رہے تھے جس کے معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹی سی بستی جس کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہے، سارے ملک عرب سے لڑائی مول لے رہی ہے۔ یہ جسارت صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو کسی صداقت پر ایسا ایمان لے آئے ہوں کہ اس کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی انھیں ذرہ برابر پروا نہ رہی ہو۔ آخر کار ان لوگوں کی صداقتِ ایمانی خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی29 اور قریش اپنے سارے غرور و طاقت کے باوجود بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور ان کے بڑے بڑے سردار جوان کے گلہائے سرسبد تھے اور اسلام مخالف تحریک کے روح رواں تھے اس معرکہ میں ختم ہو گئے۔''30

یہاں سید مودودی نے اس متنازعہ امر کی مدلل وضاحت کر دی ہے جو کتب تاریخ و سیرت میں غزوہ بدر کے اسباب میں بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے پیش نظر ابوسفیان کا قافلہ تجارت لوٹنا تھا جس کی حفاظت کے لیے کفار کی جانب سے ہونے والی پیش قدمی نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ سید مودودی تاریخ کی مدد سے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ بدر کے بیان میں تاریخ و سیرت کے مصنفین نے ان روایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، لیکن ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے، محض ایمان ہی کی بناء پر ہم جنگ بدر کے متعلق قرآن کے بیان کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے پر مجبور نہیں ہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی آج اس جنگ کے متعلق اگر کوئی معتبر ترین بیان موجود ہے تو وہ یہی سورۂ انفال ہے، کیونکہ یہ لڑائی کے بعد ہی متصلاً نازل ہوئی تھی اور خود شرکائے جنگ اور مخالف و موافق سب نے اس کو سنا اور پڑھا تھا۔ معاذ اللہ اس میں کوئی ایک بات بھی خلاف واقعہ ہوتی تو ہزاروں زبانیں اس کی تردید کر ڈالتیں۔31

سید مودودی کی تاریخی دلیل مبنی برحق ہے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳ میں اللہ تعالیٰ مومن و کافر کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے ''تمہارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا جو (بدر میں) ایک

دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے (مگر اس نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدہ بینا رکھنے کرانے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے''۔32

عہد نبوی کا دوسرا اہم واقعہ غزوہ احد ہے جو ہجرت کے تیسرے سال ۳ھ میں واقع ہوئی۔ یہ جنگ مسلمانوں کے ایک دستے کی حکم عدولی کے باعث مسلمانوں اور کفار کے حق میں فیصلہ کن ثابت نہ ہوسکی بلکہ اس جنگ میں مسلمانوں کی جانب سے کمزوری کا اظہار ہوا۔ اس جنگ کے تاریخی پس منظر کو مودودی صاحب نے بالتفصیل بیان کیا ہے۔ لیکن اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا جو تجزیہ انھوں نے کیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جنگ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرز فکر اور نظام اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ ہی بنی تھی جس کے اخلاقی تربیت ابھی تکمیل نہ ہوسکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دوسرا ہی موقع پیش آیا تھا اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا''۔

اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس جنگ کی پوری سرگزشت پر ایک مفصل تبصرہ کیا جائے اور اس میں اسلامی نقطہ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں، ان میں سے ایک ایک کی نشاندہی کر کے اس کی اصلاح کے مطابق ہدایات دی جائیں اس سلسلے میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ ان تبصروں سے کتنا مختلف ہے، جو دنیاوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔33 سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۲۔۱۲۳ میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

''یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔34 حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکرگزار بنو گے''۔35

غزوہ احد کے بعد کی صورت حال کی جامع اور مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے سید مودودی سورہ الاحزاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''غزوہ احد میں نبی صلعم کے مقرر کیے ہوئے تیر اندازوں کی غلطی سے لشکر اسلام کو جو شکست نصیب ہوگئی تھی اس کی وجہ سے مشرکین عرب، یہود اور منافقین کی ہمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور انھیں امید بندھ چلی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان بڑھتے ہوئے حوصلوں کا اندازہ ان واقعات سے ہوسکتا ہے جو احد کے بعد پہلے ہی سال میں پیش آئے۔

جنگ احد پر دو مہینوں سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ نجد کے قبیلہ بنی اسد نے مدینہ طیبہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کیں اور رسول اکرم کو ان کی روک تھام کے لیے سریۂ ابو سلمہ بھیجنا پڑا۔ پھر صفر ۴ھ میں قبائل عَضَل اور قارہ نے حضورؐ سے چند آدمی مانگے تاکہ وہ ان کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دین اسلام کی تعلیم دیں۔ حضورؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کر دیا مگر رجیع پہنچ کر وہ لوگ قبیلہ ھذیل کے کفار کو ان بے بس مبلغین پر چڑھا لائے، ان میں سے چار کو قتل کر دیا اور دو صاحبوں حضرت حبیب بن عدی اور حضرت زید بن الدثنہ کو لے جا کر مکہ معظمہ میں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اسی ماہ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر حضور نے ایک اور تبلیغی وفد جو چالیس یا ستر انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا، نجد کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان سے بھی غداری کی گئی اور بنی سلیم کے قبائل عُصَیَّہ اور رعل اور ذکوان نے بئر معونہ پر اچانک نرغہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں مدینے کا یہودی قبیلہ بنی نضیر دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا، یہاں تک کہ ربیع الاول ۴ھ میں اس نے خود نبی صلعم کو شہید کر دینے کی سازش تک کر

ڈالی۔ پھر جمادی الاول ۴ھ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں بنو ثعلبہ اور بنو عارب نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں کیں اور حضور صلعم کو خود ان کی روک تھام کے لیے جانا پڑا۔36

شعبان ۴ھ میں آپؐ، ابوسفیان کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے نکلے جو اس نے احد سے پلٹتے ہوئے دیا تھا۔ جنگ پر اس نے نبی صلعم اور مسلمانوں کی طرف رخ کر کے اعلان کیا تھا آئندہ سال بدر کے مقام پر ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہوگا اور حضورؐ نے بھی ایک صحابی کے ذریعے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ ٹھیک ہے، یہ بات ہمارے اور تمہارے درمیان طے ہوگئی۔ اس قرارداد کے مطابق طے شدہ وقت پر آپ ۱۵ سو صحابیوں کو لے کر بدر کے مقام پر پہنچے۔ ادھر سے ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر چلا، مگر مرالظہران سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا، حضورؐ نے بدر میں آٹھ دن اس کا انتظار کیا اور اس دوران میں مسلمان تجارت کر کے ایک درہم کے دو درہم کماتے رہے۔ اس واقعہ سے وہ دھاک جو احد میں اکھڑی تھی پہلے سے بھی زیادہ جم گئی اس نے پورے عرب پر یہ بات کھول دی اب تنہا قریش محمدؐ کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔37

اس دھاک میں ایک اور واقعہ نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دومۃ الجندل (موجودہ الجوف) ایک مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلعم ربیع الاول ۵ھ میں ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینہ میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کا کام نہیں ہے۔38 لہٰذا اب دشمنان اسلام نے انفرادی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کے بجائے اجتماعی محاذ آرائی کا منصوبہ بنایا۔ اس کی تحریک بنی نضیر کے ان لیڈروں نے کی تھی جو مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔39 چنانچہ ۵ھ میں منکرین اسلام (قریش) یہود اور منافقین نے اپنے اپنے حلیفوں کی مدد سے مشترکہ حملہ مدینہ کی طاقت کو کچلنے کے لیے کیا۔ ان کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار تھی۔40

سید مودودی نے جنگ کے دوران پیش آنے والے واقعات، حریفوں کی سازشوں اور رسول خدا کی حکمت عملیوں کو تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن جس خاص نکتے کو انھوں نے صراحت سے بیان کیا ہے وہ، وہ طریقہ جنگ ہے جواب تک عرب میں اختیار نہیں کیا گیا تھا اور وہ طریقہ جنگ خندق کو اپنے دفاع میں استعمال کرنا تھا۔ اس وقت کے حالات میں اس حکمت عملی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

''یہ حملہ اگر اچانک ہوتا تو سخت تباہ کن ہوتا۔ لیکن نبی صلعم مدینہ طیبہ میں بے خبر بیٹھے ہوئے نہ تھے بلکہ آپ کے خبر رساں اور تحریک اسلامی کے ہمدرد اور متاثرین جو تمام قبائل میں موجود تھے آپ کو دشمن کی نقل و حرکت سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ قبل اس کے کہ یہ جم غفیر آپ کے شہر پہنچتا، آپ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمال مغربی رخ پر ایک خندق کھدوالی اور کوہ سلع کی پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہوگئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہیں ہوسکتا تھا۔ مشرق میں حرآت (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف احد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہوسکتا تھا اور اسی جانب حضورؐ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کرلیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینہ کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیونکہ اہل عرب اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں

ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا بس کے لیے وہ گھروں سے

تیار ہو کر نہیں آئے تھے"۔41

چنانچہ اتحادیوں نے سازشوں اور چالوں کے ذریعے مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے مسلمانوں کے حلیف یہودی قبیلے قریظہ کو مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ کرلیا اور بنو قریظہ نے بدعہدی کرتے ہوئے مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ لیکن رسول اللہ نے ایک صحابی نعیم بن مسعود کے ذریعہ اس اتحاد کو توڑ کر مخالفین کو تنہا کر دیا۔ چنانچہ کفار سخت سردی کے زمانے میں محاصرہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ محاصرہ پچیس دن سے زیادہ جاری رہا۔ آخر نصرت الٰہی سے ایسی زبردست آندھی آئی اور بجلی کڑکی جس سے دشمنان اسلام میں افراتفری پھیل گئی اور راتوں رات اپنے مسکن کی جانب لوٹ گئے۔ صبح جب مسلمان سو کر اٹھے تو میدان کو دشمنوں سے خالی پایا۔ اس موقع پر رسول اللہ نے فرمایا "اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کرسکیں گے۔ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"۔42 اس جنگ نے نتیجے کے طور پر حملے کی قوت کو دشمنوں سے مسلمانوں میں منتقل کر دیا۔43

اس جنگ میں مشرکین کو ہی شکست کا سامنا نہ کرنا پڑا بلکہ بنو قریظہ کو بھی اپنی بدعہدی کا مزہ چکھنا پڑا۔ حکم الٰہی کے باعث رسول اللہ نے غزوہ احزاب کے فوری بعد ہتھیار کھولنے سے پہلے بنی قریظہ کو غداری کی سزا دینے کے لیے ان کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ کی شدت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کرسکے اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلعم کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذؓ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔44 حضرت سعد بن معاذ کو حکم بنانے میں یہودیوں کا کیا مفاد تھا؟ اور حضرت سعد بن معاذ نے بحیثیت حکم جو فیصلہ دیا اس میں کیا حکمت تھی؟ اس کو بیان کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں "انھوں نے حضرت سعدؓ کو اس امید پر حکم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدتوں سے چلے آرہے تھے وہ ان کا لحاظ کرلیں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینہ سے نکل جانے دیں گے جس طرح پہلے بنی قینقاع اور بنی نضیر کو نکل جانے دیا گیا

تھا۔ خود قبیلہ اوس کے لوگ بھی حضرت سعد سے تقاضہ کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ رعایت برتیں۔45

لیکن حضرت سعد بن معاذ دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینہ پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے تھے اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہل مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیئے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں''۔46

بنو قریظہ کی سازش کے کامیاب ہونے کی صورت میں خطرناک نتائج بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں''اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ سے عقب پر حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جب کہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔47

مغازیٔ رسول کے ساتھ ساتھ سید مودودی نے تاریخی اعتبار سے ان قوانین کو بھی تفصیلاً بیان کیا ہے جو اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے بیع، ربوا، نکاح وطلاق، وراثت، شراب اور جوئے کی حرمت اور تبنیت (گود لینے یا بیٹا بنانے کا مسئلہ) اور پردہ وغیرہ یہ قوانین بتدریج اس وقت نافذ ہوئے جب جنگوں میں فتح کی صورت میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور ان کی طاقت مستحکم ہوگئی۔ اب مسلمان دفاعی پوزیشن سے نکل کر پیش قدمی کی پوزیشن میں داخل ہوگئے تھے۔ اس کا اشارہ اللہ نے اپنے رسول کو روئے صادق کی صورت میں دیا۔ سید مودودی، سورۃ الفتح کے دیباچے میں اس صورت حال کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روز رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا فرمایا ہے۔ پیغمبر کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب وخیال نہ ہوسکتا تھا۔ یہ تو وحی کی ایک قسم ہے''۔48 اس حکم الٰہی کی نزاکت کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید بیان کرتے ہیں ''بظاہر اسباب اس ہدایت پر عمل کرنے کی کوئی صورت ممکن نظر نہ آتی تھی۔ کفار قریش نے ۶ سال سے مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کا راستہ بند کر رکھا تھا اور اس پوری مدت میں کسی مسلمان کو انھوں نے حج اور عمرے تک کے لیے حدود حرم کے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اب آخر یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلعم کو صحابہ کی ایک جمعیت کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ عمرے کا احرام باندھ کر جنگی ساز وسامان ساتھ لیے ہوئے نکلنا گویا خود لڑائی کو دعوت دینا تھا اور غیر مسلح جانے کے معنی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کے تھے۔ ان حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس اشارے پر عمل کیا جائے تو کیسے۔ مگر پیغمبر کا منصب یہ تھا کہ اس کا رب جو حکم بھی اس کو دے وہ بے کھٹکے اس پر عمل کر گزرے۔ اس لیے رسول اللہ نے بلا تامل اپنا خواب صحابہ کرام کو سنا کر سفر کی تیاری شروع کر دی اور آس پاس کے قبائل میں بھی اعلان عام کرا دیا''۔49

مختصر یہ کہ اس سورہ کے دیباچے میں سید مودودی نے رسول اللہ کی مسلمانوں کے ساتھ بغرض عمرہ مکہ روانگی، کفار مکہ کا مسلمانوں کی مکہ آمد پر تذبذب کا شکار ہونا اور انھیں واپسی اختیار کرنے پر مجبور کرنا،

بحیثیت سفیر رسول، حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ، بیعت رضوان، مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پانا، صلح نامہ کی شرائط پر مسلمانوں کا عدم اطمینان اور اکابر صحابہ کا ردعمل، رسول اللہ کا احرام کھول کر قربانی کرنے اور بال ترشوانے کا حکم، مسلمانوں کی مکہ واپسی اور دوران سفر رسول اللہ کی سورہ فتح کے ذریعے اللہ کا فتح مبین کی خوشخبری دینا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس صلح کے نتائج و ثمرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمال عرب اور وسط عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کرلیا۔ صلح حدیبیہ پر تین ہی مہینے گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ، خیبر فتح ہوگیا اور اس کے بعد فدک وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیرنگیں آتی چلی گئیں پھر وسط عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے ایک ایک کر کے تابع فرمان ہوگئے اس طرح صلح حدیبیہ نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہوگیا''۔50

رسول اللہ نے حدیبیہ کی صلح کے بعد دعوت و تبلیغ اور استحکام قوت کی جو تدبیریں اختیار کیں ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام کا دائرہ اتنا پھیل گیا اور اس کی طاقت اتنی زبردست ہوگئی کہ پرانی جاہلیت دو سال کے اندر ہی اسلام کا پرانی جاہلیت اس کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ آخر کار جب قریش کے زیادہ پرجوش عناصر نے بازی مات ہوتے دیکھی تو انھیں یارائے ضبط نہ رہا اور انھوں نے حدیبیہ کے معاہدے کو توڑ ڈالا۔ وہ اس بندش سے آزاد ہو کر اسلام سے ایک آخری فیصلہ کن مقابلہ کرنا چاہتے

تھے۔ لیکن نبی صلعم نے ان کی اس عہد شکنی کے بعد ان کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور اچانک مکہ پر حملہ کرکے رمضان ۸ ھ میں اسے فتح کرلیا۔[51] اس کے بعد قدیم جاہلی نظام نے آخری حرکت مذبوحی حنین کے میدان میں کی جہاں ہوازن، ثقیف، نصر، جبشم اور بعض دوسرے جاہلیت پرست قبائل نے اپنی ساری طاقت لاکر جھونک دی تاکہ اس اصلاحی انقلاب کو روکیں جو فتح مکہ کے بعد تکمیل کے مرحلے تک پہنچ چکا تھا، لیکن یہ حرکت بھی ناکام ہوئی اور حنین کی شکست کے ساتھ عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہوگیا کہ اسے اب دارالاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعہ پر پورا ایک سال بھی نہ گزرنے پایا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوگیا اور نظام جاہلیت کے صرف چند پراگندہ، عناصر ملک کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے۔[52] اس نتیجہ کے کمال تک پہنچنے میں ان واقعات سے اور زیادہ مدد ملی جو شمال میں سلطنت روم کی سرحد پر اسی زمانہ میں پیش آرہے تھے۔ تبوک کے مقام پر جس جرأت کے ساتھ نبی صلعم ۳۰ ہزار کا زبردست لشکر لے کر گئے اور رومیوں نے آپ کے مقابلے پر آنے سے پہلو تہی کر کے جو کمزوری دکھائی اس نے تمام عرب پر آپ کی اور آپ کے دین کی دھاک بٹھا دی، اور اس کا ثمر اس صورت میں ظاہر ہوا کہ تبوک سے واپس آتے ہی حضورؐ کے پاس عرب کے گ وشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہوگئے، اور وہ اسلام و اطاعت کا اظہار کرنے لگے۔[53]

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ نے داخل اسلام ہونے والے مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اور اسلامی تعلیمات کو مکمل اور جامع طور پر لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگی کے پہلے اور آخری حج میں وہ عظیم خطبہ دیا جو تاریخ میں خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ اسی خطبے کے دوران اللہ نے سورہ النصر کے ذریعے رسول اللہ کو ان کے مقصد کے تکمیل کی خبر دے دی تھی۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہوجائے اور اے نبی تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے

شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔54

سید مودودی سورہ کے دیباچے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے اور اس سے دعا کریں کہ اس خدمت کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہو اسے وہ معاف فرما دے۔

اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلاب عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بدل ڈالا اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اٹھا کر اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوام عالم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اسے جشن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد و تسبیح کرنے اور اسے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔55

تبصرہ:۔

مذکورہ بالا سورتوں کے تاریخی پس منظر کے مختصر سے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ تفہیم القرآن میں اسلامی تاریخ کا ایک جامع تصور پیش کیا گیا ہے اور جس اختصار کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغی جدوجہد،

اسلامی قوانین واحکامات کی توضیح وتشریح، اسلامی عقائد ونظریات کی مدلل وضاحت اور مغازی وسیرتِ رسول اللہ صلعم کو بیان کیا گیا ہے وہ سید مودودی کی تاریخ نویسی کا انفرادی پہلو ہے۔

تجدید واحیائے دین

سید مودودی کی یہ تاریخی کاوش، شاہ ولی اللہ کی شخصیت پر لکھا جانے والا مقالہ ہے جو انھوں نے بریلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الفرقان'' کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے ''منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا، جو بعد میں کتابی شکل میں تجدید و احیائے دین کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں سید مودودی کی تاریخ نویسی کی نمایاں خصوصیت اختصار و جامعیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ''امت کے چند بڑے مجددین اور ان کے کارنامہ'' کے عنوان سے انھوں نے عمر بن عبدالعزیز آئمہ اربعہ، امام غزالی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی کے ساتھ مرکز موضوع شاہ ولی اللہ اور فکر شاہ ولی اللہ کو عملی شکل دینے والی تحریک سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کا جائزہ لے کر کئی صدیوں کی تاریخ کو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں سمو دیا ہے۔ مقالے کے باب چہارم ''سید مودودی کے تاریخی اصول ونظریات'' میں ان مجددین کے کارتجدید کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔

اسلامی تاریخ کے اعتبار سے مولانا مودودی نے جس نظریے کی توضیح کی ہے وہ اسلام کے خلاف جاہلیت کا نظریہ ہے جسے انھوں نے ''اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے زندگی کے چار نظریے بیان کیے ہیں جن کے مطابق انسان زندگی گزارتا ہے۔ (مختصراً) پہلے نظریے کو وہ جاہلیت خالصہ کا نام دیتے ہیں، جن میں انسان مادہ پرستانہ نظام کے تحت زندگی گزارتا ہے۔

اس نظریے کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامہ وجود ظہور ہے جس کے

پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے، یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے، اس کا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔56

دوسرا نظریہ جاہلیت مشرکانہ ہے۔ اس کی وضاحت میں مولانا لکھتے ہیں، دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ شرک کے اصول پر مبنی ہے۔57 جس میں انسان قدیم ترین زمانہ سے آج تک مبتلا ہے اور ہمیشہ گھٹیا درجے کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیاء علیہ السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہوئے وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہوگئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھی۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اس قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔58 دوسری طرف بغیر کسی ثبوت علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہوگئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھاتی ہے۔59

تیسرا مابعد طبیعی نظریہ جاہلیت راہبانہ ہے جو رہبانیت پر مبنی ہے جس میں انسان دنیا کو دارالعذاب سے تعبیر کرتا ہے، اور نعمت خداوندی سے اجتناب بلکہ ان کی ناشکری کرتا ہے، اور اس دنیا سے نجات کی راہ ڈھونڈتا ہے۔ مولانا مودودی کے نزدیک یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، مانویت، اشراقیت، یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں، اس فلسفہ کے

ساتھ ایک نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر لٹریچر، عقائد، اخلاقیات اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔60

چوتھا مابعد طبیعی نظریہ وہ ہے جسے انبیاء علیہ السلام نے پیش کیا یعنی اسلام، دنیا میں انبیاء کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومت الہیہ قائم کر کے اس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں، جو خدا کی طرف سے لاتے تھے۔61 سلسلہ نبوت رسول اللہ پر ختم ہونے کے بعد اسلام کو ان تینوں جاہلیتوں سے نکالنے اور اسے پھر سے چمکانے کے لیے جو شخصیات سامنے آئیں وہ مجددین کی تھیں۔

''تجدید و احیائے دین'' میں سید مودودی نبی اور مجدد کے فرق اور کار تجدید کو واضح کرنے کے ساتھ عقیدہ ظہور مہدی، مہدی کی خصوصیات اور اہمیت بھی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں ''اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے، جس کی ہمہ گیر و پرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے آئمہ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہے۔62

مہدی کا تصور اہل سنت کا ہاں متنازعہ موضوع ہے۔ سید مودودی نے مہدی کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے قارئین کے ذہنوں میں یہ تاثر ابھرا جیسے آپ خود مدعی مہدی ہیں۔ لہٰذا متعدد بار یہ الزام عائد کیا گیا کہ آپ دراصل خود مجدد یا مہدی ہونے کے دعویدار ہیں، یا در پردہ اپنے آپ کو مجدد یا مہدی تسلیم کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی مولانا مودودی کے متعلق اس شبہ کا اظہار کیا۔63 سید مودودی نے ترجمان القرآن میں اپنے مضمون ''رفع شبہات'' میں مولانا مناظر احسن گیلانی کو تشفی بخش جواب دیتے ہوئے لکھا ''آپ کو میرے جرأت آمیز الفاظ سے شاید یہ گمان گزرا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں

کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار ... جاؤں تو بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے''۔[64]

تجدید واحیائے دین کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے اختتام پر ضمیمہ دیا گیا ہے جس کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں ''اس کتاب کے ساتھ یہ ضمیمہ اس غرض کے لیے لگایا جا رہا ہے کہ ناظرین کو ان شبہات و اعتراضات کا جواب بروقت اور یک جا مل جائے جو اس کتاب کے موضوع سے متعلق میری تصریحات پر وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے ہیں''۔[65]

خلافت وملوکیت

سید مودودی کی ایک اہم تاریخی کاوش ''خلافت وملوکیت'' ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں صاحبِ تصنیف نے اسلام کے نظریہ سیاسی ''خلافت'' کو تاریخ کے ذریعے واضح کیا ہے۔ یوں یہ کتاب بیک وقت سیاست و تاریخ دونوں موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سید مودودی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کا موضوع بحث یہ ہے کہ اس میں خلافت کا حقیقی تصور کیا ہے، کن اصولوں پر وہ صدرِ اوّل میں قائم ہوئی تھی، کن اسباب سے وہ ملوکیت میں تبدیل ہوئی، کیا نتائج اس تبدیلی سے رونما ہوئے اور جب وہ رونما ہوئے تو ان پر امت کا ردعمل کیا تھا۔ ان امور کی توضیح کے لیے میں نے سب سے پہلے قرآن مجید کی ان تمام آیات کو جن سے سیاست کے بنیادی مسائل پر روشنی پڑتی ہے، ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے تاکہ ناظر کے سامنے بیک وقت اسلامی حکومت کا وہ نقشہ آجائے جسے کتاب الٰہی قائم کرنا چاہتی ہے''۔[66]

مولانا کی یہ تصنیف 9 ابواب اور ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں قرآن کی سیاسی تعلیمات کی روشنی میں خلافت کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت بیان کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انسانی حکومت کی صحیح صورت قرآن کی روشنی میں یہ ہے کہ ریاست خدا اور اس کے رسول کی قانونی بالادستی تسلیم کر کے اس کے حق میں حاکمیت سے دستبردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت ''خلافت'' (نیابت) کی حیثیت قبول کرے۔67 اس خلافت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ زمین میں انسان کو جو قدرتیں حاصل ہیں خدا کی عطا اور بخشش سے حاصل ہیں۔ خدا نے خود انسان کو اس حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دیے ہوئے اختیار سے اس کی زمین میں استعمال کرے۔ اس لیے انسان یہاں خود مختار مالک نہیں بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے''۔68

باب دوم میں اسلام کے اصول حکمرانی جس میں عدل وانصاف، مساوات، احتساب، طلب اقتدار سے اجتناب، نظامِ شریعت کا نفاذ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق اور فرض، تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

باب سوم خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات پر مشتمل ہے، جس میں اسلامی اصولِ حکمرانی کے تحت قائم ہونے والی حکومت جو رسول اللہ کے صحابہ کے ہاتھوں قائم ہوئی اور منہج نبوت کی پیروی کے باعث خلافت راشدہ قرار پائی، کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات میں خلفائے راشدین کا انتخابی مرحلے سے گزر کر منصب خلافت پر فائز ہونا ہے جس کو واضح کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> ''آنحضرتؐ کی براہِ راست تعلیم و تربیت سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا، اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کس قسم کا نظامِ حکومت بننا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شورائی خلافت کا تقاضا کرتا

ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنیاد ڈالی گئی نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسر اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی اس کے لیے کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے''۔69

خلافت کی دوسری خصوصیت اس کی شورائیت ہے۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کیے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔70 خلافت کی تیسری خوبی بیت المال کو خلق خدا کی امانت سمجھنا تھا۔ خلفائے راشدین بیت المال میں قانون کے خلاف کچھ آنے اور اس میں سے قانون کے خلاف کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھی۔ فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لیے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔71 خلافت کی چوتھی خصوصیت اس کا خادم خلق حکومت کا تصور ہے۔ خلفائے راشدین نے اپنے خطبات میں اس تصور کی وضاحت کر دی تھی۔ حضرت ابو بکر نے اپنے خطبے میں کہا تھا کہ میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے، اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیں''۔72

حضرت عمر نے فرمایا: ''لوگوں کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے۔ لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کر دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو''۔73

حضرت عثمان نے فرمایا: سنو، میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کیے تھے۔ ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔74

حضرت علیؓ نے حضرت قیس بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کر کے جو فرمان اہلِ مصر کے نام بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں ''خبردار رہو، تمہارا ہم پر حق یہ ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تمہارے معاملات کو اللہ کے مقرر کردہ حق کے مطابق چلائیں اور نبی صلعم کی سنت کو نافذ کریں اور تمہارے در پردہ بھی تمہاری خیر خواہی کریں۔75 یہ طریقہ صرف خلفاء کا ہی نہ تھا بلکہ تمام صحابہ اسی صبغت کے حامل تھے۔ مولانا مزید لکھتے ہیں ''اس فرمان کو سنانے کے بعد حضرت قیس بن سعد نے اعلان کیا کہ اگر ہم اس طریقہ پر تمہارے ساتھ برتاؤ نہ کریں تو ہماری کوئی بیعت تم پر نہیں ہے۔76

خلافت راشدہ کی پانچویں خوبی یہ بیان کی ہے کہ ''یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شہری (مسلمان ہو یا ذمی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔77 اس عہد کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصول اور اس کی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔

اس خلافت کی ساتویں اور خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں: "اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی اس میں تنقید اور اظہار رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے۔ وہ خود اپنے اہل شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے ان کی کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ ان کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔ آزادانہ فضا میں ہر شریک مجلس اپنے ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ پھر یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ ہی سے نہ کرتے تھے بلکہ براہِ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا ہے۔78

باب چہارم خلافت راشدہ سے ملوکیت تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ سید مودودی لکھتے ہیں کہ اس باب میں ان اسباب سے بحث کی ہے جو خلافت سے ملوکیت کی طرف انتقال کے موجب ہوئے اور تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ تبدیلی کس تدریج سے ہوئی۔79 باب پنجم میں واضح کیا ہے کہ خلافت وملوکیت کے درمیان حقیقی فرق کیا ہے۔ کیا تغیرات تھے جو خلافت کی جگہ ملوکیت کے آجانے سے واقع ہوئے۔80 اس ضمن میں سید مودودی لکھتے ہیں:

''ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کی خلفاء نے قیصر وکسریٰ کا طرزِ زندگی اختیار کرلیا اور اس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی صلعم اور خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کیا۔ شاہی حرس (محافظ) ان کے محلوں کی حفاظت کرنے اور ان کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب اور دربان ان کے جلو میں چلنے لگے۔ رعیت کا براہِ راست ان تک پہنچنا اور ان کا خود رعیت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہوگیا۔81 بیت المال کا تصور یہ ہوگیا کہ خزانہ بادشاہ اور اس کے شاہی خاندان کی ملک ہے۔ رعیت بادشاہ کی محض باجگزار ہے۔82

باب ششم میں مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتدا اور اس کے اسباب بیان کیے ہیں ان فرقوں میں شیعہ، خوارج، مرجئہ اور معتزلہ کی تاریخ اور ان تفرقوں سے پیدا ہونے والے مسائل پر بحث کی ہے۔ باب

ہفتم میں نظامِ سیاست کی اس تبدیلی نے مسلمانوں کی زندگی میں جو رخنے ڈال دیے تھے انہیں بھرنے کے لیے علمائے امت نے جو کوششیں کیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے اور باب نہم میں علمائے امت کی نمائندہ شخصیات کے طور پر حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف کی اس سعی و جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے جو انہوں نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے کیں۔83

مجموعی طور پر کتاب کے ذیلی عنوانات کے تحت عہد بنوامیہ اور بنوعباس کا جو جائزہ لیا گیا ہے۔اس نے تاریخ کے طالب علم کے لیے معیاری تاریخی مواد فراہم کیا ہے۔ اس کتاب کے بعض مضامین خصوصاً باب چہارم اور پنجم پر مختلف علمی حلقوں کی طرف سے سخت اعتراضات بھی ہوئے۔ ان متنازعہ موضوعات پر بحث سعی لاحاصل ہے۔ جناب سید مودودی نے کتاب کے ضمیمہ میں ان اعتراضات کا مدلل جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''جو تاریخی مواد اس بحث میں پیش کیا گیا ہے وہ تاریخِ اسلام کی مستند ترین کتابوں سے ماخوذ ہے جتنے واقعات میں نے نقل کیے ہیں ان کے پورے پورے حوالے درج کر دیے ہیں اور کوئی ایک بات بھی بلاحوالہ بیان نہیں کی ہے۔ اصحاب علم خود اصل کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں''۔84

حقیقت یہ ہے کہ بتقاضائے بشریت، انبیاء علیہ السلام کے علاوہ کوئی بھی انسان غلطیوں اور کمزوریوں سے مبرا نہیں۔ اس کی معصیت و کجی ہی اسے ملائکہ وانبیاء کی صف سے خارج کرتی ہے۔ صحابہ و علمائے دین کی اجتہادی غلطی معاف، جزائے خیر کی حقدار اور ان کی ثقاہت مانند مثل ہوتی ہے۔

سید مودودی کی شخصیت اور ان کی تصانیف و تالیفات بھی بشریت کی اس صفت سے ماورا نہیں۔ میری نظر میں خلافت وملوکیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے اختلاف کرنے کے باوجود، اس کے دلائل کی کمزوریوں کی توضیح کرنے کے باوجود اس کتاب نے طالب علم و طالب حق کی توجہ تاریخ کی حقیقت

جاننے کی جانب راغب کی ہے۔

دکن کی سیاسی تاریخ

تاریخ میں سید مودودی کی دلچسپی کا میدان اسلامی تاریخ ہے۔ لہٰذا ہندوستان کا خطہ بھی ان کی دلچسپی کے میدان سے خارج نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر اگر چہ مجموعی طور اس کی قدیم، وسطی اور جدید تاریخ پر ہر پہلو سے کام ہو چکا ہے اور انفرادی طور پر بھی ہندوستان کی علاقائی اور خاندانی تاریخ پر بھی تاریخ مواد کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ سید مودودی نے دکن کی سیاسی تاریخ کو اپنا موضوع تحقیق بنا کر اس ذخیرے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ اس موضوع سے ان کی دلچسپی کی بڑی وجہ دکن سے ان کا قلبی لگاؤ ہے۔ اورنگ آباد، دکن ان کی جائے پیدائش ہے لہٰذا انھوں نے بنظر غائر دکن کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔

سید مودودی کی دیگر تصانیف کے مقابلے میں ''دکن کی سیاسی تاریخ'' کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مودودی صاحب نے کتاب کا تعارف، یعنی پیش لفظ، دیباچہ، مقدمہ، تحریر کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے، بلکہ براہ راست فہرست مضامین کے بعد کتاب کا آغاز کر دیا ہے۔ کتاب کے ناشر سید علی شبر حاتمی، کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جزیرہ نمائے ہندوستان کی چھوٹی بڑی بہت سی تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن اس خاص موضوع پر زیر نظر کتاب یکتا اور لاثانی ہے۔ اب تک دکن کی سیاسی تاریخ پر کوئی ایسی وسیع کتاب لکھی نہیں گئی ہے جس میں حوادث و واقعات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہو، کتاب کے مصنف ابوالاعلیٰ مودودی اس سے بلند ہیں کہ ان کا تعارف کرایا جائے۔ ان کے خاص موضوع جدید علم الکلام کے علاوہ موصوف نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ مولانا مودودی جنھوں

نے برطانیہ اور دولت آصفیہ کے تعلقات پر مشہور اور معلومات آفرین
کتاب لکھی ہے۔ سیاسی تاریخ دکن پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ کسی
دوسرے شخص کو سالہا سال کے مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ
کتاب مولانا کے وسیع مطالعہ ما حصل ہے''۔85

سید مودودی نے اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں نظام الملک اور اس کے اسلاف کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نظام الملک کا سلسلہ تیرہ واسطوں سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک اور ۳۲ واسطوں سے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ فتنہ تاتار کے بعد یہ خاندان ماوراء النہر میں آباد ہو گیا تھا اور وہاں اپنی عالی نسبی اور علم وعمل کے سبب سے اس کو خاص قدر ومنزلت حاصل تھی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ میر اسماعیل عرف عالم شیخ تھے جن کو امیر سمر قند نے ''اعلم العلماء'' کا خطاب دیا تھا۔ ان کی متعدد تصانیف میں جن میں سے ''عوارف'' اور ''رشح النصائح'' اور ''اعلام التقی'' کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں۔ عالم شیخ کے دو بیٹے تھے۔ ایک خواجہ عابد جو نظام الملک کے دادا ہیں دوسرے خواجہ بہاء الدین جو سمر قند کے قاضی ہوئے اور جن کے بیٹے محمد امین خان اور پوتے قمر الدین خان، سلطان محمد شاہ کے عہد میں سلطنت کی وزارت پر سرفراز ہوئے۔86

نظام الملک کے دادا خواجہ عابد تحصیل علوم کے بعد سمر قند سے بخارا گئے اور وہاں پہلے منصب قضا اور پھر شیخ الاسلامی پر مامور ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان شاہجہاں کے زیر حکومت دولت کے چشمے اگلے رہا تھا۔ امنیت وخوشحالی کے ساتھ قدر دانی وجوہر شناسی کے اجتماع سے ایک ایسی فضاء پیدا ہو گئی تھی جس میں ہر شخص کے لیے اپنے ذاتی کمال اور فطری جوہر کے مطابق ترقی کے غیر معمولی امکانات مہیا تھے، اور دور دور کے لوگ دربار شاہجہانی کی طرف کھنچے چلے آئے تھے۔ انہی حالات کی کشش نے خواجہ عابد کو بھی ہندوستان پہنچایا اور عہد شاہجہانی ۵۶-۱۶۵۵ء میں انھوں نے ہندوستان آکر شاہی ملازمت حاصل کی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد انقلاب سلطنت نے اورنگ زیب عالمگیر کو تخت سلطنت پہنچایا اور اس تغیر سے خواجہ عابد

کے لیے مزید ترقیات کا دروازہ کس لیا۔87

جلوس کے بعد ہی بادشاہ نے ان کو منصب چہار ہزاری عطا کیا۔۴ جلوس (۱۶۷۲ء) میں صدارت کل، ۱۰ جلوس (۱۶۶۸ء) میں صوبیداری اجمیر اور ۱۴ جلوس (۱۶۷۲ء) میں قلیچ خان کا خطاب دیا۔ ۲۴ جلوس میں دوبارہ صدارت کل پر مقرر کیا۔ ۲۵ (۱۶۸۲ء) میں دکن بھیجا جہاں مختلف جنگی خدمات انجام دینے کے بعد وہ ۲۹ (۱۶۸۶ء) میں جب قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ شروع ہوا تو اس میں خواجہ عابد پیش پیش تھے۔

ابتدائی چھیڑ چھاڑ ہی تھی کہ قلعہ پر سے ایک زنبورک کا گولہ آکر ان کے شانے میں لگا جس سے ہاتھ الگ ہوگیا۔ ان کی بہادری کا یہ واقعہ تاریخ دکن میں یادگار رہنے والا ہے کہ وہ گولہ کھانے اور ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود پورے استقلال کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اپنی فرودگاہ پر آئے۔ جملہ الملک اسد خان وزیراعظم ان کی عیادت کو آیا تو دیکھا کہ جراح ان کے شانے سے ہڈی کی کرچیاں چن چن کر نکال رہا ہے اور وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور دوسرے ہاتھ سے قہوہ پیتے جاتے ہیں۔ یہی زخم آخر کار ان کی جان کا لیوا ثابت ہوا، اور وہ قلعے کے باہر مدفون ہوئے۔ یہ گویا کارکنان قضاء و قدر نے اس سرزمین میں ان کے خاندان کی حکومت کا پہلا سنگ بنیاد رکھا تھا۔88

کتاب کا باب دوم، عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کی خانہ جنگیوں، عیش طرازیوں اور محلاتی سازشوں کے ساتھ صوبہ دکن سے ان کے تعلقات پر مشتمل ہے۔ اس دور کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں ''عالمگیر کی وفات کے بعد لائق آدمیوں کی کمیابی سے بھی بڑا فتنہ لائق فرمانرواؤں کا فقدان تھا۔ عالمگیر کے بیٹوں، پوتوں اور پرپوتوں کی پوری فہرست پر نظر ڈال جائیے اس کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے دفعۃً نسل تیمور سے فرمانروائی کی قابلیت سلب کر لی تھی۔ اعظم اور کام بخش کی بے تدبیری، بہادر شاہ کی بے خبری، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ کی نااہلی اور بابر کے خاندان میں رفیع الشان اور نیکوسیر جسے زنانہ خصائل رکھنے والے شہزادوں کی پیدائش کو دیکھ کر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے

کہ اگر ایسے جانشین عالمگیر کو نہیں خود اکبر کو بھی میسر آتے تب بھی وہ پچاس سال کے اندر سلطنت کو ہاتھ سے کھو دیتے۔ ایک دو نا قابل بادشاہوں کے بعد کوئی ایک قابل بادشاہ تخت نشین ہوتا تو شاید سلطنت کو کچھ سنبھال لیتا لیکن یہاں تو ایک نا قابل کے بعد دوسرا اس سے زیادہ نا قابل آتا رہا اور عالمگیر کے بعد دہلی کے تخت کو ایک دن کے لیے بھی کوئی اہل اور موزوں بادشاہ میسر نہ آیا۔89

عالمگیر کی وفات سے محمد شاہ کی تخت نشینی تک ۱۳ سال کی مختصر مدت میں سات خونریز معرکے محض حصول سلطنت کے لیے پیش آئے جنھوں نے سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ درباری سازشوں کی بدولت متعدد امراء اور صوبیدار ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء ہوئے اور وہ قوت جو سلطنت کی خدمت میں صرف ہونی چاہیے تھی اس طرح برباد ہوئی۔ قانون و آئین کا احترام اٹھ گیا۔ حکومت کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ اطراف ملک میں عام ابتری اور طوائف الملوکی پھیل گئی اور وہ جبل متین جس نے سلطنت کے اجزاء کو جوڑے رکھا تھا پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔90

کتاب کا باب سوم، نظام الملک آصف جاہ، دولت آصفیہ اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات، اور نادر شاہ کے حملے تک کی صورت حال کا احاطہ کرتا ہے۔ مختصراً دکن کی تاریخ درحقیقت دولت آصفیہ کے قیام کی تاریخ ہے۔91 اس کا جائزہ لیتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں ''سلاطین کی نااہلی کے باعث مصاحبوں مسخروں، ڈوم ڈھاڑیوں اور سامان عیش ونشاط پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا تھا اور اہل فضل وکمال بھوکے مرتے تھے۔ فوج تنخواہوں کے لیے ترستی تھی۔ جنگی ضرورت کے مواقع پر سامان جنگ کے لیے شاہی توشہ خانے کے برتن تک بیچنے کی نوبت آجاتی تھی۔ ان حالات میں ملک کے قابل لوگوں نے دیکھا کہ مرکزی سلطنت میں ترقی کا مدار قابلیت اور حسن خدمت پر نہیں ہے۔ شاہی اقتدار خواجہ سراؤں، خوشامدی مصاحبوں اور سازشی درباریوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں ملک اور سلطنت کی کوئی خدمت کرنا محال اور اس خدمت کے صلے میں ترقی حاصل کرنا غیر ممکن بلکہ اپنی رہی سہی عزت و آبرو بچانی بھی مشکل ہے۔ لامحالہ ان کو اپنی بھلائی اس میں نظر آئی کہ مرکز سے الگ ہوکر جس علاقے پر قابو پائیں اس میں اپنی

جداگانہ ریاست قائم کریں۔92 یہ صورت حال دکن میں نظام الملک کی اس ریاست کے قیام کا سبب بنی۔ نظام الملک اور ان کے خاندان نے دکن میں ستر، اسی سال تک سلطنت کی اعلیٰ خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے دادا، ان کے والد، ان کے چچا، ان کے پھوپھا اور وہ خود اس خطہ میں سپہ سالاری، صوبیداری، اور فوجداری کی خدمات پر رہ چکے تھے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح میں ان کے دادا کا خون اور ان کے والد کا ہاتھ شامل تھا۔ دکن کی رعایا، زمیندار، جاگیردار اور شاہی عمال سب پر ان کے ذاتی اور خاندانی اثرات تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ تورانی امراء کی بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی۔ جن میں سے اکثر دکن کے کسی نہ کسی حصہ میں جنگی اور انتظامی عہدوں پر رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے کسی دوسرے صوبہ کی بہ نسبت ان کے لیے دکن میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے زیادہ مواقع تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مالوہ اور گجرات کے صوبوں کو چھوڑ کر دکن کو ترجیح دی۔93

دکن کی مفصل سیاسی تاریخ مولانا کی اس اسکیم میں پنہا ہے جو انھوں نے نکات کی صورت میں ایک خاکے میں ترتیب دی ہے۔ یہ اسکیم وثائق مودودی کے جزوی حصے کے طور پر تو شائع ہوئی، لیکن کتابی صورت میں شائع نہ ہوسکی۔ کیونکہ مولانا کو اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کے باعث ان نکات کو تفصیلی مواد میں ڈھالنے کا وقت اور موقع میسر نہ آسکا۔ وثائق مودودی میں تاریخ دکن کا خاکہ مع فہرست ماخذ کے موجود ہے جس میں تاریخ دکن کا آغاز، دکن کا جغرافیہ، لفظ دکن کے اصطلاحی معنی، قدیم مورخین کی زبان میں دکن کا مفہوم، دکن کے مختلف اقطاع کے نام، موسمی کیفیات اور باشندوں پر ان کا اثر، دکن کی پیداوار، قدرتی ثروت، اقوام، ان کی نسلیں، زبانیں اور زبانوں کے لحاظ سے جغرافیائی تقسیم کے علاوہ دکن معروف اور دکن مطلق کا فرق، یہ پہلے باب کے نکات ہیں، جس میں سید مودودی نے واضح کیا ہے کہ ان کی بیان کردہ تاریخ کا موضوع دکن مطلق ہے جس کی تاریخ کو انھوں نے چالیس ابواب میں منقسم کیا ہے۔94

دکن کی قدیم تاریخ اور اس کے ماخذ، مسلمانوں کی فاتحانہ آمد کے بعد دکن کی صورتحال، یہاں قائم ہونے والی مختلف خاندانی حکومتیں اور ان کا انقراض، پرتگیزوں کی دکن میں مداخلت اور یہاں کے حکمرانوں

سے ان کے تعلقات، مغلوں کی ترح دکن اور انتظام حکومت، عالمگیر کی وفات تک، مرہٹوں کا دکن پر اثر و اقتدار، مرہٹوں کی اصل اور دکن پر حکومت کرنے والے مرہٹہ سرداروں کی مختصر روداد، دکن میں دولت آصفیہ کا قیام، انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ابتداء، دکن میں ان کی سیاسی زندگی کا آغاز، ان دونوں طاقتوں کے درمیان نزاعی تعلقات، نواب آصف جاہ کے جانشین، دکن کی ریاست میسور میں حیدر علی کا ظہور، مرہٹوں سے تعلقات اور ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریز اقتدار کا قیام کے علاوہ حیدر آباد دکن کی تاریخ نواب میر عثمان علی خان کے عہد تک،95 جیسی وسیع اور بیش بہا تفصیلات کا منصوبہ مولانا کے ذہن میں تھا جو قراطیس کی زینت نہ بن سکا۔ لیکن نکات کی صورت میں مودودی صاحب بنیادی کام ترتیب دے چکے ہیں۔ اب ان نکات کی مدد سے مواد کی جستجو و تحقیق کا کام باقی ہے۔ یہ مواد یقیناً سید مودودی کے مخزن علمی میں موجود ہوگا۔ جسے ترتیب دے کر کتابی شکل میں لانا اس موضوع پر قابل قدر علمی اضافہ ہوگا۔

دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر

''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر'' مولانا مودودی کے سلسلہ مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ''الجمیعۃ'' کی ادارت کے دوران تحریر کیے تھے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''دکن کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلو خاص طور پر دلچسپ ہے۔ میں ایک عرصہ سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس پر ایک مفصل کتاب لکھوں۔ چنانچہ اس کے لیے کافی مواد فراہم کر لیا تھا۔ لیکن حالات نے اس ارادہ کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اب ایک خاص موقع پر اخبار ''الجمیعۃ'' کیلیے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تو تمام پچھلی معلومات کا ہجوم ہوگیا اور اجمال و اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود دامن بحث و بیان

کی طرح سمٹ نہ سکا۔ اگر بمجبوراً اس [illegible]

کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو انشاء

اللہ یہی رسالہ ایک کتاب کی صورت اختیار کرلے گا"۔96

سلطنت مغلیہ میں پیدا ہونے والے انتشار اور طوائف الملوکی کے باعث قائم ہونے والی آزاد و خود مختار ریاستوں میں سے ایک دولت آصفیہ بھی تھی جو حیدر آباد دکن میں قائم ہوئی۔ اس کی اہمیت اور حیثیت اور حکومت برطانوی ہند سے اس کے تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے سید مودودی کتاب کے ابتدائیہ میں تحریر کرتے ہیں "سر جان میلکم (Sir John Malcolm) کے بقول دولت آصفیہ پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکز ثقل ہے۔ سلطنت کے اندر ایک سلطنت جو تقریباً ۱۳ ملین انسانوں پر حکمران ہو جس کی حدود کی وسعت یورپ کی جلیل القدر سلطنتوں کے برابر ہو، جس کو اپنی رعایا پر کامل حاکمیت مطلقہ حاصل ہو، ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کی اہمیت کو آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکے۔97

دکن میں قائم ہونے والی تین بڑی ریاستوں مرہٹہ ریاست، ریاست میسور اور ریاست نظام حیدر آباد ہیں۔ موخر الذکر ریاست برطانوی ہند کی مخلص اور وفادار تھی۔ اس کے اخلاف کے جواب میں برٹش انڈیا کے برتاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں "جہاں تک دولت آصفیہ کا تعلق ہے تاریخ پر اس کی دوستانہ وفاداری کے واقعات نمایاں موجود ہیں۔ میسور کی لڑائیوں سے لے کر آج تک سلطنت انگلشیہ پر کوئی ایسا نازک موقع نہیں آیا جس میں آصف جاہی تلوار اور روپیہ نے اس کی مدد نہ کی ہو۔ اس کا اعتراف خود برطانوی مدبرین نے بھی ہمیشہ کھلے دل سے کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں سلطنت برطانیہ نے اپنے یار وفادار کو دوستی کا کیا بدلہ دیا، اس کا جواب اکثر سکوت سے دیا گیا ہے۔98 انگریز تجزیہ کاروں کے سکوت پر سید مودودی نے دو جملوں میں معنی ترجمہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں "تاریخ اپنے سینے میں معلومات کا وافر ذخیرہ رکھتی ہے مگر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی"۔99

تاریخ کو زبان ایک مورخ ہی دیتا ہے بلکہ مورخ ہی وہ کہلاتا ہ جو تاریخ کو زبان دے اور ذخیرہ

معلومات کو اس کے مدفن سے نکال کر حقائق کی شکل میں سامنے لے آئے۔ اپنی اس تصنیف میں سید مودودی نے دولت آصفیہ کی سیاسی تاریخ کے علاوہ انگریزوں کی ان چالبازیوں اور شاطرانہ سیاست کا انہی کے مدبرین کی آراء وتبصروں کی مدد سے پردہ چاک کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں آپ نے ''ڈیڑھ صدی کے تعلقات پر ایک نظر'' کے عنوان سے جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ وہ پوری کتاب بلکہ پوری دولت آصفیہ کی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''انگریزی حکومت کے ساتھ فرمانروایان سلطنت آصفیہ کے ابتدائی تعلق سے لے کر جدید ترین عہد تک ڈیڑھ صدی سے زائد مدت میں دونوں سلطنتوں کے سیاسی تعلقات کا جو حال رہا۔ اس طویل داستان کی تفصیلات کو نظر انداز کر کے اگر اس کا ایک اجمالی خلاصہ نکالا جائے، تو وہ ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''دولت آصفیہ کی جانب سے ہمیشہ وفاداری اور احسان کا برتاؤ کیا گیا اور دولت برطانیہ کی جانب سے اس کا جواب ہمیشہ بے وفائی ومحسن کشی کی شکل میں دیا گیا''۔100

مزید لکھتے ہیں ۱۷۶۶ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک دونوں کے سیاسی تعلقات کی پوری تاریخ کو پڑھ جائیے، آپ دیکھیں گے کہ سلطنت برطانیہ پر کوئی نازک وقت ایسا نہیں آیا جس میں دولت آصفیہ نے جان و مال سے اس کی مدد نہ کی ہو۔ مگر اس کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دولت آصفیہ کے احسانات کا بدلہ اسے نقصان پہنچا کر نہ دیا گیا ہو۔ نواب میر نظام علی خان نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور اپنی مملکت کی پانچ شمالی سرکاریں اور کڑپہ اور بلاری کے علاقے ان کی نظر کیے۔101 مگر اس کا بدلہ یہ ملا کہ فوج کے بہترین حصہ کو زبردستی منتشر کیا گیا۔ مرہٹوں کے ہاتھوں ان کی (نظام کی) سلطنت کو پامال ہوتے دیکھ کر انگریزوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ اس کے بعد نواب سکندر جاہ نے پہلی اور دوسری جنگ مرہٹہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کو خود ان کی مملکت میں بے بس کر دیا اور ان کے ملازمین سے ساز باز کر کے ان کی مملکت کے لیے ہلاکت و بربادی کے تمام سامان مہیا کر دیے۔102

نظام کی فوج میں عیب نکال کر ان کو ایک اور فوج خود انہی کے خرچ پر رکھنے پر اصرار کیا۔ نظام کے

انکار کے باوجود دکن اور ان سے دو ہزار سوار فوج رکھنے پر مجبور کیا۔ اس کی تعداد بعد میں چار گنا کر دی گئی۔ اس کے اخراجات کے لیے تقریباً ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کا بار ریاست کے خزانے پر ڈالا گیا۔ یہ فوج پہلے رسل بریگیڈ اور بعد میں حیدر آباد کنٹجنٹ بن گئی۔[103]

اس ضمن میں کورٹ آف ڈائریکٹر (Court of Director) کے ایک رکن کی یادداشت کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا کنٹجنٹ (Contingent) کی اصلیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نظام کی بہترین بے قاعدہ فوج کو رفتہ رفتہ ہم نے اپنی نگرانی میں ایک باقاعدہ کنٹجنٹ (Contingent) کی صورت دے کر نواب کو ان لوگوں کی خدمات سے محروم کر دیا جو ان کے ذاتی محافظ تھے اور جن کی قوت پر تحصیل اور پولس کے افسر، مالگزاری وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے کام میں بھروسہ کر سکتے تھے۔ اس طرح ہم نے نظام کو مجبور کر دیا کہ وہ نظم ونسق کو چلانے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیے پٹھانوں، روہیلوں اور عربوں کی ایک نہایت قابل اعتراض فوج بھرتی کریں''۔[104]

کنٹجنٹ کا بانی سر ہنری رسل (Henry Russel) لکھتا ہے ''یہ فوج صرف برائے نام نظام کی ملازم تھی۔ اس کو ہر مہینہ ریزیڈنٹ کے خزانے سے باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو کمپنی ہی کی فوج سمجھتی تھی۔ عملی اغراض کے لیے یہ فوج ایسی ہی تھی جیسی خود ہماری فوج، اور اس کو بھی ہم اپنی فوج کی طرح کام میں لا سکتے تھے۔[105] اس ناجائز فوج کے مصارف انگریز حکومت، نظام کے خزانے سے بے دردی کے ساتھ پوری کرتی رہی اور آہستہ آہستہ نظام کو اپنا مقروض بنالیا اور قرض کی ادائیگی کے لیے قلیل مدت مہلت فراہم کر کے نظام کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کی سازش کی۔

اس سلسلے میں لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) اور جنرل فریزر (Gen. Freezer) کے درمیان جو مراسلت ہوئی اس میں برار پر قبضہ طے پایا۔ سید مودودی نے فریزر کے اس خط کا حوالہ دیا ہے جو اس نے ڈلہوزی کو لکھا جس کے بعض حصے قابل مطالعہ ہیں

''برار پائیں گھاٹ تجارتی اور زرعی دونوں حیثیات سے نظام کی مملکت

کا سب سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش حصہ ہے اور میں نے کبھی نہیں سنا
کہ اس کی مال گزاری کے وصول کرنے میں کوئی دقت پیش آئی ہو،
میں یقین رکھتا ہوں کہ روئی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی
خطہ اس پر فوقیت نہیں رکھتا اور اس چیز کی پیداوار اور برآمد ہمارے
انتظام میں اس سے بدرجہا زیادہ ہوجائے گی جتنی اب تک رہی
ہے''۔106

چنانچہ نظام کو قرضوں میں چھوٹ دے دے کر اس حد تک مقروض کر دیا گیا کہ قرض کے بدلے برار کا زرخیز علاقہ دھوکہ سے ہتھیا کر نظام کو اس کے منافع میں حصہ دار بنا دیا گیا۔107

تمام تر زیادتیوں کے باوجود بھی ان حکمرانوں کا انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا سلسلہ جاری رہا۔ نواب ناصر الدولہ نے خود اپنے بھائی مبارز الدولہ کو جب کہ ان پر وہابی سازش کا الزام لگایا گیا (انگریزوں کی خوشنودی کے لیے) قید کیا۔108 ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۹ء میں کرنول اور گومسور وغیرہ کے خلاف فوجی امداد دی، اور انگریزی حکومت کے ناجائز مطالبات پر بے چوں وچرا لاکھوں روپیہ کنٹنجمنٹ کے لیے دیا، مگر اس سلوک کے عوض فوجی دھمکی دے کر ان سے ان کی پوری ریاست کا تیسرا حصہ زبردستی حاصل کرلیا۔ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے غدر کے ہنگامہ میں انگریزوں کی ایسی اعانت کی، جس پر خود وزیر ہند نے ان کو وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کا حکم دیا تھا۔109 اور از راہ خوشنودی یہ انعام فرمایا کہ جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کے لیے پانچ پانچ روپے مہینہ کا زائد بھتہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس فضول خرچی کا بوجھ سرکار انگریز کے خزانے پر نہیں پڑا بلکہ خود سرکار نظام ہی کے خزانے پر پڑا کیوں کہ یہ زائد خرچ برار کی آمدنی سے وصول کیا گیا اور اسے نظام کے حساب میں محسوب کرلیا گیا۔110

نواب میر محبوب علی خان مرحوم نے مصر، افغانستان اور اس کے خلاف مالی اور فوجی امداد پیش کی اور تمام عمر انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے رہے مگر ان کو اس کا یہ انعام دیا گیا کہ جب وہ شدید مالی مشکلات

میں مبتلا تھے تو ان کو برار کے منافع سے محروم کر کے معاہدات و مواعید کے خلاف استرداد برار سے مایوس کر کے ان سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا۔ آخر میں اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر نے جنگ عظیم میں برطانوی سلطنت کے تمام غیر برطانوی دوستوں سے زیادہ اس کی مالی اور فوجی اعانت کی اور موت وزیست کی کشمکش میں اس کا ہاتھ بٹایا، مگر جب وہ سخت وقت گزر گیا تو ان کے احسانات کا بدلہ یہ دیا گیا کہ برار کے مسئلے میں ان کے مطالبات کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا اور حق طلبی کی پاداش میں ان کے لیے طرح طرح کی داخلی مشکلات پیدا کرنے کا سامان کیا گیا۔111

دولت آصفیہ کی طویل تاریخ کا اختصار کرتے ہوئے سید مودودی کہتے ہیں ''اس تاریخی داستان کو دھرانے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ سابق میں جو غلطیاں کی گئی ہیں انھیں بیان کر کے ان کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور ان کی تلافی کا مشورہ دیا جائے۔ تاریخ اس لیے نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے بلکہ اس لیے ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔112

سید مودودی کا ابتدائی عہد بھی برٹش انڈیا کا عہد تھا اس کتاب کے ذریعے انھوں نے انگریزوں کی چالبازیاں انھی کی یادداشتوں سے آشکارا کر کے انھیں اپنے یار وفادار سے کی گئی زیادتیوں کے ازالے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''اس طویل مضمون کی تحریر سے میرا مقصد بھی یہی ہے کہ سلطنت برطانیہ کے مدبرین کو یہ مشورہ دوں کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گزشتہ نامۂ اعمال پر ایمانداری کے ساتھ نگاہ ڈالیں، اور خود اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ کیا دوستوں اور وفاداروں کے ساتھ یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔113 اگر برطانوی قوم میں فی الواقع کچھ ایسے صحیح الفکر ارباب نظر موجود ہیں جو اپنی سلطنت کی غلط پالیسی کے نتائج سمجھ سکتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اس پالیسی پر نظر ثانی کریں اور اپنے دوستوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو انعام و اکرام سے نہ سہی، حق و انصاف سے جوڑ کر اس وفاداری کا اپنے آپ کو جائز مستحق بنائیں جو ان کے لیے بڑے بڑے نازک اوقات میں حد درجہ قیمتی ثابت ہوئی ہے۔114

سلاجقہ

سید مودودی کی تاریخ نگاری کی انفرادیت، موضوعات کا تنوع ہے تفہیم القرآن، سیرت سرور عالم خلافت وملوکیت ہو یا ہندوستان کی تاریخ کے موضوع پر دکن کی سیاسی تاریخ اور دولت اصفیہ وحکومت برطانیہ کے تعلقات پر ایک ایک نظر یا ترک سلجوقیوں کی تاریخ پر سلاجقہ ہو۔ ہر موضوع کے ذیلی عنوانات کے تحت وسیع معلومات کا ذخیرہ یکجا کر کے ایسی جامع تاریخ قلمبند کرتے ہیں کہ قاری کو اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی طلب نہیں ہوتی۔ تاریخ کا طالب علم اس وقت بہت تشنگی محسوس کرتا ہے جب مولانا کی تحریر کردہ کتاب ایک سے زیادہ حصوں پر مشتمل ہو اور اس کے تمام حصے شائع نہ ہو سکے ہوں سیرت سرور عالم کے بعد دوسری کتاب سلاجقہ ہے جس کا حصہ اول چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں سلاجقہ کے تین ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں سید مودودی نے اس خاندان کی تاریخ کا مجمل خاکہ بیان کرتے ہوئے اسے چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کتاب کے ابواب کی تقسیم انہی ادوار کے مطابق ہوگی۔ لیکن ہمارا مقصد صرف سیاسی تغیرات ہی کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ تہذیب وتمدن کی تاریخ بھی مطلوب ہے اس لیے اس عہد کے آخر میں عہد سلاجقہ کی تہذیب کے متعلق ایک مفصل باب لکھا جائے گا جو حتی الامکان اس عہد کی تہذیب کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگا۔115 گویا ایک سلاجقہ کی تاریخ سے متعلق ایک مفصل خاکہ سید مودودی کے پیش نظر تھا جو بہ اعتبار ضخامت ایک سے زیادہ جلدوں کا متقاضی تھا۔ لیکن وہ اپنی علمی، دینی اور سیاسی مصروفیات کے باعث سلاجقہ کی تاریخ کو مکمل نہ کر سکے۔ بہر کیف حصہ اول میں سلاجقہ کے دور عروج تک کی تاریخ بیان کی ہے۔

آل سلجوق کی تاریخ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے، سید مودودی دیباچے میں لکھتے ہیں ''دولت آل سلجوق کی تاریخ، اسلام کی عظمت و بزرگی کے ایک نہایت اہم دور کی تاریخ ہے۔ دولت عباسیہ کے

سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالک اسلامیہ کے بیشتر حصہ کو ایک مرکز پر جمع کیا، وہ یہی سلجوقی سلطنت تھی۔ اس نے سرحد چین سے لے کر سواحل بحر ابیض تک اور عدن سے لے کر خوارزم و انجاز تک تمام مسلمان قوموں کو ایک کر دیا، اور ایشیاء کے اس بہترین خطہ کو، جو اس وقت نہ صرف اسلامی تہذیب کا بلکہ تمام عالم کی تہذیب کا علمبردار بنا ہوا تھا، سیاسی انتشار و پراگندگی کی حالت سے نکال کر پھر اس قابل بنا دیا کہ وہ انسانی تمدن کی تعمیر میں اپنے حصہ کا کام پورا کرے۔ لیکن اس سے زیادہ جو چیز اس سلطنت کی تاریخ کو ہمارے لیے اہم بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دور مسلمانوں کے تقدم و پیش روی کا آخر دور ہے۔ اس زمانہ میں ہم آخری مرتبہ مسلمانوں کو عالم انسانی کے امام اور رہنما کی حیثیت سے تمام قوموں کے آگے آگے چلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔116 طاقت و ثروت، تہذیب و مدنیت، علم و فن، تحقیق و اجتہاد اخلاق و روحانیت، غرض ہر اعتبار سے مسلمانوں کی فوقیت و برتری اس دور کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ مدتوں تک اسلامی تہذیب کے چشمے ابلتے رہے، بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے بڑے بڑے فاتح اور مدبر اٹھے، بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ہندوستان، مصر اور روم میں بڑی بڑی پر رونق محفلیں گرم ہوئیں مگر واقعہ یہ ہے کہ فتنہ تاتار کی مہلک ضرب کھا کر اسلام کے دل و دماغ اور دست و پا کی قوت اس بری طرح سلب ہوئی کہ پھر وہ دنیا کی اجتماعی زندگی میں بالا دست اور فرمانروا کی حیثیت برقرار نہ رکھ سکا۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلاجقہ کی تاریخ اسلام کے آخری عہد زرین کی تاریخ ہے اور تاریخ عالم میں وہ اپنا ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔117

''سلاجقہ'' کی خصوصیت یہ ہے کہ سید مودودی نے اس کے مآ خذ کی ایک علیحدہ عنوان کے تحت وضاحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں ''اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان سب کی فہرست درج کرنا غیر ضروری ہے، کیونکہ دوران تحریر میں حسب مواقع ان کے حوالے دے دیے گئے ہیں۔ البتہ یہ بیان کرنے کی یقیناً ضرورت ہے کہ ہمارے پاس سلجوقیوں کی تاریخ معلوم کرنے کے اصلی ذرائع کون سے ہیں اور وہ کس حد تک قابل وثوق ہیں''۔118 سید مودودی نے جن مآ خذ سے مدد لی ہے ان میں تاریخ

تبی، راحۃ الصدور، تاریخ الکامل، وفیات الاعیان، المختصر فی اخبار البشر، تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر، مختصر سلجوق نامہ، تاریخ سلاجقہ کرمان، طبقات ناصری شامل ہیں۔ یہ کتابیں عربی اور فارسی زبان میں ہیں۔ عہد حاضر کا طالب علم عربی، فارسی زبان سے ناواقف ہونے کے باعث اپنی تاریخ کے بنیادی ماخذ تک رسائی نہیں رکھتا۔ لہٰذا تاریخ کے ان موضوعات پر قلم اٹھانا جو تمام تر اہمیت کے باوجود محض زبان کی ناآشنائی کے باعث گوشۂ تاریکی میں مدفون ہیں انہیں اردو میں منتقل کرنا اور ان سے متعلق تمام بنیادی ماخذ سے استفادہ کر کے اعلیٰ معیار پر فائز کرنا کسی بھی مورخ کی تاریخ نویسی کا کمال ہوتا ہے۔ سلاجقہ کے ذریعے سید مودودی نے اپنے اس کمال کو انتہا تک پہنچایا ہے۔

سلاجقہ میں سید مودودی کی تاریخ نگاری کی دوسری خوبی نے بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ یعنی صرف مواد کو ہی یکجا نہیں کیا بلکہ نقشوں کی مدد سے اس دور کی جغرافیائی صورتحال اور سلجوقیوں کی علاقائی تاریخ اور ان کی فتوحات اور دور عروج کی وضاحت بھی کی ہے۔ جیسے آپ نے سلجوقیوں کا وطن اصلی اور وہ ممالک جو ان کے دور ظہور سے متعلق تھے۔ ایک نقشے کی صورت میں واضح کر کے نقشے کی جغرافیائی تشریح بھی کی ہے۔ اس طرح طغرل بیگ اور الپ ارسلان کی فتوحات کی اہمیت کو نقشوں کی مدد سے مزید واضح کیا ہے۔

سید مودودی نے اپنی اسی شاہکار تصنیف کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول، سلاجقہ کے دور ظہور سے متعلق ہے۔ اس میں سلجوقیوں اصل، ان کے ابتدائی حالات، تاریخ میں سلاجقہ کی اہمیت کا آغاز اور غزنویوں سے سلاجقہ کے تعلقات اور مسعود غزنوی کی شکست اور دولت سلاجقہ کے قیام کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ غزنوی حکومت کے خاتمہ اور سلجوقی حکومت کے قیام پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے سید مودودی لکھتے ہیں:

''چوتھی صدی کے آخر میں غزنی سے ایک دوسری قوت اٹھی جس نے ہندوستان سے لے کر عراق تک پورے وسط ایشیاء کو زیر و زبر کر دیا۔ یہ سبکتگین کے بیٹے محمود کی قوت تھی۔ اس نے ۹۹۸ء میں غزنین

کے تخت پر بیٹھنے کے بعد دولت سامانیہ کی برائے نام اطاعت کا جوا اتار پھینکا، براہ راست خلیفہ سے خراسان اور غزنی کی حکومت کا پروانہ حاصل کیا اور تقریباً ۳۳ سال کے اندر اپنی سلطنت پنجاب، افغانستان، ماوراء النہر، خراسان، رے اور اصفہان تک وسیع کر لی۔ اس اولعزم فاتح کا طاقتور ہاتھ اسلامی دنیا کی ان سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی پوری قدرت رکھتا تھا جن میں وہ اس وقت الجھی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی قوت کو ملک گیری کے کام میں صرف کرنا زیادہ پسند کیا اور عالمِ اسلام کے مسائل کو ایک دوسری طاقت کے لیے چھوڑ دیا جو اس کی زندگی ہی میں ابھرتی شروع ہو گئی تھی، اور جو اس کے مرتے ہی اسلامی سیاست کے اسٹیج پر نمودار ہو گئی۔ یہ نوخیز قوت اپنی سلجوقیوں کی تھی جن کی تاریخ اس کتاب کا موضوع بحث ہے۔119

پانچویں صدی کی ابتداء تھی جب کہ یہ سیدھے سادھے ترکمان شمال کے غیر متمدن علاقوں سے جنوب کی طرف بڑھے جہاں کے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے ان کے تازہ اور گرم خون کی ضرورت تھی۔ صدی کی پہلی چوتھائی انھوں نے سیاسی طاقت بہم پہنچانے میں صرف کی، دوسری چوتھائی میں تخت شاہی پر جلوہ گر ہوئے، اور تیسری چوتھائی میں وہ پورے مشرقی علاقوں کے مالک تھے''۔120

باب دوم سلاجقہ کے دور تاسیس کی تاریخ ہے۔ طغرل بک سلجوقی سے غزنی کے تخت پر سلجوقی حکومت کا آغاز ہوا۔ سلجوقی حکومت کے قیام کے بارے میں سید مودودی لکھتے ہیں ''ابتدا وہ (سلجوقی) صرف اس بات کے خواہاں تھے کہ انھیں خراسان میں رہنے اور اپنے جانوروں کے لیے چراگاہیں استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ان کے دل میں سلطان غزنین سے لڑنے کا خیال تک نہ تھا۔121 پھر انھیں مجبوراً حفاظت نفس کے لیے لڑنا پڑا اور لڑائی میں فتح حاصل کرنے سے ان کی جرائتیں بڑھ گئیں۔ تاہم سلطنت غزنیں کا رعب ایک حد تک ان کے دل سے دور نہ ہوا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ جس چیز کی طمع رکھتے تھے وہ صرف یہ تھی کہ خراسان کے جو اضلاع ان کے علاقے سے متصل ہیں وہ دولت غزنویہ کے زیر سایہ ان کی جاگیر میں دے دیئے جائیں، لیکن اس کے بعد کی پیہم کامیابیوں نے انھیں مجبور کیا کہ خود اپنی

سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کریں اور جب وہ خراسان کے دارالحکومت نیشا پور میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوئے تو ان کے سردار طغرل بک کو کوئی چیز اس سے روکنے والی نہ تھی کہ وہ سلطان مسعود کے تخت پر بیٹھے اور دربار عام میں اپنی حکومت کا اعلان کرے۔122

باب سوم سلاجقہ کا دور عروج اور باب چہارم دور عروج کا تسلسل ہے۔ ان ابواب میں سلطان الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی اور ان کے وزیر نظام الملک طوسی کے ہاتھوں ہونے والی فتوحات، خلفائے عباسیہ سے خاندانی تعلقات جن کا آغاز طغرل بک کے عہد سے ہو چکا تھا، ان تعلقات کی انفرادیت یہ تھی کہ عباسی تاریخ میں پہلی مرتبہ عباسی خاندان کی بیٹی نہ صرف خاندان سے باہر بلکہ عربیت سے باہر ایک ترک حکمران کے نکاح میں دی گئی تھی۔123 جب کہ طغرل کی بھتیجی ارسلان خاتون، خلیفہ قائم بامراللہ سے بیاہی گئی تھی،124 اور سلطان ملک شاہ کی بیٹی کا نکاح خلیفہ مقتدی عباسی سے ۴۷۴ھ میں ہوا،125 اس طرح خلافت و سلطنت میں خاندانی تعلقات قائم ہوئے، جو زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکے اور کشیدگی اس حد تک بڑھی کہ خلیفہ اور سلطان میں تصادم کی صورت حال پیدا ہوگئی، لیکن ملک شاہ کے انتقال کے باعث اس کی نوبت نہ آسکی۔126 اس کتاب کا اختتام ملک شاہ کے عہد پر ہوتا ہے۔

سید مودودی کی تاریخی نگارشات کے جائزے سے ان کی تاریخ نویسی کا حسن ہی نکھر کر سامنے نہیں آیا ہے، بلکہ ان کی نگارشات انہیں ایک مورخ کے مقام پر بھی فائز کرتی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد، مولانا مودودی کے اسلوب تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا مودودی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ایک منفرد علم الکلام دیا ہے۔ اسی ذیل میں مولانا مودودی نے مسلم تاریخ کا محاکمہ (Critique) لکھا ہے۔ جو محض محاکمہ نہیں بلکہ تاریخ کو دیکھنے کا ایک منفرد اسلوب اور زاویہ ہے۔127 مولانا مودودی تجدید و احیائے دین، خلافت و ملوکیت، سلاجقہ، دکن کی سیاسی تاریخ کے علاوہ

تفہیم القرآن کے اوراق میں ہمیں رہنمائی دیتے ہیں کہ ہمیں تاریخ

کو کیسے دیکھنا چاہیے اور ہم اس کی تعبیر کیسے کریں''۔128

حوالہ جات

1- سیّد مودودی کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات، ص ۳۵۲

2- خورشید احمد، ڈاکٹر، ظفر اسحٰق انصاری، ڈاکٹر۔ ''احیائے اسلام اور مولانا مودودی'' تذکرہ جلد ۲، ص ۲۲، محولہ بالا

3- امرتسری، حکیم محمد شریف۔ ''مکاتیب زندان'' جون ۱۹۵۳ء، کراچی: مکتبہ چراغ راہ، ص ۸۹

4- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (جولائی ۱۹۹۱ء)، تفہیم القرآن، طبع دوازدھم، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۶، جلد اوّل

5- ایضاً، ص ۷

6- ایضاً

7- ایضاً، ص ۱۱

8- ایضاً

9- تفہیم القرآن۔ (دسمبر ۱۹۹۰ء)، جلد ششم، اشاعت ۱۹، ص ۲۷۴

10- ایضاً

11- ایضاً

12- ایضاً

13- ایضاً، ص ۵۲۰

14- ایضاً، ص ۵۲۱

15- تفہیم القرآن۔ جلد اوّل، ۵۳۴۔۵۳۵

16- تفہیم القرآن۔ (جولائی ۱۹۹۱ء) جلد دوم، اشاعت ۲۵، ص ۱۱۸

17- ایضاً

18- ایضاً، ص ۱۱۹

19- ایضاً

20- ایضاً، ص ۱۲۰

21- ایضاً

22- ایضاً

23- ایضاً، ص ۱۲۱

24- ایضاً

25- ایضاً، ص ۱۲۲

26- ایضاً

27- ایضاً

28- ایضاً، ص ۱۲۴

29- ایضاً، ص ۱۲۶

30- ایضاً، ص ۱۲۷

31- ایضاً، ص ۱۲۶

32- تفہیم القرآن۔ جلد اوّل، ۲۳۷

33- ایضاً، ص ۲۳۰

34- ایضاً، ص ۲۸۵

35- ایضاً، ص ۲۸۶

-36 ...یم القرآن۔ (جولائی ۱۹۸۶ء)، جلد چہارم، ... ص ۵۱

-37 ایضاً، ص ۵۶

-38 ایضاً

-39 ایضاً

-40 ایضاً، ص ۵۸

-41 ایضاً

-42 ایضاً، ص ۶۲

-43 ایضاً

-44 ایضاً

-45 ایضاً

-46 ایضاً، ص ۶۳

-47 ایضاً

-48 تفہیم القرآن۔ (جولائی ۱۹۹۱ء)، جلد پنجم، اشاعت ۲۰، ص ۴۸

-49 ایضاً

-50 ایضاً، ص ۴۱

-51 تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۱۲۷

-52 ایضاً

-53 ایضاً، ص ۱۲۸

-54 تفہیم القرآن۔ جلد ششم، ص ۵۱۶

-55 ایضاً، ص ۵۱۴

56- ''تجدید واحیائے دین'' ص ۱۴۔۱۵، محولہ بالا

57- ایضاً، ص ۱۸

58- ایضاً، ص ۱۹

59- ایضاً، ص ۲۰

60- ایضاً، ص ۲۴

61- ایضاً، ص ۲۷

62- ایضاً، ص ۵۴

63- ایضاً، ص ۱۵۶

64- ایضاً، ص ۱۵۷

65- ایضاً، ص ۱۳۱

66- ''خلافتِ وملوکیت'' دیباچہ، ص ۱۱، محولہ بالا

67- ایضاً، ص ۳۲

68- ایضاً، ص ۳۳

69- ایضاً، ص ۸۳

70- ایضاً، ص ۸۷

71- ایضاً، ص ۸۸

72- ایضاً، ص ۹۱

73- ایضاً، ص ۹۲

74- ایضاً، ص ۹۳

75- ایضاً، ص ۹۴

76- ایضاً

77- ایضاً، ص ۹۵

78- ایضاً، ص ۱۰۰

79- ایضاً، ص ۱۱

80- ایضاً

81- ایضاً، ص ۱۶۰

82- ایضاً، ص ۱۶۱

83- ایضاً، ص ۱۱

84- ایضاً، ص ۲۹۹

85- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (مارچ ۱۹۴۴ء)، دکن کی سیاسی تاریخ، اشاعت اوّل، حیدرآباد دکن: دارالاشاعت سیاسیہ، ص ۴

86- ایضاً، ص ۱۔۲

87- ایضاً، ص ۳

88- ایضاً

89- مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (مارچ ۱۹۹۵ء)، دکن کی سیاسی تاریخ، اشاعت پنجم، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۹۷

90- ایضاً، ص ۱۹۸

91- ص ۵، اشاعت اوّل ۱۹۴۴ء

92- ایضاً، ص ۹۹، اشاعت پنجم ۱۹۹۵ء

93- ایضاً، ص ۲۰۰

-94 وثائق مودودی، ص

-95 ایضاً

-96 مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۲۸ء)، ''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر''، دہلی: جید برقی پریس، ابتدائیہ

-97 ایضاً

-98 ایضاً

-99 ایضاً

-100 ایضاً، ص ۱۸۵

-101 ایضاً

-102 ایضاً

-103 ایضاً، ص ۳۶

-104 ایضاً، ص ۴۵

-105 ایضاً، ص ۳۶

-106 ایضاً، ص ۷۰

-107 ایضاً

-108 ایضاً، ص ۱۵۸

-109 ایضاً، ص ۱۸۶

-110 ایضاً، ص ۱۰۷

-111 ایضاً، ص ۱۸۷

-112 ایضاً، ص ۱۸۹

113- ایضاً

114- ایضاً، ص ۱۹۰

115- سلاحقہ۔ دیباچہ، ص ۳۸، محولہ بالا [چیک کرنا ہے]

116- ایضاً، ص ۵

117- ایضاً، ص ۶

118- ایضاً، ص ۴۷

119- ایضاً، ص ۳۰

120- ایضاً، ص ۳۱

121- ایضاً، ص ۱۳۱

122- ایضاً، ص ۱۳۲

123- ایضاً، ص ۱۹۹، ۴۵۴ھ میں طغرل کا خلیفہ کی بیٹی سے نکاح ہوا، بحوالہ ایضاً

124- ایضاً، ص ۲۶۰

125- ایضاً، ص ۲۵۹

126- ایضاً، ص ۲۶۳

127- خورشید احمد، پروفیسر۔ (مئی ۲۰۰۴ء)، مولانا مودودی: مفکر، مصلح اور مدبر، اشاعت خاص ۲۔
ترجمان القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۲۷

128- ایضاً، ص ۱۲۸

نتیجہ تحقیق

زبان، تہذیب کے تمدنی و علمی سرمائے کو محفوظ رکھنے اور آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سنسکرت کے ساتھ عربی اور فارسی، ہندوستان کی علمی زبانیں قرار پائیں اور مروجہ عقلی و نقلی علوم میں انہی زبانوں میں کام ہوا۔ مزید یہ کہ برصغیر کی قدیم زبان سنسکرت بھی نہ صرف ان زبانوں سے متاثر ہوئی بلکہ علوم کا ایک بڑا ذخیرہ سنسکرت سے عربی اور فارسی میں منتقل ہوا۔ اس طرح یہ زبانیں ہندوستانی علوم سے بہرہ ور ہوئیں۔ فارسی زبان عام فہم ہونے کے باعث طبقۂ اعلیٰ اور ادب (Literature) کی زبان قرار پائی جبکہ عربی، علماء اور علم دوست حلقے تک محدود رہی قرآن کریم سے متعلق نقلی علوم، عربی زبان میں ہی ترویج پاتے رہے۔

ہندوستان میں بغرض تجارت آنے والے انگریز تاجر، دیگر یورپی تاجروں کے مقابلے میں ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کرنے میں اس لیے بھی کامیاب ہوئے کہ ابتداً انہوں نے یہاں کے حکمرانوں اور امراء کی زبان اور ثقافت کو اپنایا اور زبان کے ذریعے نہ صرف یہاں کے باسیوں کے درمیان جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے بلکہ ان کی نفسیات کو سمجھنے اور اسے اپنے مفاد میں استعمال کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ یہی انگریز تاجر جب حکمرانوں کی نااہلی اور کمزوریوں کے باعث ہندوستان کے آقا اور حاکم بن گئے تو انہوں نے دو کام کیے۔ ایک تو انگریزی زبان کو بتدریج ہندوستان میں نافذ کیا۔ دوسرے یہاں کی قدیم زبانوں عربی، فارسی، اور سنسکرت کی جگہ علاقائی زبانوں اردو اور دیوناگری کو رائج کر کے ہندو اور مسلمانوں کی ان کے اصل سے ناطہ توڑنے کی کوشش کی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک مسلمانوں نے اپنے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ عربی اور فارسی زبانوں و علوم کا دفاع اور احیاء جاری رکھا۔ بیسویں صدی میں ہمیں ایسے دانشور اور مفکرین نظر آتے

ہیں جنھوں نے عربی و فارسی کے علمی سرمائے کو اردو زبان میں منتقل کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ ان دانشوروں میں علیگڑھ، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء سے وابستہ افراد کی ایک طویل فہرست ہے (جن کا مقالے کے باب سوم میں تاریخ نویسی کے ضمن میں جائزہ لیا گیا ہے) جنھوں نے دینی، ادبی اور تاریخی کتب اردو زبان میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کی ان علوم تک رسائی بہم پہنچائی اور مسلمانوں کا ان کے دین اور ماضی سے نہ صرف رشتہ قائم رکھا بلکہ اسے محفوظ بھی رکھا۔

انفرادی سطح پر جس شخصیت نے ایک ادارے کی صورت میں یہ خدمات انجام دیں وہ نابغۂ روزگار ہستی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ جن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں ارشاد و ہدایت اور تزکیۂ نفس و اصلاح کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا کے والد احمد حسن صاحب اعلیٰ تعلیمیافتہ اور ماہر وکیل ہونے کے علاوہ سلسلہ رشد و ہدایت کے بھی وارث اور امین تھے۔ اپنی خاندانی روایات کے برعکس جناب سید مودودی نے اصلاح و ہدایت کے لیے قلم کو اپنا ذریعہ بنایا اور آغاز نوجوانی سے ہی تحریر و تصنیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو دین کے خلاف رونما ہونے والی ہر سازش خواہ وہ انفرادی طور پر کسی شخصیت (شردھانند) کی جانب سے ہو یا اجتماعی طور پر کسی فرقہ (انکارِ حدیث اور قادیانیت) کی۔ آپ نے ہر ایک کے خلاف جہاد بالقلم کا فریضہ ادا کیا ہے۔

سوامی شردھانند کے قتل کے ردعمل میں اسلام اور نظریہ جہاد کے خلاف جو زہر افشانی ہوئی، سید مودودی نے الجہاد فی الاسلام لکھ کر مخالفین اسلام کو لاجواب کر دیا۔ اسی طرح جب ہندوستان میں اسلام کے خلاف انکار حدیث اور قادیانیت جیسے فرقوں نے جنم لیا اور اپنے نظریت و افکار کے ذریعے اسلام کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو سید مودودی نے ترجمان القرآن میں سنت کی اہمیت پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو ''منصب رسالت نمبر'' کے عنوان سے شائع ہوا اور بعد میں ''سنت کی آئینی حیثیت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ قادیانیت کے خلاف آپ نے مسئلۂ قادیانیت لکھ کر اس فرقہ کے خودساختہ نظریات کا تار پود بکھیر دیا اور مرتدینِ اسلام کی قلعی کھول دی۔ (آپ کی اس تصنیف کے خلاف ردعمل اتنا شدید تھا کہ آپ کو

موت کی سزا بھی سنائی گئی جو بعد میں سزائے قید میں تبدیل ہوئی)

آپ کی مذکورہ بالا تصانیف کے ذریعے اگر ایک طرف مسلمان دین کی حقیقت اور ان فرقوں کی اصلیت سے آگاہ ہوئے تو دوسری طرف ان کتب میں تاریخی مباحث سے کی جانے والی بحث سے تاریخ کے مختلف گوشے بھی عیاں ہوئے۔

بالخصوص تاریخ کے موضوع پر سید مودودی کی اہم تصانیف' تفہیم القران' تجدید و احیائے دین' خلافت وملوکیت' دکن کی سیاسی تریخ' دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر اور سلاجقہ ہیں۔ جبکہ دیگر موضوعات خواہ وہ سیاست' معیشت اور قانون سے متعلق ہوں یا دینی نظریات و مباحث سے متعلق ہوں۔ یہ کثرت تاریخی حوالوں کے باعث ان کی تاریخی حیثیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

تفہیم القرآن سید مودودی کی تاریخ نگاری کا بہترین شاہکار ہے، جس میں آپ نے روایتی تفسیر نگاری سے ہٹ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے تفہیم القرآن اپنی پیشرو اور ہمعصر تفاسیر کے مقابلے میں آسان فہم ہے۔

تفہیم کے ترجمے کی دوسری خوبی قرآن کے بیان کردہ واقعات کو تاریخی اسلوب کا جامہ پہنا کر اسلام کی طویل ترین تاریخ کو اختصار کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ سید مودودی نے تاریخی واقعات کے بیان اور اسلامی اصول وقوانین کی وضاحت کے لیے جس طرح پیراگراف کی صورت میں تحریر کا منفرد انداز اختیار کیا ہے اس نے عبارت میں ربط اور تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔

تین عشروں میں پایۂ تکمیل تک پہنچنے والی اس تفسیر کی اہم اور نمایاں خوبی ہر جلد کے آخر میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ تاریخی واقعات' شخصیات' احکاماتِ الٰہی اور تقابل ادیان کی تفصیل کی نشاندہی اشاریہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ قرآن و تاریخ سے متعلق مطلوب موضوع کی تلاش کے لیے یہ اشاریہ انتہائی مفید اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ خوبی ہمیں تفہیم القرآن کے علاوہ کسی تفسیر میں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ

علیحدہ سے قرآن کے اشاریے متعدد زبانوں میں تیار ہو چکے ہیں لیکن کتاب اور اشاریے کی سہولت یکجا شکل میں صرف تفہیم القرآن کی ہی انفرادیت ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کو ہم قرآنی انسائیکلو پیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ کے موضوع پر سید مودودی کی دوسری کاوش تجدید و احیائے دین ہے جس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ کار تجدید کی نوعیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مجدد دین اسلام' حضرت عمر بن عبدالعزیز' ائمہ اربعہ' امام غزالی' امام ابن تیمیہ' شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے کار تجدید کا جائزہ لے کر اسلام کے تجدیدی روایات پر روشنی ڈالی ہے اور ان مجدد دین کے تجدیدی کاموں میں رہ جانے والی کمزوریوں کی نشاندہی کر کے واضح کیا ہے کہ کیوں ان میں سے کوئی بھی مجدد کامل کے منصب پر فائز نہ ہو سکا۔ تاہم بدلتے ہوئے حالات و افکار میں مسلمان کس طرح تجدد دین کا کام کر سکتے ہیں' سید مودودی نے کار تجدید کی نوعیت میں اس کی نشاندہی کر کے مشعل روشن کر دی ہے۔

سید مودودی نے خلافت کی اہمیت اور اسلامی تاریخ کے سنہری دور' خلفائے راشدین کے عہد کے بعد شروع ہونے والی خاندانی حکومتوں (جسے مولانا ملوکیت سے تعبیر کرتے ہیں) کی تاریخ پر ''خلافت و ملوکیت'' تحریر کی جس میں واضح کیا کہ خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی کس طرح عمل میں آئی اور مملکت اسلامیہ اور مسلمانوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ سید مودودی نے تاریخ کے اس باب میں اپنی سیاسی و اجتہادی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے اختلاف و اتفاق ممکن ہے۔ اور اہل علم حضرات نے اختلاف رائے کا اظہار بھی کیا ہے لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی بھی ممکن نہیں کہ اپنی رائے کی سند کے ضمن میں سید مودودی نے جن ماخذوں کے حوالے پیش کیے ہیں انہیں رد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ' مسلمانوں کی تاریخ کا جو پہلو انہوں نے اجاگر کیا ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

سید مودودی نے اپنی ابتدائی تاریخ نگاری کے عہد میں یعنی ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک کے مختصر عرصہ میں تاریخ کے موضوع پر جو کتب تحریر کیں ان میں دکن کی سیاسی تاریخ' دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات اور سلاجقہ ہیں جن میں ہندوستان اور وسط ایشیا کی سیاسی صورت حال کو مستند ماخذوں' نقشوں

اور سرکاری دستاویزات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ سید مودودی کی یہ تصانیف بہ اعتبار ضخامت وزن میں ہلکی لیکن بہ اعتبار علمی ذخیرہ تاریخ میں گراں مایہ اضافہ ہیں۔

سید مودودی کی تاریخی تصانیف' ان کی تاریخ نویسی کی خوبیوں کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ قدمائے تاریخ نے تاریخ نویسی کے لیے تاریخ نویس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، اس میں صداقت' دیانت اور امانت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ یہ فطری خصوصیات ہیں جبکہ علمی سطح پر ایک مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ محدث' مفسر اور علم اجتہاد سے بھی آگاہی رکھتا ہو اور ان علوم سے وابستہ زبانوں پر بھی اسے دسترس حاصل ہو۔

بنظرِ غائر سید مودودی کی تاریخ نویسی کے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف فطری و اکتسابی خصوصیات سے متصف تھے بلکہ ان کی تاریخی تحریروں کی نمایاں خوبی تاریخ سے متعلقہ علوم سے استفادہ کر کے تاریخ کے مختلف گوشوں میں رہ جانے والے خلا کو پر کرنا ہے۔ انہوں نے علم جغرافیہ' علم ریاضی اور علم معاشیات و قانون اور تقابل ادیان کے علاوہ' دستاویزات کے ذریعہ نہ صرف سرمایۂ تاریخ میں معیاری اور گرانقدر اضافہ کیا ہے بلکہ ان کی تاریخ نویسی کی یہ انفرادیت انہیں بیسویں صدی کے مورخین میں نمایاں مقام بھی دیتی ہے۔

مصادر و مراجع

عربی کتب

ابنِ اثیر، عزالدین ابوالحسن علی۔ (۱۹۷۴ء)، الکامل فی التاریخ، بیروت لبنان: دار احیاء التراث العربی

جرجی زیدان۔ (۱۹۳۱ء)، تاریخ التمدن الاسلامی، مصر: مطبعۃ الہلال

مسعودی، ابوالحسن۔ (۱۹۴۶ء)، مروج الذہب و معاون الجواہر، مصر: مطبعۃ البہیہ قاہرہ

فارسی کتب

بہار، محمد تقی۔ (۱۳۲۱ء)، سبک شناسی، تہران: چاپخانہ، خودکاری

جہانگیر، نورالدین۔ (۱۳۵۹)، توزک جہانگیری، (جہانگیر نامہ)، بہ کوشش، محمد ہاشم خان، ایران: انتشارات بنیاد فرہنگ

صفا، ذبیح اللہ۔ (۱۳۷۳)، حماسہ سرائی در ایران، تہران: چاپخانہ رامین

کنبوہ، محمد صالح۔ (فروری ۱۹۷۲ء)، عمل صالح الموسوم، شاہجہاں نامہ، ترتیب دکتر غلام یزدانی، لاہور: مجلس ترقی ادب

کوفی، علی بن حامد بن ابی بکر۔ (۱۹۳۹)، فتح نامہ سندھ، المعروف بہ چچ نامہ، حیدرآباد دکن: مجلس مخطوطات فارسیہ

اردو کتب

آزاد، ابوالکلام۔ (س ن)، ہماری آزادی، لاہور: طیب پبلشرز

آزاد، ابوالکلام۔ (۱۹۹۷ء)، انڈیا ونس فریڈم، مترجم محمد حبیب، کراچی: ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

آزاد، ابوالکلام۔ (س ن)، تحریک آزادی، لاہور: حبیب پبلشرز

آزاد، ابوالکلام۔ (۱۹۷۸ء)، مسئلہ خلافت، لاہور: داتا پبلشرز

آزاد، محمد حسین۔ (۱۹۵۷ء)، آبِ حیات، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز

آزاد، محمد حسین۔ (۱۹۸۸ء)، دربارِ اکبری، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز

آفاقی، علی سفیان۔ (۱۹۵۸ء)، ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی

ابن ندیم، محمد بن اسحٰق۔ (۱۹۹۰ء)، الفہرست، مترجم محمد اسحٰق بھٹی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

ابن خلدون، عبدالرحمٰن۔ (س ن)، مقدمہ ابن خلدون، ترجمہ مولانا سعد حسن خان یوسفی، کراچی: میر محمد کتب خانہ

اسماعیل پانی پتی، شیخ۔ (۱۹۵۹ء)، مکتوباتِ سرسیّد، لاہور: مجلس ترقی اردو

اسپنگلر، اوسولڈ۔ (۲۰۰۵ء)، زوال مغرب، لاہور: نگارشات پبلشرز

اشرف، کے ایم۔ (۲۰۰۲ء)، تاریخ اور مؤرخ، ترتیب ڈاکٹر مبارک علی، لاہور: فکشن ہاؤس

آفتاب احمد۔ (س ن)، شبلی ایک دبستان، ڈھاکہ: مکتبۂ عارفین عظیم پور

اکرام، شیخ محمد۔ (۱۹۶۶ء)، رودِ کوثر، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ

اکرام، ایس، ایم۔ (۱۹۵۴ء)، یادگارِ شبلی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

اکرام، ایس، ایم۔ (۱۹۹۵ء)، موجِ کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

اکبر آبادی، سعید احمد۔ (دسمبر ۱۹۹۶ء)، مولانا ابوالکلام آزاد، سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے، مرتب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، کراچی:

السخاوی، شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن، (جون ۱۹۶۸ء)، تاریخ التاریخ موسوم بہ الاعلان بالتوبیخ، ترجمہ ڈاکٹر سیّد محمد یوسف، لاہور: مرکزی اردو بورڈ

امیر خورد، مبارک علی کرمانی۔ (اپریل ۱۹۸۶ء)، سیر الاولیاء، ترجمہ، اعجاز الحق قدوسی، لاہور: اردو سائنس بورڈ

امیر علی، سید۔ (۱۹۹۷ء)، تاریخ اسلام، مترجم باری علیگ، لاہور: تخلیقات

امیر علی، سیّد، (۱۹۹۵ء)، روحِ اسلام، مترجم محمد ہادی حسین، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

امرتسری، حکیم محمد شریف۔ (جون ۱۹۵۳ء)، مکاتیب زندان، کراچی: مکتبۂ چراغ راہ

بدایونی، عبدالقادر۔ (س ن)، منتخب التواریخ، ترجمہ محمود احمد فاروقی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز

برنی، ضیاء الدین۔ (۱۹۹۱ء)، تاریخ فیروز شاہی، مترجم، ڈاکٹر معین الحق، لاہور: اردو سائنس بورڈ

باری۔ (۱۹۴۹ء)، تاریخ کا مطالعہ، لاہور: مکتبۂ اردو

بٹالوی، سجان رائے۔ (دسمبر ۱۹۶۶ء)، خلاصۃ التواریخ، مترجم ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، لاہور: مرکزی اردو بورڈ

بابر، ظہیر الدین۔ (۱۹۸۵ء)، تزکِ بابری، ترجمہ رشید اختر ندوی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

بدخشانی، مقبول بیگ۔ (س ن)، ادب نامہ ایران، لاہور: نگارشات

بلگرامی، سیّد علی۔ (س ن)، تمدن عرب، لاہور: مقبول اکیڈمی

پوری، آباد شاہ۔ (۱۹۸۹ء)، تاریخ جماعت اسلامی، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

پیرزادہ، شریف الدین۔ (اگست ۱۹۶۵ء)، پاکستان منزل بہ منزل، کراچی گلڈ اشاعت گھر

جامی، نور الدین عبدالرحمٰن۔ (س ن)، نفحات الانس، لاہور: اللہ والے کی قومی دکان، کتب بازار کشمیری

جوز جانی، منہاج الدین سراج۔ (۱۹۸۵ء)، طبقات ناصری، ترجمہ غلام رسول مہر، لاہور: اردو سائنس بورڈ

جعفری، رئیس احمد۔ (۱۹۸۷ء)، دید و شنید، کراچی: رئیس احمد جعفری اکیڈمی

جعفری، رئیس احمد، (دسمبر ۱۹۶۳ء)، سیرت محمد علی، لاہور: محمد علی اکیڈمی

جہانگیر، نور الدین محمد۔ (۲۰۰۴ء)، تزکِ جہانگیری، ترجمہ مولوی احمد علی رامپوری، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

جیراجپوری، محمد اسلم، (جون ۱۹۹۵ء)، تاریخ الامت، نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ

چراغ، محمد علی۔ (۲۰۰۳ء)، اکابرینِ تحریکِ پاکستان، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

حالی، الطاف حسین۔ (۱۹۸۶ء)، حیاتِ جاوید، لاہور: نیشنل بک ہاؤس

حامدی، سہیل احمد۔ (نومبر ۲۰۰۱ء)، مولانا مودودی کا سفر سعودی عرب، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

حسن ریاض۔ (۱۹۹۲ء)، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ

خالد، سلیم منصور۔ (س ن)، وثائق مودودی، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

خان، سرسیّد احمد۔ (۱۸۵۷ء)، اسباب بغاوتِ ہند، باب الاسلام پریس

خان، سرسیّد احمد۔ (۱۹۹۰ء)، آثار الصنادید، مترجم خلیق انجم، دلی: اردو اکادمی

خان، سرسیّد احمد۔ (۱۹۶۳ء)، مقالات سرسیّد، مرتب، محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی اردو

خان، معتمد۔ (۱۹۶۳ء)، اقبال نامہ جہانگیری، مترجم، محمد ذکریا، کراچی:

خان، محمد یحییٰ۔ (۱۹۹۹ء)، اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے معمار، لاہور: تخلیقات

خان، ہاشم علی۔ (۱۹۵۸ء)، منتخب اللباب، مترجم محمود احمد فاروقی، کراچی: نفیس اکیڈمی

خرم بدر۔ (ستمبر ۱۹۸۸ء)، سیّد مودودی کی سیاسی زندگی، کراچی: صباء پبلیکیشنز

خورشید احمد۔ (ستمبر ۱۹۶۵ء)، تذکرۂ زنداں، کراچی: مکتبۂ چراغ راہ

خورشید احمد۔ (دسمبر ۱۹۷۲ء)، ادبیاتِ مودودی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز

خلیق الزماں، چوہدری۔ (اپریل ۱۹۸۷ء)، شاہراہ پاکستان، کراچی: انجمن اسلامیہ پاکستان

داراشکوہ، شہزادہ۔ (مئی ۱۹۸۶ء)، سفینۃ الاولیاء، مترجم محمد لطفی، کراچی: نفیس اکیڈمی

دسنوی، شہاب الدین۔ (۱۹۸۹ء)، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، کراچی: مجلس نشریات اسلام

ذکاء اللہ، مولوی۔ (۱۹۹۸ء)، تاریخ ہندوستان، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

روداد جماعت اسلامی۔ (س ن)، تنظیم جماعت اسلامی، دارالاسلام: مکتبۂ جماعت اسلامی

سالک، عبدالمجید۔ (س ن)، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

سبطِ حسن۔ (۲۰۰۷ء)، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبۂ دانیال

ستیارامیہ، بی پٹابھی۔ (س ن)، تاریخ کانگریس، دہلی: انڈین بک کمپنی

سراج الدین، سی۔ (۱۹۸۰ء)، ،یکچروں کا مجموعہ، آرہ: مفید عام

سرہندی، یحییٰ بن احمد۔ (اکتوبر ۱۹۸۶ء)، تاریخ مبارک شاہی، مترجم، ڈاکٹر آفتاب اصغر، لاہور: اردو سائنس بورڈ

سعید اختر۔ (س ن)، مسلمان تاریخ نویس، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

سفیر اختر۔ (جون ۱۹۹۸ء)، بیادِ سیّد مودودی، لاہور: دار المعارف

سفیر اختر۔ (جنوری ۱۹۹۸ء)، ادب اور ادیب، سیّد مودودی کی نظر میں، لاہور: دار المعارف

سندیلوی، نبی احمد۔ (جولائی ۱۹۶۸ء)، تذکرۂ مؤرخین، کراچی: اقبال پبلشرز

شاہنواز خان، صمصام الدولہ۔ (۲۰۰۴ء)، مآثر الامرأ، مترجم، محمد ایوب قادری، لاہور: اردو سائنس بورڈ

شبلی نعمانی۔ (۱۹۸۹ء)، الفاروق، اعظم گڑھ: دار المصنفین

شبلی نعمانی۔ (س ن)، سیرۃ النعمان، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

شبلی نعمانی۔ (س ن)، سیرۃ النبی، کراچی: محمد سعید اینڈ سنز

شبلی نعمانی۔ (۱۹۸۹ء)، المامون، اعظم گڑھ: دار المصنفین

شبلی نعمانی۔ (۱۳۳۵ء)، شعر العجم، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن

شبلی نعمانی۔ (۱۹۳۴ء)، مقالاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دار المصنفین

شبلی نعمانی۔ (۲۰۰۰ء) اورنگزیب عالمگیر، ترتیب، ڈاکٹر مبارک علی، لاہور: فکشن ہاؤس

شرر، عبد الحلیم۔ (۲۰۰۵ء)، عصرِ قدیم، کراچی: سٹی بک پوائنٹ

شرر، عبد الحلیم۔ (۱۹۹۵ء)، فردوسِ بریں، لاہور: مکتبۂ عالیہ

شمل، این میری۔ (اپریل ۲۰۰۰ء)، برصغیر میں اسلام، ترجمہ ارشد رازی، لاہور: پرنٹ لائن

شہابی، انتظام اللہ۔ (فروری ۱۹۹۱ء)، تاریخِ ملت، لاہور: ادارہ اسلامیات

صدیقی، علی محسن۔ (فروری ۲۰۰۶ء)، مضامین تاریخی، کراچی: قرطاس

طباطبائی، غلام حسین۔ (جولائی ۱۹۶۸ء)، سیر المتاخرین، ترجمہ، یوسف احمر، کراچی: ایس ایڈی

عابد حسین، سیّد۔ (جنوری ۱۹۶۵ء)، ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ

عاصم نعمانی۔ (مارچ ۱۹۹۳ء)، سیّد مودودی کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لحات، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

عاصم نعمانی۔ (اکتوبر ۱۹۷۲ء)، تصوف اور تعمیرِ سیرت، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز

عاصم نعمانی۔ (جون ۱۹۷۰ء)، مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور: ایوانِ ادب

عباسی، قاضی محمد عدیل۔ (۱۹۹۷ء)، تحریکِ خلافت، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو

عبد، چوہدری عبدالرحمٰن۔ (جولائی ۱۹۸۸ء)، مفکرِ اسلام، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز

عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۸۴ء)، بزمِ مملوکیہ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین

عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (س ن)، بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں، کراچی: مجلس نشریات اسلام

عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (مئی ۱۹۸۹ء)، بزمِ تیموریہ، کراچی: نفیس اکیڈمی

عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۴۸ء)، بزم تیموریہ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین

عبدالرحمٰن، صباح الدین۔ (۱۹۸۰ء)، حیاتِ سلیمان، اعظم گڑھ: دارالمصنفین

عبدالباقی، رانا۔ (ستمبر ۲۰۰۴ء)، جنوبی ایشیا میں تہذیبی کشمکش، ایک تجزیاتی جائزہ، راولپنڈی

عثمانی، محمد واصل۔ (دسمبر ۱۹۶۱ء)، شبلی، ادیبوں کی نظر میں، صفیہ اکیڈمی

عظیم، اختر وقار۔ (دسمبر ۱۹۶۸ء)، شبلی بحیثیت مؤرخ، لاہور: تصنیفات

عائشہ بیگم۔ (۱۹۸۷ء)، تاریخ اور سماجیات، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو

عبداللہ، ڈاکٹر سیّد۔ (۱۹۶۵ء)، سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری وفنی جائزہ، لاہور: مکتبہ کاررواں کچہری روڈ

عبداللہ، ڈاکٹر سیّد۔ (مئی ۱۹۶۵ء)، سیر امن سے عبدالحق تک، لاہور: مجلس ترقی اردو

عزیز احمد۔ (جون ۱۹۹۷ء)، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، مترجم جمیل جالبی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

عفیف شمس سراج۔ (۱۹۳۸ء)، تاریخ فیروز شاہی، ترجمہ، مولوی فدا علی طالب، حیدرآباد، دکن: جامعہ عثمانیہ

عقیل، معین الدین۔ (۱۹۸۶ء)، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت

علی رہنما۔ (۱۹۹۹ء)، اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے معمار، لاہور: تخلیقات

عوفی، محمد سدید الدین۔ (۱۹۹۲ء)، جوامع الحکایات ولوامع الروایات، ترجمہ اختر شیرانی، کراچی: انجمن ترقی اردو

غازی، محمود احمد۔ (مئی ۲۰۰۷ء)، محاضرات سیرت، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب

فاروقی، ابوراشد۔ (جولائی ۱۹۷۷ء)، اقبال اور مودودی، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت

فرشتہ، محمد قاسم۔ (۱۹۹۸ء)، تاریخ فرشتہ، ترجمہ عبدالحئی خواجہ، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس

فرید آبادی، ہاشمی۔ (۱۹۸۹ء)، مسلمانانِ پاکستان و بھارت، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

قاضی جاوید، (۱۹۹۸ء)، سرسیّد سے اقبال تک، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

قریشی، اشتیاق حسین۔ (۱۹۸۷ء)، جدوجہد پاکستان، مترجم، ہلال احمد زبیری، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی

قریشی، اشتیاق حسین۔ (۱۹۸۷ء)، برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مترجم ہلال احمد زبیری، کراچی: شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

قریشی، اشتیاق حسین۔ (۱۹۹۴ء)، علماء میدان سیاست میں، کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

قریشی، ڈاکٹر وحید، ایس ایم اکرام۔ (جون ۱۹۶۶ء)، دربارِ ملی، ترجمہ و تالیف، خواجہ عبدالحمید یزدانی، لاہور: مجلس ترقی ادب

قریشی، محمد صدیق۔ (۱۹۸۸ء)، کشاف اصطلاحات تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان

کامران، جیلانی۔ (دسمبر ۱۹۹۰ء)، قائداعظم اور آزادی کی تحریک، لاہور: مجلس ترقی ادب

کرامت علی۔ (۱۹۹۵ء)، محرکات تحریک پاکستان، لاہور: غالب پبلشرز

لوبیجر، ہنری ایس۔ (۲۰۰۲ء)، مطالعہ تاریخ، ترجمہ غلام رسول مہر، لاہور: نگارشات

کنبوہ، محمد صالح۔ (۱۹۷۱ء)، عمل صالح، المعروف بہ شاہجہاں نامہ، ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، لاہور: مرکزی اردو بورڈ

کوثر، انعام الحق۔ (۱۹۸۶ء)، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، لاہور: اردو سائنس بورڈ

گریوال، شیر محمد۔ (۱۹۸۹ء)، اسلامیان ہند کا شاندار ماضی، لاہور: اسلامک بک سروس

گلبدن بیگم۔ (۱۹۹۵ء)، ہمایوں نامہ، ترجمہ رشید اختر ندوی، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز

گیلانی، اسعد۔ (۱۹۸۶ء)، سیّد مودودی، دعوت تحریک، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز

مبارک علی، (دسمبر ۲۰۰۷ء)، برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

مبارک علی۔ (۲۰۰۲ء)، تاریخ شناسی، لاہور: فکشن ہاؤس

مبارک علی۔ (۲۰۰۵ء)، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، لاہور: فکشن ہاؤس

محبّ الحسن۔ (۱۹۸۵ء)، ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو

محمد ذکریا۔ (س ن)، تاریخ مشائخ چشت، کراچی: مجلس نشریات اسلام

محمد یوسف۔ (نومبر ۱۹۵۵ء)، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، لاہور: البدر پبلیکیشنز

محمد سرور۔ (مئی ۱۹۵۲ء)، مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی

محمد میاں، مولانا۔ (جولائی ۲۰۰۴ء)، علمائے ہند کا شاندار ماضی، کراچی: مکتبۂ رشیدیہ

مریم جمیلہ۔ (۱۹۶۹ء)، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ترجمہ آباد شاہ پوری، لاہور: یوسف خان اینڈ سنز

مسعودی، ابوالحسن۔ (نومبر ۱۹۸۵ء)، تاریخ مسعودی، ترجمہ کوکب شاوانی، کراچی: نفیس اکیڈمی

مستعد خان، محمد ساقی۔ (۱۹۳۲ء)، مآثر عالمگیری، ترجمہ مولوی فدا علی طالب، حیدر آباد دکن: جامعہ عثمانیہ

مظفر حسین۔ (مارچ ۱۹۹۵ء)، احیائے اسلام کے دو اسلوب، لاہور: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن

معین الحق، ڈاکٹر۔ (۱۹۶۵ء)، معاشرتی وعلمی تاریخ، کراچی: حق نشان

منظوری، سہیل احمد۔ (دسمبر ۱۹۴۵ء)، مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور: حماد اسحٰی

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (جون ۱۹۹۹ء)، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (مارچ ۱۹۴۸ء)، نشانِ راہ، حیدر آباد دکن: مکتبہ جماعت اسلامی

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۵۳ء)، جماعت اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، لاہور: مکتبہ جماعت اسلامی

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (اگست ۱۹۸ء)، خلافت وملوکیت، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۸۸ء)، سلاجقہ، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (دسمبر ۱۹۹۹ء)، تصوف کیا ہے!، لاہور اسلامک پبلیکیشنز

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (۱۹۷۴ء)، الجہاد فی الاسلام، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (ستمبر ۱۹۹۱ء)، تفہیمات، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، جلد اوّل

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (فروری ۱۹۹۷ء)، تفہیمات، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز۔ جلد دوم

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (اکتوبر ۱۹۴۸ء)، دولتِ آصفیہ اور حکومت برطانیہ، سیاسی تعلقات پر ایک نظر، دہلی: جید برقی پریس

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (مارچ ۱۹۴۴ء)، دکن کی سیاسی تاریخ، حیدر آباد دکن: دارالاشاعت سیاسیہ

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (مارچ ۱۹۹۵ء)، دکن کی سیاسی تاریخ، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (جولائی ۱۹۹۱ء)، تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، جلد اوّل و دوم، پنجم

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (جولائی ۱۹۸۹ء)، تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، جلد چہارم

مودودی، ابوالاعلیٰ۔ (ستمبر ۱۹۹۰ء)، تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، جلد ششم

نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ (دسمبر ۲۰۰۱ء)، تاریخ اسلام، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب

نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ (مارچ ۱۹۸۶ء)، تاریخ اسلام، کراچی: نفیس اکیڈمی

نجیب آبادی، اکبر شاہ خان۔ (اکتوبر ۱۹۵۸ء)، آئینۂ حقیقت نما، کراچی: نفیس اکیڈمی

ندوی، نجیب اشرف۔ (س ن)، مقدمہ رقعات عالمگیری، اعظم گڑھ: دار المصنفین

ندوی، سیّد سلیمان۔ (۱۹۷۹ء)، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دار المصنفین

ندوی، محمد عمران۔ (۱۹۴۶ء)، مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں، اعظم گڑھ: دار المصنفین

نظام الدین احمد، خواجہ۔ (۱۹۹۰ء)، طبقاتِ اکبری، ترجمہ محمد ایوب قادری، لاہور: اردو سائنس بورڈ

نظامی، خلیق احمد۔ (جنوری ۱۹۶۶ء)، تاریخی مقالات، دہلی: ندوۃ المصنفین، جامع مسجد

نظامی، خلیق احمد۔ (س ن)، تاریخ مشائخ چشت، کراچی: مکتبہ عارفین

نعیم صدیقی۔ (۱۹۹۸ء)، المودودی، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب

نقی علی۔ (فروری ۱۹۸۰ء)، سیّد مودودی کا عہد، لاہور: البدر پبلیکیشنز

نہرو، جواہر لال۔ (فروری ۲۰۰۴ء)، تلاشِ ہند، لاہور: تخلیقات

وصی احمد۔ (اکتوبر ۱۹۵۱ء)، اسباب تقسیمِ ہند، کراچی: پبلشرز ندارد

ہربنس مکھیا۔ (۲۰۰۳ء)، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، ترجمہ رشید ملک، لاہور: فکشن ہاؤس

ہنٹر، ڈبلیو، ڈبلیو۔ (اپریل ۱۹۹۷ء)، ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم ڈاکٹر صادق حسین، لاہور: مکی دار الکتب

انگریزی کتب

Beeker, Carl. (1960). Every man his own Historian. London: Oxford University Press.

Carlyl, Thomas. (1966). Heros, Hero worship and Heroie in History. London: LUZAC and Company. Ltd

Dharam, E.Seri. (2000). A Text book of Historiography. New Delhi: Orient Longman.

Hitti.P.K (2002). History of Arabs. New york: Palgrave Macmillan.

Hunter.W.W. (June 1975). The Indian Musalmans. Bangladesh: Barnalipi Mudrayan Dacca.

Jaffer.S.M. (1961). History of History. Peshawer: Sadiq Sons.

Kaleem Bahadur. (1978). Jama'at-e-Islami of Pakistan, Political Thought and Political action. Lahore: Progressive Book. Urdu bazar.

Kent. Sherman. (1941). Writing History. New york: Macmillan, First Edition.

Mohan.R.P. (1970) Philosophy of History. New york: Orient Longman.

Nizami. Khaliq. Ahmed. (1983) On History and Historian of Medival India. India: Munshiram Manoharlal Publisher.

Qureshi.I.H. (1966) The Administration of the Mughal Empire.

Karachi: University of Karachi.

Qureshi.I.H. (1977). Muslim Community of Indo-Pakistan Karachi: Bureau of composition, Compilation and translation. Karachi University.

Qureshi.I.H. (1967) A Short History of Pakistan. Karachi: University of Karachi.

Qureshi.I.H. (1965) The Struggle for Pakistan. Karachi: Bureau of Composition, compilation and Translation. Karachi University.

Ram Gopal. (1959), Indian Muslims, A Political History. Mumbay: Asia Publising House.P.5

Rasul.M.G (1991). The Origin and Develoment of Muslim Historiography. Lahore: Iqbal publications, Multan Road.

Sarwat-Saulat. (Nov 1979). Maulana Maududi. Karachi: International Islamic Publisher.

Spengler,Oswald. (1954). The Decline of the west London: Oxford University Press.

Tara Chand. (January 1961). History of the Freedom Movement in India. India: the Publication division.

Toynbee.Arnold.J. (1961). Astudy of History. London: Oxford University Press.

لغات

ابی الفضل جمال الدین محمد، علامہ۔ (۱۹۶۳ء)، لسان العرب، ایران: نشر و ادب الحوزہ، قم

اردو لغت۔ (۱۹۸۶ء)، کراچی: ترقی اردو بورڈ

الزبیدی، محمد مرتضیٰ حسین۔ (۱۹۹۳ء)، تاج العروس من جواہر القاموس، کویت: مطبعۃ حکومۃ الکویت

الفرائد الدّریہ فی اللغتین العربیہ والنکلیزیہ (1951) Cathdlic Press Beirut:

الیاس، انطون الیاس۔ (۱۹۶۱ء)، القاموس العصری، القاہرہ: المطبعۃ المصریہ

بلیادی، ابوالفضل عبدالحفیظ۔ (۱۹۵۲ء)، مصباح اللغات، دہلی: مکتبہ برہان

حسن اللغات۔ (س ن)، لاہور: اورینٹل بک سوسائٹی

رازی، شیخ الامام محمد بن ابوبکر۔ (۱۹۱۱ء)، مختار الصحاح، مصر: بالمطبعہ الامیریہ

فیروز، فیروز الدین۔ (۲۰۰۵ء)، فیروز اللغات، کراچی: فیروز سنز

محمود سعید۔ (۱۳۴۴)، فرہنگ جدید فارسی، رازی، فخر رازی: کتاب فروش

منیر، نور الحسن۔ (مارچ ۱۹۵۹ء)، نور اللغات، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس

Oxford Advance Learner, Dictionary. Oxford University Press.

مجموعۂ مضامین کتب

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و بھارت، (فروری ۱۹۷۲ء)، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، جلد چہارم

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و بھارت۔ (۱۹۷۲ء)، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، جلد نہم

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و بھارت۔ (فروری ۱۹۷۲ء)، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، جلد دہم

تذکرہ سیّد مودودی۔ (اپریل ۱۹۸۶ء)، جلد اوّل، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

تذکرہ سیّد مودودی۔ (اکتوبر ۱۹۹۸ء)، جلد ۲، لاہور: ادارہ معارف اسلامی

دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۸۵ء)، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۱۱

دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۷۶ء)، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۱۲

دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۸۲ء)، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۲/۱۴

دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۸۶ء)، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۱۹

دائرہ معارف اسلامیہ۔ (۱۹۸۴ء)، جلد ۲۰، لاہور: دانشگاہِ پنجاب، جلد ۲۰

محمود، سیّد قاسم۔ (۱۹۷۵ء)، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن